اسلام ایک نظر میں

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

عرصے سے اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جو اسلام کا صحیح صحیح اور واضح تعارف کرادے۔ اس میں نہ تو بحث کا دقیق علمی انداز اختیار کیا گیا ہو، نہ گفتگو جزئیات تک پھیلی ہوئی ہو اور نہ کچھ پہلوؤں کو زیادہ اُبھارا اور کچھ کو دبا دیا گیا ہو۔ بلکہ نہایت صاف اور واضح انداز میں، اور پورے توازن کے ساتھ یہ بتایا گیا ہو کہ اسلام کیا ہے؟ اس کی حقیقت اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کی بنیادیں اور اصولی تعلیمات کیا ہیں؟ اس کا مجموعی وجود کیسا ہے؟ انسان کو وہ کون سا نقطۂ نظر دیتا، کس سیرت اور کردار کی تلقین کرتا۔ اور کس طرح کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرتا ہے؟ —— یہ کتاب اسی ضرورت کے احساس کا نتیجہ ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ یہ ضرورت اس کتاب سے پوری ہو جائے، اور جو لوگ مسلمان ہونے کے باوجود صحیح طور سے یہ نہیں جانتے کہ اسلام فی الواقع ہے کیا، وہ صرف اسی ایک کتاب کے مطالعے سے اصولی اور ضروری حد تک، اسے اس کی ٹھیٹھ شکل میں دیکھ لیں۔ اس کوشش میں عملاً جتنی کامیابی ہوسکی ہے وہ محض اللہ کا فضل ہے اور جس حد تک ناکامی ہوئی ہے وہ بندے کے علم کی کمی اور کاوشِ فکر کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں آپ اجمال و اختصار بھی پائیں گے، اور بسط و تفصیل بھی۔ اس کی وجہ محض وقت کا تقاضا ہے۔ دین کی جن باتوں سے لوگ عام طور پر واقف ہیں، یا جن پہلوؤں پر لکھنے اور بولنے والے اکثر زور دیا کرتے ہیں، مناسب یہی تھا کہ ان پر تفصیلی بحث نہ کی جائے۔ لیکن جن دینی افکار اور مسائل کا حال یہ نہیں ہے، جن سے لوگ عموماً

بہت کم واقفیت رکھتے ہیں اور جن پر لکھنے اور بولنے والے بھی ضروری توجہ نہیں دیا کرتے، ان کا مطالبہ یہی تھا کہ ان پر ذرا پھیل کر گفتگو کی جائے۔ اسی طرح دین کے وہ پہلو، جن کے بارے میں نہ صرف یہ کہ لوگ بہت کم واقفیت رکھتے ہیں، بلکہ غلط واقفیت رکھتے ہیں اور ان کی پوری اہمیت کو فکراً یا عملاً تسلیم ہی نہیں کیا جاتا، ان کا یہ ناقابلِ انکار حق تھا کہ ان کے سلسلے میں تفصیل اور استدلال دونوں سے کام لیا جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے، اور آپ سے اس دعا پر خلوصِ دل کے ساتھ آمین کہنے کی درخواست ہے، کہ جس مقصد سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اسے وہ پورا کرے، عام لوگوں کے لیے اسے اسلام کی معرفت کا ذریعہ، اور اس گنہگار کے لیے آخرت کا توشہ بنائے۔

(آمین)

صدرالدین اصلاحی

ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ

پسِ نوشت۔ کتاب کے اس ساتویں ایڈیشن کے مندرجات پہلے کے مقابلے میں قدرے ترمیم شدہ ہیں۔ یعنی انہیں نظر ثانی کر کے اور کچھ حذف و اضافہ اور اصلاح کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ امید ہے اس کے نتیجے میں کتاب کی افادیت نسبتاً بہتر ہو گئی ہو گی۔

صدرالدین اصلاحی

یوم جمعہ، ۲۸ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ

مطابق ۱۷ ستمبر ۱۹۹۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معنی و مفہوم

اِسلام کا بنیادی مفہوم

لُغت کی رو سے "اسلام" کے معنی فرماں برداری کے ہوتے ہیں۔ لیکن گفتگو جب دین کی زبان میں ہو رہی ہو تو اس وقت اس لفظ کے معنی اس فرماں برداری کے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور 'مسلم' وہ ہوتا ہے جو احکامِ الٰہی کے مطابق چلے اور ان سے سرتابی نہ کرے۔

تکوینی اسلام

"احکامِ الٰہی" کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، تکوینی[1] اور تشریعی[2]:-

"تکوینی احکام"، ان حکموں کو کہتے ہیں جن کے مطابق عمل چار و ناچار کرنا ہی پڑتا ہے، اور جن کی خلاف ورزی ناممکن ہوتی ہے۔ کیوں کہ مخلوق ان کی پابندی کرنے پر مجبور پیدا ہی کی گئی ہے، اور اسے پیدائشی طور پر اس بات کی آزادی بالکل نہیں دی گئی ہے کہ چاہے تو ان پر عمل کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ مثال کے طور پر سُورج کو اس کے اور اس پوری کائنات کے مالک کا حکم ہے کہ وہ ایک مقررہ وقت پر نکلے اور پھر ایک مقررہ وقت پر ڈوب جائے، زمین سے ایک مقررہ فاصلے پر رہے اور اسے روشنی اور گرمی پہنچائے۔ سُورج ان احکام پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اسے یہ طاقت حاصل

نہیں کہ ان کی تعمیل سے کبھی انکار کر جائے۔ اسی طرح ہوا کو اس بات کا حکم ہے کہ وہ جان داروں کو زندہ رکھے، پانی کو حکم ہے کہ پیاس بجھائے، آگ کو حکم ہے کہ جلائے، اور انسان کو حکم ہے کہ وہ زبان سے بولے، کان سے سُنے، ناک سے سونگھے۔ اور یہ سب کے سب اس بات پر مجبور ہیں کہ ان حکموں کی پابندی کریں۔ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا اُن کے بس ہی میں نہیں ہے۔ اس طرح کے احکام کو 'قوانین طبعی، اور قوانینِ قدرت، بھی کہتے ہیں اور عام طور سے یہی نام زیادہ مشہور ہیں۔

"تشریعی احکام" اللہ تعالیٰ کے ان حکموں کو کہتے ہیں جن کی پیروی پیدائشی مجبوری کے ساتھ نہیں ہوتی، بلکہ آزاد مرضی کے ساتھ ہوتی ہے۔ مخلوق کو ان پر عمل کرنے کا بھی اختیار حاصل ہوتا ہے اور عمل نہ کرنے کا بھی۔ مثلاً انسان کو حکم ہے کہ وہ ایک خدا کی بندگی کرے۔ لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے پیدائشی طور پر مجبور نہیں ہے، بلکہ اسے اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اسی ایک خدا کی بندگی کرے، چاہے تو اس کے ساتھ ہزاروں کو خدا بنالے، اور چاہے تو سرے سے خدا اور خدائی ہی سے انکار کر بیٹھے۔ ان احکام کو 'شرعی احکام' یا 'شرعی قوانین' بھی کہتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے احکام یکساں طور پر اللہ ہی کے احکام ہیں۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی کا نام اسلام ہے، اس لیے ان میں سے ہر ایک کی اطاعت معنیً 'اسلام' ہی ہوگی۔ یہ ایک صاف اور کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

پھر چوں کہ جمادات سے لے کر انسانوں اور فرشتوں تک کوئی ایک مخلوق بھی ایسی نہیں ہے جو اپنے خالق کی محکوم نہ ہو، اور جسے تکوینی یا تشریعی، کسی قسم کے احکام نہ دیے گئے ہوں۔ اس لیے 'اسلام' اور 'مسلم' ہونے کا مسئلہ صرف انسان ہی تک محدود نہیں رہ جاتا، بلکہ پوری کائنات تک وسیع ہو جاتا ہے، اور اسلام کسی ایک مخلوق کا نہیں، بلکہ ساری مخلوقات کا دین قرار پا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان مخلوقات کا دین بھی "اسلام" ہی ہے جنھیں ارادہ و اختیار کی آزادی سے محروم پیدا کیا گیا ہے اور جن کو صرف تکوینی احکام دیے گئے ہیں۔ اسی طرح چوں کہ وہ اپنے ان احکام کی پوری پوری پابندی

لازماً کرتی ہی ہیں اس لیے وہ سب کی سب 'مسلم' اور کامل 'مسلم' ہیں ـــــ یہ سورج 'مسلم' ہے، کیوں کہ وہ اسی ایک مقررہ نظام کے مطابق گردش کرتا ہے، نکلتا اور ڈوبتا ہے، گرمی پہنچاتا اور روشنی پھیلاتا ہے، جو اس کے لیے بنا دیا گیا ہے۔ یہ چاند اور تارے 'مسلم' ہیں، کیوں کہ وہ جن ضابطوں کے پابند ٹھیرائے گئے ہیں انہیں کبھی نہیں توڑتے۔ یہ ہوا 'مسلم' ہے، کیوں کہ وہ اسی طرح چلتی، اسی طرح بادلوں کو ہنکاتی، اسی طرح نباتات کو غذا دیتی اور تازگی بخشتی اور اسی طرح جان داروں کو زندہ رکھتی ہے جس طرح اسے حکم دیا گیا ہے۔ یہ پانی 'مسلم' ہے کیوں کہ وہ زمینوں کو سیراب کرتا ہے، پودوں کو اگاتا ہے، پیاس بجھاتا ہے اور حرارت پا کر بھاپ بن جاتا ہے، اور یہی کچھ اس کے خالق و مالک کی طرف سے اس کی ڈیوٹی مقرر کی گئی ہے۔

یہ بات کہ بے ارادہ اور بے اختیار مخلوقات کا دین بھی "اسلام" ہی ہے اور وہ سب کی سب "مسلم" ہیں، صرف عقل اور قیاس کی بنا پر نہیں کہی جا رہی ہے، بلکہ اس کی اصل بنیاد قرآن حکیم کی کھلی تصریحات پر ہے۔ چناں چہ وہ کہتا ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] الخ

کیا یہ (منکرین حق) اللہ کے دین کے بجائے کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ وہ تمام کے تمام اسی کے "مسلم" (فرماں بردار) ہیں جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں۔ الخ

یہ الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ آسمانوں سے لے کر زمین تک کی ہر مخلوق ـــــ دینِ حق کے منکر انسانوں اور جنوں کے سوا ـــــ اللہ کی "مسلم" ہے اور ان سب کا دین "اسلام" ہی ہے۔

ایک اور آیت ملاحظہ ہو جو اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں بیان کر رہی ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَىْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ[2]

---

[1] سورہ آل عمران۔ ۸۳ [2] سورہ اسراء۔ ۴۴

ساتوں آسمان اور زمین، اور وہ جو ان میں ہیں سب کے سب اللہ کی پاکی اور برتری بیان کر رہے ہیں، اس کائنات کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم ان کی تسبیحوں کو سمجھتے نہیں۔

ایک تیسری آیت اور سُنیے :۔

اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ [۱]

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ فی الواقع اللہ کو سبھی سجدہ کر رہے ہیں، وہ جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں، اور سورج، اور چاند اور تارے، اور پہاڑ، اور درخت اور چوپائے، اور بہت سے انسان۔

معلوم ہوا کہ کوئی ایک دو مخلوقات نہیں، بلکہ یہ آسمان و زمین، یہ چاند اور سورج، یہ تارے اور سیّارے، یہ ہوا اور پانی، یہ درخت اور پودے، یہ دریا اور پہاڑ، یہ چرند اور پرند، یہ انسان اور جن، غرض ذرّے سے لے کر آفتاب تک ہر چھوٹی بڑی، جان دار، بے جان، ذی عقل اور بے عقل مخلوق اللہ رب العزّت کی "حمد" اور "تسبیح" کر رہی ہے اور اسی کے آگے سربسجود ہے۔ اس "حمد" اور "تسبیح" کا، اور اس "سجدے" کا کم سے کم اتنا مفہوم تو واضح ہی ہے کہ یہ مخلوقات ان احکام اور قوانین کی بال بال پابندی کرتی رہتی ہیں جو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما رکھے ہیں، اور اس طرح کی ذات اور صفات پر زبانِ حال سے گواہی دیتی رہتی ہیں۔

ان آیتوں نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ ساری بے ارادہ اور بے اختیار مخلوقات

---

[۱] سورہ حج ۔ ۱۸

کا دین بھی اسلام ہی ہے۔ لیکن انھیں جو احکام دیے گئے ہیں وہ چوں کہ صرف تکوینی قسم کے ہیں اس لیے ان کے اسلام کی نوعیت بھی "تکوینی یا پیدائشی" اسلام کی ہوگی، اور ان کو "تکوینی یا پیدائشی" مسلم کہا جائے گا۔

تشریعی اور اصطلاحی اسلام

اب ان مخلوقات کو لیجیے۔ جو ارادہ و اختیار کی آزادی رکھتی ہیں۔ ان کی فطری پوزیشن یہ ہے کہ اگر بہت سی باتوں میں وہ بھی پہلی قسم کی مخلوقات ہی کی طرح مجبور اور بے اختیار ہیں تو بہت سے معاملات میں اس طرح مجبور و بے اختیار نہیں بھی ہیں، بلکہ پیدائشی طور پر انھیں اس بات کی آزادی ملی ہوئی ہے کہ ان معاملات میں جو رویّہ بھی چاہیں اختیار کریں۔ مثلاً انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے بعض قوانین یہ ہیں کہ وہ آنکھ سے دیکھنے کا، کان سے سُننے کا اور زبان سے بولنے کا کام لے، اور کچھ دُوسرے قوانین یہ ہیں کہ وہ آنکھ سے فلاں چیز دیکھے اور فلاں چیز نہ دیکھے، کان سے اس طرح کی باتیں سُنے، اس طرح کی نہ سُنے، اس کی زبان سے ایسی باتیں نکلیں، ایسی نہ نکلیں۔ پہلی قسم کے قوانین کی پیروی تو وہ لازماً کرتا ہے۔ کیوں کہ ان امور میں اسے بات ماننے یا نہ ماننے کی کوئی آزادی دی ہی نہیں گئی ہے، اس لیے وہ مجبور ہے کہ انہی قوانین کے مطابق عمل کرے لیکن دوسری قسم کے قوانین کے بارے میں اسے اس طرح کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے تو ان پر عمل کرتا ہے، چاہتا ہے تو نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں اُسے فرماں برداری اور نافرمانی، دونوں کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ اس لیے جس طرح پہلی قسم کے احکام کی حد تک، اور زندگی کے غیر اختیاری دائرے میں، افراد انسانی کا "اسلام" بھی "تکوینی اور پیدائشی اسلام" ہی کہا جائے گا، اسی طرح زندگی کے باقی، یعنی با اختیار دائرے میں، ان کے اسلام کو تشریعی اور اختیاری اسلام، کہنا چاہیے۔ لیکن دینی اصطلاح میں "تشریعی احکام" کے لیے تشریعی احکام، یا تشریعی و اختیاری اسلام کے لیے تشریعی و اختیاری اسلام کے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے

ہیں، بلکہ 'تشریعی' اور 'اختیاری' کی قید کے بغیر صرف "احکامِ الٰہی" اور "اسلام" کے الفاظ کے استعمال کو کافی سمجھا گیا ہے۔ وجہ اس کی بالکل ظاہر ہے۔ جو مخلوقات تکوینی احکام کے ساتھ ساتھ تشریعی احکام کی بھی مکلّف ہیں، ان کی حد تک اطاعت اور نتیجۂ اطاعت کے اعتبار سے تکوینی احکام کی کوئی اہمیت باقی ہی نہیں رہ جاتی، اور تشریعی احکام ہی سب کچھ بن جاتے ہیں۔ اس لیے عام گفتگو میں "احکامِ الٰہی" کا اور "اسلام" کا لفظ بجا طور پر صرف ان 'تشریعی احکام' ہی کے لیے مخصوص ہو کر رہ جانا چاہیے تھا اور یہی کیا گیا ہے۔

پھر اسی بات کا تقاضا یہ بھی ہوا کہ جو لوگ تشریعی احکام کو نہ مانیں اُن کے لیے "مسلم" کا لفظ بالکل ہی نہ استعمال کیا جائے۔ حالاں کہ وہ اس حالت میں بھی تکوینی احکام کی پوری پوری پابندی کر رہے ہوتے ہیں، اور اس بنا پر ان کی حد تک تو وہ لازماً "مسلم" ہی ہوتے ہیں۔ لیکن چوں کہ اختیاری اسلام کے نہ ہونے کی صورت میں جبری اسلام کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔ اس لیے اس کا کوئی لحاظ بھی نہیں کیا جاتا، اور شریعت کی اصطلاح میں کسی شخص کو "مسلم" صرف اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ تکوینی احکام کی جبری پابندی سے آگے بڑھ کر تشریعی احکام کے آگے بھی رضا کارانہ جھک چکا ہو۔

اِسلام اور انسان

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا، جن مخلوقات کو ارادے اور اختیار کی آزادی عطا کی گئی ہے، انسان بھی انہی میں سے ایک ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ انہی میں سے ایک ہے، بلکہ اس معاملے میں وہ ایک خاص امتیاز بھی رکھتا ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اسے تشریعی احکام بھی دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ جس وقت پہلا انسان اس دنیا میں بسنے کے لیے بھیجا جا رہا تھا اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا تھا کہ:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ [۱]

پس اگر میری جناب سے تمہارے پاس کوئی ہدایت پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کوئی اندیشے کی بات نہ ہوگی اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو لوگ انکار کے راستے پر چلیں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہ دوزخی ہوں گے۔

اس اعلان میں "ہدایت"، یعنی احکامِ شریعت بھیجنے کی بات بظاہر "اگر" کی شرط کے ساتھ کہی گئی تھی، مگر حقیقت میں یہ شرط نہیں ہے، بلکہ کلام کا ایک شاہانہ انداز ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس میرے احکام ضرور جائیں گے، جن کی اطاعت کرنا تمہارا فرض ہوگا۔

چناں چہ عملاً جو کچھ ہوا اس کی وضاحت قرآن مجید کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ [۲]

کوئی امّت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ گزرا ہو۔

یہ دونوں آیتیں اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ اس زمین پر انسان کی آبادی اور تشریعی احکام کی آمد، دونوں ایک ساتھ شروع ہوئی ہیں، اور اس وقت سے آج تک یہ انسانی دنیا دین و شریعت سے کبھی خالی نہیں رہی ہے، اور کوئی اُمّت نہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے محروم اور بے خبر رکھی گئی ہو، جیسا کہ انسان کے ایک بااختیار مخلوق ہونے کا تقاضا تھا۔

ہر قوم کا دین اسلام تھا

چوں کہ تشریعی احکام کے وہ سارے مجموعے، جو پہلے دن سے آج تک آئے ہیں، سب کے سب اللہ تعالیٰ ہی کے بھیجے ہوئے تھے، اس لیے ان میں سے ہر ایک کی پیروی

---

[۱] سورہ بقرہ - ۳۹ [۲] سورہ فاطر - ۲۴

اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت تھی، اور اس بنا پر ان میں کا ہر مجموعۂ احکام یعنی ہر ایک دین، دراصل "اسلام" ہی تھا، اور ان کے ماننے والے سب کے سب حقیقتاً "مسلم" ہی تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر عقل کا فیصلہ اور قرآن مجید کی شہادت دونوں متفق ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :۔

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا۔[1]

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ ایسا مسلم تھا جو ہر طرف سے کٹ کر اللہ ہی کے لیے یکسو ہو چکا تھا۔

ایک اور جگہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد —— حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف علیہم السلام وغیرہ —— سب کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ :۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ .... قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ .... وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔[2]

یاد کرو اس وقت کو جب کہ ابراہیم سے اس کے رب نے کہا تھا کہ مسلم (یعنی تابع فرمان) بن جا، تو اس نے جواب دیا تھا کہ میں سارے جہانوں کے آقا کا مسلم (تابع فرمان) بن گیا۔ پھر اسی امر کی وصیّت کی تھی ابراہیم نے اپنی اولاد کو، اور یعقوب نے اپنی اولاد کو، کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے یہ دین منتخب کیا ہے، سو دیکھنا آخری سانس تک مسلم (اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان)

---

[1] سورہ آل عمران — ۶۷ [2] سورہ بقرہ — ۱۳۱ تا ۱۳۳۔

رہنا.... انھوں نے جواب میں کہا تھا کہ ہم بندگی کریں گے آپ کے معبود کی.....اور ہم اسی کے مسلم (تابعِ فرمان) ہیں۔

قرآن مجید میں اسی طرح کی صراحتیں حضرت لوط، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام وغیرہ انبیاء کے بارے میں بھی کی گئی ہیں، اور صاف طور سے کہا گیا ہے کہ وہ اور ان کے پیرو، سب کے سب "مسلم" تھے، اور سب کا دین "اسلام" ہی تھا۔

"اسلام" نام صرف آخری دین کا ہے

اس حقیقت کی موجودگی میں، جو ابھی بیان ہوئی کسی بھی آسمانی دین کو دوسرے دینوں کے مقابلے میں بظاہر نام اور تعبیر کا کوئی امتیاز حاصل نہ ہونا چاہیے، اور چاہے قرآنی شریعت ہو چاہے توراتی، حضرت آدمؑ کا لایا ہوا دین ہو یا حضرت نوحؑ کا، حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہونے والی ہدایت ہو یا حضرت عیسیٰؑ پر ــــ نام بھی سب کا یکساں طور پر "اسلام"، اور ان کے پیرووں کا "مسلم"، ہی ہونا چاہیے، جس طرح کہ اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے یہ ساری شریعتیں یکساں طور پر "اسلام" ہی تھیں اور ان سب کے پیرو "مسلم"، ہی تھے۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، بلکہ اس سے مختلف ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی خاص اصطلاح میں "اسلام"، نام صرف اسی ایک دین کا ہے جسے وہ خود پیش کرتا ہے اور جس کو آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارا گیا تھا۔ اسی طرح "مسلم"، کا نام بھی صرف انھی لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو اسی آخری دین کے ماننے والے ہیں۔ چناں چہ وہ جب "الاسلام"، کا لفظ بولتا ہے تو اس وقت اس کی مراد اسلام کے عام مفہوم سے نہیں ہوتی، بلکہ خاص اسی ایک دین اور مجموعۂ احکامِ الٰہی سے ہوتی ہے۔ مثلاً:-

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ [1]

---

[1] سورہ مائدہ ـــ ۳

مسلمانو! آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے بحیثیت دین کے "الاسلام" کو پسند کیا ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔[1]

بلاشبہ اللہ کے نزدیک (پسندیدہ اور مقبول) دین "الاسلام" ہے۔

اِن آیتوں میں "الاسلام" صاف طور پر خاص اسی ایک دین کو کہا گیا ہے جو قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے۔

جہاں تک "مسلم" نام کا تعلق ہے، اس کا معاملہ اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔ قرآن مجید کا یہ ارشاد سُنیے:۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا۔[2]

.... اسی نے تمہارا نام پہلے ہی سے اور اسی امر کے پیشِ نظر "مسلم" رکھا ہے۔

یہ الفاظ اپنے مدعا میں بالکل صاف اور صریح ہیں۔ یہ فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں کہ معنوی حیثیت سے اور صفاتی طور پر، اگرچہ وہ تمام لوگ بھی مسلم ہی تھے جو پچھلے زمانوں میں کسی نبی پر ایمان لائے تھے، لیکن یہ شانِ امتیاز صرف اسی آخری دین کے ماننے والوں کو حاصل ہے کہ معنوی حیثیت سے مسلم ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری نام و لقب بھی ان کا "مسلم" ہی ہے، ان کے سوا اہلِ ایمان کا اور کوئی گروہ نہیں جس کا نام بھی مسلم رکھا گیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا کہ دوسروں کا نام بھی مسلم ہوتا تو یہ کہے جانے کا کوئی محل نہ ہوتا کہ 'اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے'؛ کیوں کہ جب اہلِ ایمان کے دوسرے تمام گروہ بھی نام کے اعتبار سے مسلم ہی تھے تو کسی ایک گروہ کے متعلق اس صراحت کا کیا جانا تحصیلِ حاصل ہوتا کہ اس کا نام مسلم رکھا گیا ہے۔ اس لیے قرآن کریم میں جب بھی کسی اور اُمت یا گروہ کو مسلم کہتے سُنا جائے گا (جیسا کہ اکثر کہا گیا ہے) تو یہ دراصل اس کی معنوی حیثیت کا اظہار ہوگا، یا یوں کہیے کہ اس کا صفاتی نام ہوگا، اصطلاحی نام و لقب نہ ہوگا۔

---

[1] سورہ آل عمران ۔ ۱۹   [2] سورہ حج ۔ ۷۸

اِمتیاز کی وجہ

سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ امتیاز کیوں ہے؟ جب دوسرے انبیاء کے لائے ہوئے دین بھی اُسی طرح اللہ ہی کے بھیجے ہوئے تھے جس طرح کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے، اور اُن کے پیرو بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے مسلم و تابع فرمان تھے جس طرح کہ اس دین کے پیرو ہیں تو اسلام نام صرف اسی ایک دین کا، اور مسلم نام صرف اسی ایک دین کے پیرووں کا کیوں ہوا؟ اگر حقیقتاً سارے دین "اسلام" ہی تھے، اور دوسرے تمام انبیاء کے ماننے والے بھی "مسلم" ہی تھے تو ان سب کا نام و لقب بھی "اسلام" اور "مسلم" کیوں نہ قرار پایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نام رکھے جانے کے ایک معروف اور اہم اصول کی بنا پر ایسا ہوا ہے، بلا وجہ نہیں ہوا ہے۔ اصول یہ ہے کہ ایک صفت اگر بہت سے افراد میں پائی جاتی ہو تو اس بات کا مستحق، کہ وہ صفت اس کا نام اور لقب بھی بن جائے صرف وہی فرد ہوتا ہے جس کے اندر وہ صفت دوسرے ہر فرد کے مقابلے میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ کیوں کہ کسی صفت کا کسی شخص کا نام پڑجانا دراصل اس دعوے کا اظہار ہوتا ہے کہ اس شخص کے اندر یہ صفت حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہے، اور دوسروں میں بھی اگرچہ پائی جاتی ہے لیکن اس درجے تک نہیں پائی جاتی، اور اس بارے میں وہ اس سے اتنے پیچھے ہیں کہ اس آفتاب کے سامنے ان تاروں کی روشنی گویا باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ مثال کے طور پر 'صدّیقیت'، ایک صفت ہے، جو کتنے ہی بندگانِ خدا کو عطا ہو چکی ہے۔ مگر 'صدیق' کا لفظ بطور لقب کے صرف حضرت ابوبکرؓ کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا یہ مطلب تو کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ صدّیقیت کے مقام پر صرف آپؓ ہی فائز تھے، اور دوسرے تمام صحابہؓ اس سے محروم تھے۔ جب کہ ان حضرات میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو وہ نبی ہوتے۔ اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس مقدس گروہ میں ایک دو نہیں بے شمار صدیق تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ "صدیق" کے لقب سے سرفراز ہونے کا شرف صرف حضرت ابوبکرؓ کے حصے میں آیا؟ ظاہر ہے، اس کی وجہ اس کے سوا

اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ وہ صدیقیت کی صفت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ تاریخ، سیرت اور حدیث کے صفحات گواہ ہیں۔

اس اصول کو سامنے رکھ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین، اور دوسرے انبیاء کے لائے ہوئے دینوں کے معاملے پر غور کیجیے۔ ماننا پڑے گا کہ اگرچہ سارے دین معنوی حیثیت سے اسلام ہی تھے، مگر وہ دین جو قرآن کی تشکل میں، اور نبی آخر الزماں کے ذریعے آیا، وہی اس بات کا مستحق تھا کہ اس کا نام بھی 'اسلام' ہو۔ کیوں کہ اس کی "اسلامیت" دوسرے تمام دینوں کی "اسلامیت" سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اور وہ ان کے مقابلے میں قطعی طور پر ایک بلند تر حیثیت کا مالک ہے۔ دوسرے ہر دین کا حال یہ ہے کہ اس کے احکام کا مجموعہ بھی نسبتاً مختصر اور محدود تھا، اس کے خطاب کا دائرہ بھی محدود تھا اور اس کے نفاذ کی مدت بھی محدود تھی، جب کہ اس دین کا مجموعۂ احکام بھی مفصّل اور ہمہ گیر ہے، اس کا دائرۂ خطاب بھی غیر محدود ہے، اور اس کے نفاذ کی مدت بھی کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس کا مخاطب سارا جہان ہے۔ اس کا تشریعی مزاج (صحیح انسانی فطرت سے مکمل) ہم آہنگی رکھتا ہے، اس کی تعلیمات پوری نوعِ انسانی کے لیے ایک مکمل اور بہترین نظامِ حیات پر مشتمل ہیں، اور آدم علیہ السلام کے وقت سے اللہ تعالیٰ کی جس ہدایت اور نعمت کا اترنا شروع ہوا تھا، یہی دین اس کا نقطۂ کمال ہے۔ جب صورتِ واقعہ یہ تھی تو تسمیہ کے معروف طریقے کا تقاضا یہی تھا کہ "اسلام"، صرف اسی سب سے آخری، سب سے عام و ہمہ گیر، اور سب سے کامل دین کا نام ہوتا۔

اسی طرح اور امتوں کو چھوڑ کر صرف پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو "مسلم" کا نام و لقب اس لیے ملا کہ ان کی 'مسلمانہ' حیثیت دوسروں کے مقابلے میں بہت بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسے دین کے علم بردار تھے جو اپنی جامعیت میں اور اپنے مقاصد کی وسعت اور بلندی میں کوئی نظیر نہیں رکھتا۔ ان کے سر قیامت تک کے لیے یہ بھاری ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ ایک ایک قوم تک اللہ کا پیغام پہنچائیں گے، ساری دنیا کے سامنے اسلام کی شہادت دیں گے اور اس زمین کے چپہ چپہ پر دینِ حق قائم کر چکنے سے پہلے اپنی کمر نہ کھولیں گے۔ جب کہ دوسری

کسی امت کے اوپر ایسی بڑی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تھی۔ اس لیے حق یہی تھا کہ وہی "خیر الامم" کہے جائیں اور "مسلم" کا نام انہی کے لیے مخصوص کیا جائے۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اگرچہ تکوینی اور جبری طور پر تو پوری کائنات ہی 'مسلم' ہے اور تشریعی طور پر بھی وہ سبھی لوگ 'مسلم' ہی تھے جو اللہ کے بھیجے ہوئے کسی دین کے پیرو تھے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جناب سے آنے والا ہر دین "اسلام" ہی تھا — لیکن 'اسلام' اور 'مسلم' کے الفاظ جب عرف اور نام کے طور پر بولے جاتے ہیں تو 'اسلام' سے مراد صرف وہ دین ہوتا ہے جسے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے، اور 'مسلم' سے مراد صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس دین کو سچے دل سے مان کر اس کی پیروی اختیار کریں۔

بنیادی عقائد

اسلام جن تعلیمات پر مشتمل ہے، اصولی[1] اور عملی[2] دونوں حیثیتوں سے ان کی اہمیتوں کے درجے الگ الگ ہیں، اور ان میں ایک فطری ترتیب بھی پائی جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ کی حیثیت بنیاد[1] کی سی ہے، کچھ کی دیواروں[2] اور ستونوں کی سی ہے، کچھ کی چھت[3] کی سی ہے اور کچھ کی ظاہری زیب[4] وزینت کی سی ہے۔ اسلام کو ٹھیک طور سے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اسی ترتیب سے مطالعہ کیا جائے۔ اس لیے سب سے پہلے ہم اس کی ان تعلیمات کو لیتے ہیں جن کی حیثیت بنیاد کی سی ہے اور جنھیں اصطلاح میں "ایمانیات" یا "عقائد" کہا جاتا ہے۔

ایمانیات یا عقائد کا، دین کی بنیاد ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ایمانیات "علم" ہیں، اور باقی ساری چیزیں "عمل" ہیں اور علم، عمل پر ہمیشہ مقدم ہوتا ہے۔ عمل کی حیثیت ایک درخت کی سی ہے اور علم کی حیثیت بیج کی سی۔ جس طرح بیج کے بغیر درخت کا وجود ممکن نہیں، ٹھیک اسی طرح علم کے بغیر عمل بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لیے جب تک ایمانیات وعقائد وجود میں نہ آجائیں اس وقت تک باقی اسلام کے وجود میں آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن مجید کہتا ہے:-

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ[1] .... الخ

---

[1] سورہ بقرہ - ۱۷۷

... بلکہ نیکی صرف اس شخص کی نیکی ہے جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر، آخری دن پر، فرشتوں پر، کتابِ الٰہی پر، اور نبیوں پر .... الخ

معلوم ہوا کہ ایمانیات کے بغیر نیکی اور حسنِ عمل کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوسکتا۔

اسلام کے یہ ایمانیات اور عقائد کیا ہیں؟ آیتِ کریمہ نے یہ بات بھی بتادی ہے۔ اس آیت کی، اور اسی طرح کی دوسری بہت سی آیتوں کی رُو سے یہ عقائد پانچ ہیں:

(۱) اللہ پر ایمان (۲) آخرت پر ایمان (۳) انبیاء پر ایمان (۴) اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان (۵) فرشتوں پر ایمان۔

لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو عقائد میں شامل ہے، اور وہ ہے تقدیر پر ایمان۔ حدیثِ جبریلؑ میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے پوچھا: "ایمان کیا ہے؟" تو آپؐ نے جواب دیا:

اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلَآئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ۔[۱]

ایمان یہ ہے کہ تم ایمان رکھو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخری دن پر، اور ایمان رکھو تقدیر کی بھلائی اور برائی پر۔

قرآن اور حدیث کے بیانوں میں یہ کسی اختلاف کی بات نہیں ہے، بلکہ صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے۔ کیوں کہ تقدیر پر ایمان دراصل اللہ پر ایمان ہی کا ایک جزو ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے اس کا الگ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا، جب کہ حدیث میں بعض مصالح کی وجہ سے اس کا نام لے کر الگ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ تقدیر پر ایمان رکھنا ضروری ہے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی دوسری تمام صفتوں پر اور ان کے سارے تقاضوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔

یہ ہیں اسلام کے وہ چھ عقائد، جن سے اس کا پورا نظامِ شریعت وجود میں آیا ہے۔

---

[۱] مسلم، جلد اول، کتاب الایمان

لیکن جائزہ بتاتا ہے کہ ان عقائد میں بھی سب کی اہمیت یکساں نہیں ہے، بلکہ بعض کی زیادہ ہے اور بعض کی کم۔ اگر موٹی تقسیم کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شروع کے تین عقائد بنیادی اہمیت کے مالک ہیں، اور باقی دراصل ان ہی تینوں کے لازمی تقاضوں یا شاخوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے اگر صرف انھی تین کو ذرا تفصیل سے سمجھ لیا جائے تو یہ پوری بات سمجھ لینے کے لیے کافی ہوگا۔

(۱) اللہ پر ایمان

اللہ پر ایمان لانے کا مطلب

اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ:

اس (۱) کے وجود پر یقین رکھا جائے،

(۲) اسے ان تمام صفات سے، جن کی وضاحت قرآن اور صاحبِ قرآن نے فرما دی ہے، پوری طرح مُتّصِف مانا جائے۔

ان (۳) اختیارات کو اسی کے لیے مخصوص سمجھا جائے جو ان صفتوں کے لازمی تقاضوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان (۴) حقوق کو بھی اسی کے لیے خاص مانا جائے جو ان صفتوں سے فطری طور پر وابستہ ہیں، اور جن کے مانے بغیر ان صفتوں کا ماننا بے معنی ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ان میں سے پہلی چیز کا تعلق ہے، وہ تو بجائے خود بالکل واضح ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں شرح و تفصیل کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جب تک کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کو نہ مانتا ہوگا اس پر ایمان کیا رکھے گا۔!

البتہ باقی چیزیں اس طرح واضح نہیں ہیں، اور وہ لازماً محتاجِ توضیح ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ان پر ذرا پھیل کر گفتگو کی جائے، اور یہ بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کیا کیا ہیں؟ اور ان صفات کے تقاضے کیا ہیں؟ لیکن چوں کہ ساری صفاتِ الٰہی بھی برابر

کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ ان میں کلیدی حیثیت صرف چند ہی (بلکہ فی الواقع صرف ایک ہی) کو حاصل ہے، اور باقی صفتیں دراصل انہی کے لوازم یا ان کی شاخیں ہیں۔ اس لیے انہی کی حد تک اگر ضروری تفصیل سامنے آجائے تو بقیہ صفات تک بحث کو دراز کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ رہ جائے گی، اور صرف اتنے ہی سے یہ بات سمجھ لی جا سکے گی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے لیے اسے کس طرح کی صفات کا مالک ماننا چاہیے۔ یہاں صرف انہی چند بنیادی صفتوں کا اور ان کے ضروری تقاضوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بنیادی اور اہم تر صفتیں یہ ہیں :-

(۱) وہ ازلی اور ابدی اور واجب الوجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا، کسی نے اسے پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ وہ آپ سے آپ موجود ہے۔

(۲) وہ خالق ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اشیاء کو پیدا کرتا اور عدم وجود سے وجود میں لاتا ہے۔

(۳) وہ ربّ (پروردگار) ہے۔ یعنی یہ کہ وہ رزق دیتا اور پرورش کرتا ہے۔

(۴) وہ مالک اور حاکم ہے اور ایک ایک مخلوق اس کی مِلک اور اس کی محکوم ہے۔

(۵) وہ علیم ہے، یعنی یہ کہ وہ ہر بات، ہر کام اور ہر حرکت کو جانتا ہے۔ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے، کیا ہوگا، سب اس کے علم میں ہے۔ کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

(۶) وہ حکیم ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی، بے مقصد، اور بے نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ ہر فعل کے پیچھے اعلیٰ درجے کی دانائی، اعلیٰ درجے کی حکمت اور اعلیٰ درجے کی مقصدیت کام کر رہی ہوتی ہے۔

(۷) وہ عزیز ہے۔ وہ ہر کام کی طاقت رکھتا ہے، اس کے کسی ارادے کو عملی جامہ پہننے سے روکا نہیں جا سکتا۔ اس کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے کسی حکم کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

(۸) وہ عادل ہے۔ اس کا ہر کام عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے تکوینی احکام بھی پوری طرح عادلانہ ہوتے ہیں اور اس کے تشریعی احکام بھی، اسی طرح اس کے سارے فیصلے بھی ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۹) وہ مُجازی ہے۔ یعنی وہ افعال کا بدلہ دیتا ہے۔ بُرے کام کا بُرا بدلہ اور اچھے کام کا اچھا بدلہ۔

(۱۰) وہ معبود ہے، وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی پرستش کی جائے اور اس کے آگے سر جھکائے جائیں، اس سے دُعائیں اور التجائیں کی جائیں۔

(۱۱) وہ واحد ہے، یعنی اس کی جتنی صفات ہیں، اُن میں سے کسی کے اندر بھی کوئی اس کا شریک اور مدِمقابل نہیں۔ یہی نہیں کہ وہ ازلی وابدی، خالق وپروردگار، مالک وحاکم، علیم وحکیم، عزیز وعادل اور مُجازی ومعبود ہے، بلکہ ایسا صرف وہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان بنیادی صفات میں سے آخری صفت، جسے صفتِ توحید کہتے ہیں، ایک خاص اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح پورے اسلام کی جان اس کے عقائد ہیں، اس طرح ان عقائد کی جان توحید کا عقیدہ ویقین ہے۔ اگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ صفت دراصل دوسری تمام صفات کا نقطۂ کمال ہے۔ اس لیے صرف یہی ایک صفت حقیقتاً ساری صفات کی نمائندہ اور قائم مقام بن جاتی ہے۔ جس نے شعور ویقین کے ساتھ کہہ دیا کہ "اللہ ہی معبود ہے، اس نے فی الواقع اللہ تعالیٰ کی ساری صفتوں پر علم الیقین رکھنے کا اعلان کر دیا۔ صفتِ توحید کی اس ممتاز اور جامع حیثیت کو اگر سامنے رکھا جائے تو ضروری نہیں رہ جاتا کہ ساری صفتوں کے تقاضے بیان کیے جائیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق الگ الگ گفتگو کی جائے۔ اس کے بجائے صرف اسی ایک صفت کے تقاضوں کا سامنے آجانا کافی ہوگا۔ اس لیے یہاں گفتگو انہی تقاضوں تک محدود رہے گی۔

قرآنِ حکیم اور رسولِ خُدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بتاتے ہیں کہ عقیدۂ توحید کے اہم اور بنیادی تقاضے یہ ہیں:۔

(۱) اللہ کے سوا اور کوئی ہستی نہیں جو آپ سے آپ وجود میں آگئی ہو، بلکہ ہر چیز مخلوق ہے اور اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے (اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ)[۱] اسی کی مِلک ہے،

---

[۱] سورہ زمر۔ ۶۲

اسی کی محتاج ہے، اسی کی محکوم ہے، وہ اپنے اندر کوئی ذاتی صفت نہیں رکھتی، بلکہ جو وصف بھی اس کے اندر پایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عنایت کیا ہوا ہے، اور صرف اسی وقت تک اس کے پاس رہ سکتا ہے جب تک وہ چاہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی ذات بنیادی طور پر تمام موجودات سے مختلف ہے اور کسی طرح بھی کوئی اس کا ہم جنس نہیں (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ)[1] کسی بڑی سے بڑی ہستی پر بھی اس کو قیاس نہیں کر سکتے (لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى)[2] نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا (لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ)[3] نہ وہ کسی اور ہستی کے ساتھ "متحد" ہوتا ہے، نہ اس کے اندر "حلول" کرتا ہے؛ وہ جسم نہیں رکھتا، نہ جسمانی صفات رکھتا ہے۔

(۳) صرف اللہ ہی ہے جس کی رضا جوئی کی انسان کو فکر کرنی چاہیے، یہی اس کے سارے کاموں کا اصل محرک بھی ہونا چاہیے اور اصل مقصد بھی۔

(۴) وہ سارے اعمال و حرکات صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص رکھے جانے چاہییں جو اپنی حقیقت یا اپنی صورت کے اعتبار سے پرستش کی نوعیت کے ہوں۔ سجدہ صرف اسی کو کیا جا سکتا ہے، نذر اسی کے نام کی مانی جا سکتی ہے۔ دعا صرف اسی سے کی جا سکتی ہے۔ نادیدہ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ غیبی امداد کے لیے صرف اسی کو پکارا جا سکتا ہے۔

(۵) وہ سارے جذبات اور ذہنی اعمال بھی اللہ ہی کے لیے خاص کر دیے جانے چاہییں جن کے اندر بندگی کی رُوح پائی جاتی ہو۔ توکّل صرف اسی پر کیا جائے، اُمیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں، تقویٰ صرف اسی کا اختیار کیا جائے، خوف صرف اسی کا رکھا جائے، حقیقی محبّت صرف اسی سے کی جائے۔

(۶) اس پوری کائنات کا، جس کا ہماری یہ دنیا بھی ایک چھوٹا سا حصّہ ہے، مقتدرِ اعلیٰ اللہ ہی ہے۔ حکم دینے، منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق صرف وہی ہے۔ حقیقی شارع اور قانون ساز بھی وہی ہے۔ کسی مخلوق کی زندگی کا فریضہ متعین کرنے، اس کے معاملے کا فیصلہ کرنے، اسے معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار بھی پورے کا پورا اسی کے ہاتھ میں ہے۔

---

[1] سورہ شوریٰ۔۱۱ [2] سورہ نحل۔۶۰ [3] سورہ اخلاص۔۳

(۷) اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر معبودیت کی شان رکھتا ہو، جو پوجے جانے کا مستحق ہو، جس کی رضا چاہی جائے۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں، اعترافِ نعمت کیا جائے۔ کوئی اور نہیں جسے ولی اور کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے۔ کوئی اور نہیں جس پر توکّل کیا جائے، دل میں جس کا خوف اور تقویٰ رکھا جائے جس سے اُمیدیں وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبّت رکھی جائے۔ کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا کوئی ذرّہ بھی ہو، جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہو، جو کسی کے لیے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بالذّات اطاعت جائز ہو۔

توحید کے یہ بنیادی تقاضے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا بھی انکار اللہ پر ایمان رکھنے کے دعوے کو بے معنیٰ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں عقیدۂ توحید کے اصل مفہوم میں شامل ہیں، اور کوئی شخص صحیح معنوں میں مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک یہ عقیدہ، اپنے پورے مفہوم کے ساتھ اس کے دل میں نہ اُتر چکا ہو۔

شرک

ذہنوں میں کوئی تصوّر واضح اسی وقت ہو پاتا ہے جب اس کے مخالف تصوّر کو بھی ساتھ کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اسی لیے اہم اصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا اہتمام ضرور کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اصولوں اور نظریوں کو بھی ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے۔ عقیدۂ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریے اور عقیدے کو حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے اسے اچھی طرح سمجھ لینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مخالف نظریے یعنی 'شرک' کو بھی سمجھ لیا جائے۔ چناں چہ قرآن حکیم نے اپنے اسلوبِ بیان سے ہمارے لیے اس امر کی رہنمائی بھی مہیّا کر رکھی ہے۔ اس نے توحید کی تعلیم دیتے ہوئے بات صرف اتنے ہی پر ختم نہیں کر دی ہے کہ توحید اسے کہتے ہیں اور اس کے دلائل اور فوائد اور نتائج

یہ ہیں، بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری سمجھا ہے کہ شرک کیا ہے؟ اس کے اعمال کیا ہیں؟ اس کی علامتیں کیا ہیں؟ اس کی مضرتیں کیا ہیں؟ اور وہ کیوں ایک سراسر بے اصل اور باطل نظریہ ہے؟ حد یہ ہے کہ خود توحید کے تصوّر کی تعلیم دینے کے لیے اس نے ضابطے کا جو جملہ استعمال کیا ہے اس میں توحید کا اثبات اور شرک کی نفی، دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ یعنی اس نے بات یوں نہیں فرمائی ہے کہ 'اللہ تعالیٰ اکیلا معبود ہے'، بلکہ یوں فرمائی ہے کہ 'نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے' (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ) اس طرزِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توحید کا بے آمیز تصوّر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ شرک کی پوری طرح نفی بھی نہ ہو جائے۔ اور جب شرک کی نفی ضروری ہے تو اس کا سمجھ لینا بھی لازماً ضروری ہوگا۔

"شرک" کے معنی "ساجھے پن" کے ہیں، اور دین کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ 'اللہ کی ذات[۱] میں، یا اس کی صفات[۲] میں، یا ان صفات کے لازمی تقاضوں[۳] میں، کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے۔ گویا شرک کی تین قسمیں ہیں:۔

ایک[۱] وہ شرک، جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے۔

دوسرا[۲] وہ شرک، جس کا تعلق اس کی صفات سے ہوتا ہے۔

تیسرا[۳] وہ شرک، جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم سے ہوتا ہے۔

پہلی[۱] قسم کے شرک کی عملی صورتیں یہ ہیں:۔ کسی[۱] کو اللہ تعالیٰ کا ہم جنس قرار دیا جائے۔ اسے[۲] اس کا باپ یا اس کی اولاد سمجھ لیا جائے۔ یہ مان[۳] لیا جائے کہ وہ کسی اور ہستی کے ساتھ مل کر اس سے متحد ہو سکتا ہے۔ یہ تصوّر[۴] کر لیا جائے کہ وہ کسی مخلوق کی شکل اختیار کر کے نمودار ہوا کرتا ہے یعنی کوئی مخلوق اس کا اَوتار ہو سکتی ہے۔ مثلاً عرب والے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں اور جنوں کو اس کی ذات برادری سمجھتے تھے، اسی طرح عیسائی حضرت مسیح علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ کا اکلوتا بیٹا اور اس کا اوتار قرار دیتے تھے۔ یہ سب شرک فی الذّات ہے۔

دوسری[۲] قسم کے شرک کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن صفتوں سے متصّف ہے اُن میں کی کوئی صفت کسی اور کے اندر بھی موجود مان لی جائے اور اُسی معنی و مفہوم میں

موجود مان لی جائے جس معنی و مفہوم میں وہ اللہ تعالیٰ کے اندر پائی جاتی ہے۔ مثلاً "علم" اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی، ہر بات کو جانتا ہے، اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا یا آنے والا زمانہ بھی حال کا زمانہ ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ فلاں مخلوق بھی اسی طرح ہر بات کو جانتی ہے تو یہ شرک فی الصّفات ہوگا۔ اسی طرح نفع یا نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرّت اور راحت کے سامان عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم رکھتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ فلاں فرشتہ، یا جن، یا بزرگ انسان بھی اسی کی طرح ہماری بگڑی بنا سکتا ہے، یا ہمیں تکلیف اور نقصان پہنچا سکتا ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت میں اُسے ساجھی ٹھیرانا ہوگا۔ اور اس کے اس کام کو شرک فی الصّفات کہا جائے گا۔

تیسری قسم کے شرک کی صورت یہ ہے کہ صفات الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اللہ ہی کے لیے خاص نہ سمجھا جائے، بلکہ انھیں، یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے بھی ثابت اور موجود مان لیا جائے۔ مثلاً صفاتِ الٰہی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ حقیقی اطاعت اور محبّت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی اور سے بھی ایسی ہی محبّت اور عقیدت رکھے، یا اسی طرح کی اطاعت کا اسے مستحق قرار دے لے، تو یہ صفاتِ الٰہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک ٹھیرانا ہوگا۔ اسی طرح ان صفات کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور حکم دینے اور قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے، اس لیے اگر کسی اور کو بھی یہ حیثیت دے دی جائے خواہ وہ کوئی ایک فرد ہو یا بہت سے افراد کا مجموعہ، تو یہ شرک (شرک فی الحقوق) ہوگا۔

ان تینوں قسموں میں سے چاہے جس قسم کا بھی شرک ہو، اس کی موجودگی میں توحید کا اسلامی عقیدہ موجود نہیں پایا جا سکتا۔ اور جہاں توحید نہ ہو وہاں قرآن کا مطلوبہ ایمان بھی موجود نہیں ہو سکتا۔ اور جہاں ایمان موجود نہ ہو وہاں اسلام کا وجود بھی خارج از امکان ہی ہوگا۔ اسی لیے شرک کو قرآن نے "سب سے بڑا ظلم" قرار دیا ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ[1]

---

[1] سورہ لقمان — ۱۳

عَظِیْمٌ) اور فرمایا ہے کہ " خدا کے یہاں ہر گناہ کی معافی ممکن ہے، مگر شرک کی معافی ممکن نہیں "
(اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ[1])
ماننا پڑے گا کہ اس سے زیادہ حق اور انصاف کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ یہ ایسی ہی پکّی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ علاج سے وہ مریض بھی اچھا ہو جا سکتا ہے جو دق کے تیسرے درجے میں پہنچ گیا ہو، مگر وہ شخص اچھا نہیں ہوسکتا جس کا دل حرکت کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھا ہو۔ آخر جہاں بیج ہی نہ ہو وہاں درخت کیسے وجود میں آسکتا ہے۔

(۲) آخرت پر ایمان

آخرت پر ایمان لانے کا مطلب

'آخرت پر ایمان' لانے کا مطلب یہ ہے کہ حسبِ ذیل حقیقتوں کو سچّے دل سے تسلیم کیا جائے:۔

انسان[1] کی پیدائش ایک اعلیٰ اور متعین مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ وہ ایک ذمّہ دار ہستی ہے۔ اس کے پیدا کرنے والے نے اسے زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل ہدایت نامہ دے کر پیدا کیا ہے۔ اس کے مطابق عمل کرنا ہی حق اور نیکی ہے۔ اور اسے چھوڑ کر من مانا طریقہ اختیار کرنا گمراہی اور بُرائی ہے۔

انسان[2] کی زندگی موت کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے بعد بھی مسلسل باقی رہنے والی ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں وہ جو کچھ کرتا ہے، اپنے مادّی نتائج کے اعتبار سے اگرچہ وہ اسی جگہ ختم ہو جاتا ہے، مگر اپنے اخلاقی نتائج کے اعتبار سے سب کا سب باقی رہتا ہے۔ ایک دن ایسا آئے گا جب اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیّت کے مطابق زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ تہ و بالا کر دیا جائے گا اور اس زمین پر ایک جان دار بھی زندہ نہ رہ جائے گا۔

---

[1] سورہ النساء ــــ ۴۸

سب موت کی نیند سُلا دیے جائیں گے ــــ قرآن کی اصطلاح میں اسے "قیامت" کہتے ہیں۔

"قیامت"[۳] کے بعد وہ سارے جان دار، جو دنیا کی ابتدا سے آج تک پیدا ہو کر مر چکے ہیں، اور ابھی اس دن کے آنے تک پیدا ہو کر مٹ جانے والے ہیں، دوبارہ جسم و جان کے ساتھ زندہ کر کے اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے ــــ اسے "حشر" کہتے ہیں۔

حشر[۴] کے بعد سے ہماری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوگا۔ اس دور کی ابتدا اس بات سے ہوگی کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیے جائیں گے، اور وہ ہم سے ہماری زندگی کے پہلے دور کا حساب لے گا۔ اس وقت ہماری ذرّہ ذرّہ نیکی اور بدی کا سچّا ریکارڈ ہمارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ انصاف کی ترازو نصب ہوگی۔ ہر شخص کے عمل کانٹے کی تول تُلیں گے۔ جس[۱] خوش نصیب کا عمل باوزن ثابت ہوگا، اور اعمال نامہ نیکیوں کا اعمال نامہ قرار پائے گا اس کو زندگی کا یہ دوسرا دور بسر کرنے کے لیے نعمتوں بھری جگہ عطا ہوگی۔ یہ نعمتیں بے حد و حساب ہوں گی، کبھی ختم نہ ہوں گی، اور ایسی ہوں گی جن کا اس دنیا میں رہتے ہوئے تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا اور جن کے بعد انسان کو کسی اور چیز کی آرزو تک نہ ہو سکے گی ــــ اس جگہ کا نام "جنّت" ہے۔ اور جس[۲] بد نصیب کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا جس کا اعمال نامہ بُرائیوں کا اعمال نامہ ٹھیرے گا، جو اپنی زندگی کا پہلا دور غفلت اور حق ناشناسی کے ساتھ گزار کر اللہ کے سامنے حاضر ہوا ہوگا، اسے زندگی کا یہ دوسرا دور بسر کرنے کے لیے ایک ایسی جگہ دی جائے گی جو ناقابلِ بیان تکلیفوں اور اذیتوں کی جگہ ہوگی، ایسی تکلیفوں اور اذیتوں کی جگہ جو کبھی ختم ہونے والی نہ ہوں گی ــــ اس جگہ کا نام "جہنّم" ہے۔

اس[۵] حساب کتاب اور فیصلے کے بعد ہماری زندگی کا دوسرا دور اپنی پوری کیفیت کے ساتھ وجود میں آ جائے گا۔ اور یہ دور ایسا ہوگا جس کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ یہ زندگی ہمیشہ کی زندگی ہوگی۔ یہاں موت کا نام باقی نہ رہ جائے گا۔

یہ ہے وہ چیز جسے "آخرت" کہا جاتا ہے، اور یہ ہے اس آخرت پر ایمان لانے کا مطلب۔

آخرت پر ایمان لانے کی اہمیت

مومن ہونے کے لیے بالکل ناگزیر ہے کہ جس طرح اللہ پر ایمان لایا جائے۔ اسی طرح آخرت پر بھی ایمان لایا جائے۔ اس کے بغیر آدمی مومن اور مسلم نہیں ہوسکتا، اور اس کی عدم موجودگی میں اللہ پر ایمان کا ہونا بھی کوئی معنیٰ اور کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کا آنا بھی دراصل اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات ہی کا ایک ضروری تقاضا ہے۔ مثلاً اس کی صفتِ عدل کا، اس کی صفتِ حکمت کا، اس کی صفتِ رحمت کا، اس کی صفتِ قدرشناسی کا اور اس کی صفتِ حاکمیت کا۔ قیامت کے نہ آنے اور انسانی عمل کی جزا نہ ملنے کی شکل میں یہ بات محض ایک بے معنی دعویٰ بن کر رہ جاتی ہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا عادل اور حکیم ہے، رحیم اور شکور (قدرداں) ہے، مالک اور فرماں روا ہے۔ کیوں کہ اعمال کے اخلاقی نتائج اس دنیا میں تو جیسے چاہییں، سامنے آتے دیکھے نہیں جاتے۔ ظالم پھولتا پھلتا ہے تو حق پسند مصیبتیں اُٹھاتا رہتا ہے۔ اس لیے اس زندگی کے بعد اگر اس کا کوئی موقع نہیں آتا کہ ہر شخص اپنے کیے کا بدلہ پائے، تو یہ ایک عجیب و غریب صورتِ حال ہوگی، جو اللہ تعالیٰ کے عدل و حکمت اور اس کی رحمت و حاکمیت کی صریح نفی کر رہی ہوگی۔ اس لیے اللہ پر ایمان رکھنا اور جزا و سزا کا انکار کرنا، دونوں باتیں لفظوں کی حد تک تو اکٹھی ہوسکتی ہیں، مگر حقیقت میں کبھی اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔

شفاعت کا مشرکانہ نظریہ

آخرت میں اس بات کا فیصلہ کرنا کہ دنیا میں کس شخص نے ایک فرض شناس بندے کی حیثیت سے زندگی بسر کی ہے اور اس لیے اسے یہاں جنّت کی زندگی ملنی چاہیے، تمام تر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا:-

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ۔ (سورہ الحج۔ ۵۶)

حکومت اس دن اللہ کی ہوگی، وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔

عقل بھی جس پہلو سے دیکھتی ہے حقیقت اسے یہی نظر آتی ہے۔ مثلاً:۔
اللہ ہی ساری کائنات کا حاکم اور مالک ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ فیصلوں کا اختیار کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو۔

وہ علیم ہے، ازل سے لے کر ابد تک کی ہر بات سے وہ براہِ راست واقف ہے۔ کس نے دنیا میں کیا کیا ہے؟ اس کے ہاتھوں نے کیا کمایا ہے؟ اس کے دل کے ارادے کیا رہے ہیں؟ اس کا سینہ کن جذبات کو پالتا رہا ہے؟ رات کی سنسان تاریکیاں اور دن کی مصروف گھڑیاں اس نے کس طرح اور کن کاموں میں گزاری ہیں؟ —— یہ سب کچھ اس کے سامنے ایسا ہی روشن ہو گا جس طرح ہماری نگاہوں کے سامنے دوپہر کا سورج روشن ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی موجودگی میں صحیح فیصلوں تک پہنچنے کے لیے وہ قطعاً کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہو سکتا، نہ کسی اور کی رائے یا مشورے یا شہادت کی اسے کوئی ضرورت پیش آ سکتی ہے، خصوصاً ایسی شکل میں جب کہ یہ "کوئی اور" ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسے خود اپنے ہی ماضی اور مستقبل کا کوئی صحیح علم حاصل ہو۔ پھر ایک بہت کم جاننے والا، بلکہ فی الواقع کچھ نہ جاننے والا، سب کچھ جاننے والے کو حقیقت تک پہنچنے میں کیا مدد دے سکتا ہے؟

وہ عادل ہے، اس لیے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کسی سفارش پر ان لوگوں کو بھی بخش دے جو اپنے ایمان اور عمل کے لحاظ سے اصولاً بخشے جانے کے مستحق نہ ہوں۔ کیوں کہ یہ انصاف کی بات نہ ہو گی۔

غرض جس پہلو سے بھی دیکھیے، ایسی کسی خوش گمانی کی ذرا بھی گنجائش نظر نہیں آتی کہ آخرت کی کامیابی ایمان و عمل کے بجائے کچھ بزرگ ہستیوں کی خوشنودی پر موقوف ہے، وہاں کے محاسبے میں انہی کی سفارش سے کام بن جائیں گے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اثر انداز ہو کر لوگوں کو لازماً بخشوالیں گے، خواہ وہ اس کے قانونِ جزا کے مطابق بخشے جانے کے ذرا بھی مستحق نہ قرار پا رہے ہوں۔ قرآن مجید اس قسم کے خیال کو قطعی بے بنیاد قرار دیتا ہے، اور صراحت سے کہتا ہے کہ اس طرح کی کوئی سفارش وہاں کام نہ آسکے گی۔ کام نہ آسکنے کی بات تو الگ رہی، سرے سے ایسی کوئی سفارش کی ہی نہ جا سکے گی۔

.... مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِیَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ۔ [1]

.... اُس دن کے آنے سے پہلے، جس دن کہ نہ کوئی لین دین ہوگا، نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ کوئی سفارش ہوگی۔

صرف یہی نہیں کہ اس قسم کی سفارش کا خیال ایک بے بنیاد اور لاحاصل خیال ہے، بلکہ ذرا غور سے دیکھیے تو وہ سراسر ایک مشرکانہ خیال نظر آئے گا۔ کیوں کہ یہ نظریہ اسی وقت قبول کیا جاسکتا ہے جب پہلے یہ مان لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نہ اپنی سلطنت کا تنہا فرماں روا ہے، نہ اپنی رعایا کے متعلق فیصلہ کرنے میں کسی مداخلت سے بالاتر ہے، نہ اس کا علم ہر بات پر حاوی ہے، نہ وہ عادل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کے تصورات ایک مشرک ہی کے ہوسکتے ہیں، مومن کے نہیں ہوسکتے۔

شفاعت کا اسلامی تصوّر

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آخرت میں کسی قسم کی کوئی شفاعت ہوگی ہی نہیں۔ اس کے بخلاف واقعہ یہ ہے کہ جہاں قرآن اور حدیث میں اس مشرکانہ نظریۂ شفاعت کی بار بار تردید کی گئی ہے، وہیں ایک خاص قسم کے تصورِ شفاعت کا ان سے کھلا ہوا ثبوت بھی ملتا ہے۔ چنانچہ یہ بات اسلام کے تفصیلی عقائد میں شامل ہے کہ قیامت کے دن کچھ لوگ کچھ لوگوں کی شفاعت کریں گے۔

یہ شفاعت جس نوعیت کی ہوگی اس کا بہت کچھ اندازہ عقلی طور پر بھی لگا لیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اتنی بات تو بالکل کھلی ہوئی ہے کہ یہ شفاعت مذکورہ بالا شفاعت جیسی اور اس کے نظریے کے مطابق نہ ہوگی، بلکہ اس سے بنیادی طور پر مختلف ہوگی۔ ایسی ہوگی جس سے اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا، یا اس صفت کے کسی لازمی تقاضے کا انکار لازم نہ آتا ہوگا، اور

---

[1] سورہ البقرۃ - ۲۵۴

جو اس حقیقت سے کسی طرح بھی ٹکراتی نہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ہی اس پوری کائنات کا مالک و فرماں روا ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے، اس کا ہر کام اور ہر فیصلہ عدل و انصاف کی ترازو میں تُلا ہوتا ہے۔ پھر اگر یہ باتیں بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہیں تو اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ یہ شفاعت عام اور بے قید نہ ہوگی، بلکہ خاص اور محدود ہوگی، کچھ شرطوں کے ساتھ ہوگی، کسی ضابطے اور اصول کے تحت ہوگی۔

قرآن مجید نہ صرف یہ کہ اس عقلی قیاس کو ٹھیک بتاتا ہے، بلکہ اس نے اس ضابطے اور اصول کی پوری تفصیل بھی بیان کردی ہے، جس کے تحت یہ شفاعت ہوگی، اور وہ یوں ہے:-

(۱) شفاعت کا معاملہ پورے کا پورا اللہ تعالیٰ کے اپنے ہاتھ میں ہوگا، اور جو کچھ ہوگا اس کی مرضی کے تحت ہی ہوگا۔ (قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا)[1]

(۲) شفاعت کے لیے زبان صرف وہی شخص کھول سکے گا جسے اللہ تعالیٰ اذن دے گا۔ (مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهٗ إِلَّا بِإِذْنِهٖ)[2]

(۳) شفاعت کرنے والا شفاعت صرف اسی شخص کے بارے میں کر سکے گا جس کے حق میں شفاعت کرنے کی اسے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضا مل چکی ہوگی۔ (وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى)۔[3]

(۴) اس شفاعت میں وہ صرف ایسی ہی بات کہے گا جو ہر پہلو سے ٹھیک اور مطابق واقعہ ہوگی۔ (وَلَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا)[4]

ان حدود کے اندر جو شفاعت ہوگی اس کی نوعیت کچھ ڈھکی چھپی نہیں رہ جاتی۔ وہ قطعی طور پر غلامانہ عرض معروض اور دعا و استغفار سے بال برابر بھی مختلف کوئی چیز نہیں ہو سکتی ـــــ شفاعت کرنے والا نہ کسی شخص کے ایمان و عمل کے متعلق اللہ تعالیٰ کی معلومات

---

[1] سورہ زمر ـــ ۴۴ [2] سورہ البقرۃ ـــ ۲۵۵
[3] سورہ الانبیاء ـــ ۲۸ [4] سورہ النباء ـــ ۳۸

یں کوئی اضافہ کرے گا ، نہ اس کے قابلِ مغفرت قرار دینے کی بات منہ سے نکال سکے گا ، اور نہ کسی جہت سے اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اثرانداز ہونے کا خیال تک دل میں لا سکے گا ، بلکہ صرف یہ کرے گا کہ سلطانِ کائنات کے حضور ، اور وہ بھی اس کی اجازت ملنے کے بعد ، عاجزانہ درخواست کرے گا ، رحم و کرم کی بھیک مانگے گا ، کہے گا کہ مالک ! اپنے فلاں بندے کے گناہوں کو معاف کر دے ، اس کی کوتاہیوں سے درگزر فرما ، اسے اپنی رحمت اور مغفرت کے دامن میں لے لے ۔ اس طرح حقیقتِ واقعی تو یہ قرار پاتی ہے کہ جس طرح اس شفاعت کا قبول کرنے والا اللہ تعالیٰ ہوگا ، اسی طرح یہ شفاعت کرنے والا یا شفاعت کرانے والا بھی فی الاصل وہی ہوگا ۔ چناں چہ بعض مقامات پر قرآن مجید نے یہ صراحت کر بھی دی ہے ۔ مثلاً :۔

لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُونِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيعٌ ۔[1]

ان کے لیے اس کے سوا کوئی کارساز ہوگا نہ کوئی شفاعت کرنے والا ۔

یہ شفاعت کرنے والے کون لوگ ہوں گے ، اور جن کے حق میں شفاعت کی جائے گی ، وہ کون اور کیسے لوگ ہوں گے ؟ اس سلسلے میں حدیث یہ بتاتی ہے کہ شفاعت کرنے والے اللہ کے نیک اور مقرّب بندے ہوں گے ، اور جن کے حق میں شفاعت کی جائے گی وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کا ایمان و عمل حساب کتاب کے وقت کچھ ایسا کم وزن نکلا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے عام قانونِ مغفرت کے تحت وہ بخشے جانے کے مستحق نہ قرار پا سکیں گے اور اس استحقاق میں کچھ کسر رہ گئی ہوگی ۔ یہی ' کسر ' وہ چیز ہوگی جس سے درگزر کرانے کے لیے شفاعت کی جائے گی ۔

یہاں ذہن ایک اور سوال کرے گا ۔ اور وہ یہ کہ اس شفاعت میں واقعی معنویت کیا ہوگی ؟ وہ فی الواقع کس غرض کے لیے ہوگی ؟ اگر شفاعت کرنے والا شفاعت کرنے کے معاملے میں اتنا بے اختیار ہے جتنا کہ اوپر ذکر کی ہوئی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے ، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ شفاعت کے بعد جن لوگوں کی مغفرت کا اعلان

---

[1] سورہ الانعام ۔ ۵۱

کیا جائے گا، ان کی مغفرت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے طور پر پہلے ہی کر چکا ہوگا۔ پھر اس شفاعت کا واسطہ درمیان میں کس غرض کے لیے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شفاعت کی اصل غرض و غایت اللہ کی جانب سے اس کے اُن خاص بندوں کو عزّت بخشنی ہوگی جن کو وہ اپنی بارگاہ میں زبان کھولنے اور عرض معروض کرنے کی اجازت دے گا۔ حشر کے بھرے میدان میں، جہاں سب خاموش، سہمے، سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور کسی کو دم مارنے تک کا یارا نہ ہوگا، ان لوگوں کے لیے یقیناً بڑی ہی عزت اور شرف کی بات ہوگی جنھیں بات کرنے کی اجازت مل جائے، اور بات بھی اتنی بڑی گزارش کے لیے کہ خدایا! فلاں فلاں کوتاہ عمل بندوں کی مغفرت فرما دے، اور پھر فرماں روائے کائنات کی طرف سے اس گزارش کو منظور کر لیے جانے اور ان بندوں کے بخش دیے جانے کا اعلان بھی ہو جائے۔

اس ساری تفصیل سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو گئی ہوگی کہ شفاعت دراصل اللہ تعالیٰ کے ایک ایسے خاص ضابطۂ مغفرت کا نام ہے جو مغفرت کے عام قانون سے قدرے مختلف ہے۔ اس کو ہم مغفرت کا رعایتی ضابطہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر ہے یہ بھی بہر حال ایک ضابطہ ہی، جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ توحید، صفتِ عدل، صفتِ حاکمیت اور صفتِ علم و حکمت کے تقاضوں سے بہر حال ہم آہنگ ہے، اور جس سے اصل قانونِ جزا و سزا کی معنویت کو ذرا بھی خراش نہیں لگتی۔

بلاشبہ کتاب و سنّت سے یہی واضح ہوتا ہے کہ آخرت میں کسی کی بھی مغفرت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بغیر نہ ہو سکے گی، اور یہ پیغمبر اسلامؐ ہی کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص بھی محض اپنے عمل کے بل پر نجات نہ پا سکے گا۔ (اِعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ لَنْ یَّنْجُوَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ بِعَمَلِهٖ[۱]) لیکن جس طرح یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے، اسی طرح یہ حقیقت بھی کچھ کم مسلّم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا "یہ فضل و کرم" بھی بہر حال اپنا ایک ضابطۂ عدل رکھتا ہوگا، اور صرف ان ہی لوگوں کو اپنے سایہ میں لے گا جو اپنے ایمان اور عمل کی بنا پر اس کے مستحق ٹھیریں گے۔ جو شخص جتنا ہی

---

[۱] مسلم۔ جلد دوم۔ باب لن یدخل احد الجنۃ بعملہ بل برحمۃ اللہ تعالیٰ۔

زیادہ اچھا ایمان اور عمل لے کر حاضر ہوا ہوگا وہ اس فضل وکرم کا اتنا ہی زیادہ حق دار ثابت ہوگا، اور جس کے پاس یہ پونجی جتنی ہی کم ہوگی وہ اس عنایت کا اتنا ہی کم مستحق قرار پائے گا۔ یہاں تک کہ کتنے ہی ایسے بھی ہوں گے جو اس کرم بخشی کے بالکل ہی اہل نہ ٹھیریں گے۔ غرض مغفرت کا عملی انحصار اصلاً انسان کے اپنے ایمان وعمل پر ہی ہوگا۔ اور اس بارے میں اوّل سے آخر تک سارے فیصلے صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوں گے۔

یہ ہے اسلام میں شفاعت کا صحیح تصور۔ آخرت پر ایمان لانے اور رکھنے کا دعویٰ بالکل بے معنیٰ ہے جب تک شفاعت کے بارے میں صحیح اسلامی تصور کو اپنا کر اُس باطل نظریے سے اپنے ذہن کو پوری طرح پاک نہ کر لیا گیا ہو جس کا تذکرہ ابھی اُوپر آچکا ہے۔ کیوں کہ اس باطل نظریے کی موجودگی میں توحید اور آخرت پر ایمان رکھنے کا مقصد ہی فوت ہوکر رہ جاتا ہے۔ اللہ پر اور آخرت پر ٹھیک ٹھیک ایمان رکھنے کا مقصد یہی تو ہے کہ انسان کو حقیقت کا صحیح علم ہو، تاکہ وہ اپنی زندگی میں عمل کا صحیح رویّہ اختیار کر سکے، اور دنیا میں اللہ کا 'عبد' اور اس کا 'مسلم' بن کر رہے۔ کیا شفاعت کا یہ نظریہ انسان کو اصل حقیقت کا شناسا، اور صحیح راہِ عمل پر گامزن رہنے دے سکتا ہے؟ نہیں، قطعاً نہیں۔ کیوں کہ وہ تو اسے خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے کہ آخرت کی بازپُرس میں کامیابی کا اصل انحصار ایمان وعمل پر نہیں بلکہ کچھ بزرگ ہستیوں کی خوشنودی اور شفاعت پر ہے۔ اور ان ہستیوں کی خوشنودی اور شفاعت کے میسّر آنے کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ ان کے آستانے پر عقیدت کی نذریں پیش کی جاتی رہیں۔ سوچیے، اس نظریے کے ساتھ آخرت کی سچّی فکر اور اللہ تعالیٰ کی صحیح فرماں برداری کا احساس کیوں کر باقی رہ سکتا ہے؟ واضح طور پر یہ ایک سرتاسر افیونی تخیّل ہے، اور اس تخیّل کے ساتھ آخرت کا ماننا نہ ماننے کے برابر ہی رہ جاتا ہے۔ اس لیے آخرت کے اسلامی عقیدے کو، اس کی اپنی صحیح شکل میں، ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کے لیے ضروری ہے کہ شفاعت کے بارے میں ذہن اچھی طرح صاف ہوگیا ہو۔

۞

(۳) رسالت پر ایمان

رسالت اور اس کی ضرورت

اِسلام کا تیسرا ضروری بنیادی عقیدہ "رسالت" ہے۔ رسالت کے لفظی معنی 'سفارت' اور 'پیغامبری' کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں 'رسالت' اس سفارت کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے تشریعی احکام پہنچانے اور انھیں اپنی مرضی کی راہ بتانے کے لیے قائم کیا ہے۔ اس کا دوسرا نام "نبوّت" ہے۔

رسالت کا سلسلہ کیوں قائم کیا گیا ہے؟ اس کی ضرورت کس لیے پیش آئی؟ اور اس پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ ان مسائل پر غور کرنے کے لیے ہمیں ذرا دور سے چلنا ہوگا یعنی پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ انسان جس مقصد سے پیدا کیا گیا ہے اس کے انجام پانے کی عملی شکل کیا ہو سکتی تھی؟

اسلام نے انسان کے پیدا کیے جانے کا جو مقصد، اور اس کی زندگی کا جو فریضہ بتایا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس پر آخرت کی فلاح موقوف ہے۔ "اللہ کی بندگی اور اطاعت"، کا نام آتے ہی فطری طور پر اللہ کے احکام اور مرضیات کا سوال سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اطاعت، احکام ہی کی ہوتی ہے، اور احکام کے بغیر اس کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ایک انسان جوں ہی اپنے پروردگار کا بندہ اور اطاعت گزار بن کر رہنے کا فیصلہ کرے گا وہ لامحالہ یہ جاننا چاہے گا کہ اس کے مالک کے وہ احکام کیا ہیں جن کی اُسے اطاعت کرنا ہے؟ وہ کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور کن باتوں کو ناپسند؟ کیا کرے کہ وہ اس کا وفادار ٹھہرے، اور کیا کرنے سے بچے کہ اس کی نافرمانی کی پاداش سے محفوظ رہے؟ یہ جانے بغیر وہ بندگی اور اطاعت الٰہی کی راہ کا پہلا قدم بھی نہ اُٹھا سکے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟

انسان یہ کیسے معلوم کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں فلاں باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور فلاں فلاں کاموں سے روکا ہے ؟

اس کے جواب میں جن ذرائع کا نام لیا جا سکتا ہے ان میں سے ایکؔ تو ہر شخص کی اپنی عقل ہے ۔ لیکن ہر شخص تو کیا، کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو بطور خود اپنی عقل سے یہ معلوم کرلے کہ اس کی زندگی کے اور اس کائنات کے حقائق کیا ہیں ؟ اس کے خالق اور پروردگار میں کیا صفتیں پائی جاتی ہیں ؟ ہم انسانوں سے اس کی ان صفتوں کے تقاضے کیا ہیں ؟ اور ہمارے لیے اس کے احکام کیا ہیں ؟ غرض اس سلسلے میں عقل کی نارسائی بالکل مسلم ہے ۔

دوسری ۲ چیز انسان کا اپنا وجدان اور اس کی قوتِ قلب ہے ۔ لیکن اس قوت کا معاملہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ۔ ریاضتِ نفس کی کوئی بڑی سے بڑی کوشش بھی یہاں کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکتی ۔ کیوں کہ انسان اپنے باطن کو مانجھ کر چاہے کیسا ہی آئینہ کیوں نہ بنالے، اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور مرضیات کا عکس آپ سے آپ ہرگز دکھائی نہیں دے سکتا ۔ آئینے میں کسی چیز کا عکس پڑنے کے لیے یہی تو کافی نہیں ہے کہ وہ صاف اور چمک دار ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کھلی شکل میں اس کے سامنے اور اس کے قریب موجود ہو ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جب تک خود ہی اپنے احکام کا تعین کر کے انہیں وجود میں نہ لادے اور وجود میں لا کر قلبِ انسانی کے سامنے رکھ نہ دے، لاکھ صاف اور چمک دار ہونے کے باوجود بھی اس کے اندر ان کی چھاپ نہیں پڑ سکتی ۔ لیکن آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا ہے ۔ اِس لیے احکامِ الٰہی کے معلوم کرنے کا یہ ذریعہ بھی انتہائی ناکام ذریعہ ہے ۔

تیسری ۳ چیز فرد، فرد کے بجائے بہت سے افراد کا اجتماعی غور و فکر ہے ۔ لیکن جس طرح ہزاروں اور لاکھوں اندھے مل کر ایک آنکھوں والے شخص کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے، اسی طرح افرادِ انسانی کی کوئی بڑی سے بڑی تعداد بھی احکامِ الٰہی کے دریافت کر لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ آخر "بہت سے افراد" کا یہ مجموعہ بھی تو ایسے ہی لوگوں سے مل کر بنا ہوگا جن میں کا کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں جو اپنی عقل سے احکامِ الٰہی معلوم کر لینے کا خواب بھی دیکھ سکے ۔ اس لیے یہ ذریعہ بھی اتنا ہی ناکام ذریعہ ہے جتنا کہ پہلا ۔

غرض ان تینوں ہی ذرائع میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو انسانی زندگی کی اس سب سے اہم اور غیر معمولی ضرورت کو پورا کر دے سکے۔

یہ صحیح ہے کہ بہت سے کام ایسے ہیں جن کا بُرا یا بھلا ہونا ہمیں خود بخود محسوس ہو جاتا ہے، اور ان کی بُرائی یا بھلائی کا فیصلہ ہم اپنی فطرت، یا اپنی عقل، یا اپنے وجدان سے خود بھی کر لے سکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ہدایتِ الٰہی بھی بُرے اور بھلے کاموں کی تعیین ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن محض اتنی سی بات سے یہ خیال کر بیٹھنا صحیح نہ ہوگا کہ انسان بطورِ خود اللہ تعالیٰ کے تمام احکام اور مرضیات کا اندازہ لگا لے سکتا ہے۔ کیوں کہ "کچھ" کاموں کے بُرے یا بھلے ہونے کا علم و اندازہ "تمام" کاموں کے بارے میں علم و اندازے کا قائم مقام کسی طرح نہیں بن سکتا۔

نگاہیں پھیلا کر اپنی دنیا کو دیکھیے۔ آخر وہ کتنی قدروں کے بارے میں یک رائے ہے؟ کتنے کام ہیں جن کے بھلے ہونے پر۔ اور کتنے کام ہیں جن کے بُرے ہونے پر پوری نوعِ انسانی متفق ہے؟ بڑی رعایت کے بعد بھی آپ ایسے کاموں اور ایسی قدروں کی کوئی قابلِ لحاظ تعداد نہیں گنا سکتے جن کی بھلائی اور بُرائی پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو۔ اور جن تھوڑی سی باتوں پر اتفاق ہو گا تفصیلات میں جاتے کے بعد اُن کے بارے میں بھی یہ اتفاق جوں کا توں باقی نہ رہ جائے گا۔ ظاہر ہے اتنی معمولی سی بنیاد پر اتنے بڑے دعوے کی عمارت کسی طرح نہیں اُٹھائی جا سکتی۔ چند کاموں کے بُرے یا بھلے ہونے کا فیصلہ نوعِ انسانی اگر خود کر سکتی ہے تو یہ بات خیر اور شر کے پورے مسئلے کو حل کر لینے کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ بلاشبہ یہ تو نہ کہا جائے گا کہ دیے کی روشنی روشنی نہیں، لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ ایک دنیا کو منوّر کرنے کے لیے جس سورج کی ضرورت ہے یہ دیا اس کی جگہ ہرگز نہیں لے سکتا۔

معلوم ہوا کہ اس معاملے میں انسانی قوتوں کی بے بسی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ جس کے خلاف نہ عقل کچھ کہہ سکتی ہے، نہ تجربہ و مشاہدہ زبان کھول سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کا مطالبہ واضح طور پر یہی تھا کہ انسان کی اوپر سے رہنمائی کی جاتی۔ کیوں کہ اس کی اپنی فکری اور وجدانی قوتوں میں اگر یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات معلوم کر سکیں، حالاں کہ

وہ ان کا غذا اور پانی کی طرح ضرورت مند تھا، تو اب اس کی اس ضرورت کے پوری ہونے کی شکل اس کے سوا اور کوئی رہ ہی نہیں جاتی تھی کہ اس کا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کوئی خارجی انتظام ہو۔

ایک طرف تو یہ صورتِ حال اور انسان کی یہ سب سے بڑی بنیادی ضرورت تھی، دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت تھی، اس کی رحمت تھی، اس کا عدل تھا، اس کی حکمت تھی اور ان میں کی ہر صفت اس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ انسان کو یوں بے بسی کے اندھیرے میں نہ چھوڑا جائے، بلکہ اس کی مدد کی جائے اور اس کو وہ احکام صاف اور صریح لفظوں میں بتا دیے جائیں جن کے جانے بغیر وہ بندگی اور اطاعت کی راہ اختیار ہی نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں ممکن نہ تھا کہ اللہ ربّ العالمین اپنے احکام و مرضیات سے انسانوں کو واقف کرانے کا کوئی خارجی اور بالائی اہتمام نہ کرتا، اس سلسلے میں ایک دن کی بھی تاخیر روا رکھی جاتی۔ اور نسلِ انسانی کی ابتداء کے ساتھ ہی ساتھ اس اہتمام کی بھی ابتداء نہ ہو جاتی۔ جس پروردگار نے اولادِ آدم کی مادّی ضرورتوں کا سامان مہیّا کرنے کے لیے زمین پر اتنا بڑا انتظام کر رکھا تھا، اس کی شانِ پروردگاری سے بالکل بعید تھا کہ وہ اس کی اخلاقی اور دینی ضرورتوں کی طرف توجّہ نہ فرماتا۔ جس مالک نے انسان پر اپنی مرضی کی راہ چلنے کی بھاری ذمہ داری ڈالی تھی، اس کی رحمت، اس کا فضل و کرم اور اس کا عدل یہ کیسے گوارا کرتا کہ وہ اسے اس راہ سے باخبر کرنے کا ضروری انتظام نہ کرے۔ چنانچہ اُس نے یہ انتظام کیا، اور بھرپور طریقے سے کیا۔ اور یہی وہ انتظام ہے جسے دین کی اصطلاح میں "رسالت" کہا جاتا ہے، اور جس واسطے سے یہ انتظام ہوتا ہے اسے "رسول" کہتے ہیں۔

جہاں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ رسالت کے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات سے واقف نہیں ہو سکتا، وہاں اس حقیقت کو بھی عیاں ہی سمجھنا چاہیے کہ رسالت پر ایمان لانا مومن اور مسلم بننے کے لیے قطعی ضروری ہے۔ ٹھیک اسی طرح ضروری ہے جس طرح دیکھنے کے لیے آنکھوں کی پتلی میں بینائی ضروری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جو چیز کسی منزل تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہو، جب تک اس کو نہ اپنا لیا جائے، منزل تک پہنچنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکے گا۔

پھر بات اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ رسالت کی عملی اہمیت اس سے بھی بڑی ہے۔ یعنی امر واقعی صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر اللہ کے احکام کو نہیں جانا جا سکتا، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بغیر خود اللہ اور آخرت کو بھی نہیں جانا پہچانا جا سکتا۔ رسالت ہی وہ تنہا ذریعہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت، اور آخرت کا صحیح علم عطا کرتا ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہ رسالت کے بغیر اللہ اور آخرت پر بھی ایمان جیسا چاہیے، نہیں لایا جا سکتا۔ اس لیے رسالت پر ایمان رکھنا بھی اگر اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے تو یہ ایک ایسا حق ہے جو اسے ملنا ہی چاہیے تھا۔

اصولی طور پر جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ رسالت، غذا اور پانی کی طرح انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے، تو اب اس عقیدے کے ضروری تفصیلی جائزے کی طرف آئیے۔

قرآن مجید نے رسالت کے بارے میں جو اہم حقیقتیں بیان کی ہیں وہ یہ ہیں:-

۱۔ رسول انسان ہی تھے

اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے احکام بھیجنے کا ذریعہ ہمیشہ انسانوں ہی کو بنایا ہے یعنی اللہ کے یہ رسول نہ فرشتوں میں سے ہوتے تھے، نہ جنوں میں سے، نہ کسی اور مخلوق میں سے۔ اور نہ ایسا ہے کہ اپنے احکام بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ خود ہی کسی انسانی یا غیر انسانی شکل میں یہاں آتا رہا ہو۔ اس کے بخلاف امر واقعی یہ ہے کہ جب بھی کوئی رسول بھیجا گیا، نوعِ انسانی ہی میں سے بھیجا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:-

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ[1] الخ

اے نبی! ہم نے تم سے پہلے بھی (رسول بنا کر) صرف آدمیوں ہی کو بھیجا تھا، جن پر ہم اپنی وحی نازل کرتے تھے۔

---

[1] سورہ یوسف - ۱۰۹

قرآن مجید نے پچھلی قوموں اور دعوتوں کے جو واقعات بیان کیے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو لوگوں نے ہمیشہ تقریباً یہی کہہ کے ٹھکرایا کہ تم بھی تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو، پھر اللہ کے سفیر اور رسول ہونے کا دعویٰ کس طرح کرتے ہو؟ (قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا[1]) اور اس اعتراض کے جواب میں ان حضرات نے کبھی یہ نہیں کہا کہ نہیں، تم غلط کہہ رہے ہو کہ ہم بھی تمہارے ہی جیسے بشر ہیں، بلکہ سب نے یہی کہا کہ بے شک ہم بشر ہیں، اور تمہارے ہی جیسے بشر ہیں (قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ[2]) اس لیے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ رسالت کے لیے تقرر ہمیشہ انسانوں ہی کا ہوا ہے، ٹھیک ویسے ہی انسانوں کا، جیسے کہ ہم آپ ہیں۔ ہماری ہی طرح وہ جسم و جان رکھتے، قوتیں اور خواہشیں رکھتے، بیوی بچے رکھتے، قوانینِ طبیعی کے تحت پیدا ہوتے، نشوونما پاتے، کھاتے اور پیتے، سوتے اور جاگتے، خوشی اور غم کا احساس کرتے، ہنستے اور روتے، تندرست رہتے، بیمار پڑتے اور وفات پاتے۔ غرض وہ ہر پہلو سے بشر ہی ہوتے اور بشریت کا ایک ایک لازمہ اور خاصہ ان کے اندر موجود ہوتا۔ حقیقتِ حال کی یہ تفصیل "اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" جیسی آیتوں ہی سے سمجھ میں نہیں آتی، بلکہ قرآن مجید نے جگہ جگہ اس کی صراحتیں بھی فرما رکھی ہیں:۔

اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ۔[3]

... بلاشبہ یہ رسول کھانا کھاتے اور (سودا سلف خریدنے کے لیے) بازاروں میں چلتے پھرتے۔

جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً۔[4]

ہم نے ان کے لیے بیوی بچے بنائے تھے۔

جس مصلحت کی بنا پر رسالت کے لیے انسانوں ہی کا تقرر ہوا، اس کی بھی قرآن حکیم نے نشان دہی کر دی ہے۔ جب لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف یہ 'دلیل' دی کہ اگر اللہ کو ہمارے پاس اپنا کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کسی فرشتے کو بھیجتا، نہ کہ

---

[1] سورہ ابراہیم ۔ ۱۰ [2] سورہ ابراہیم ۔ ۱۱ [3] سورہ الفرقان ۔ ۲۰
[4] سورہ الرعد ۔ ۳۸

ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو، تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَآئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا [1]

اے نبیؐ! اُن سے کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے چلتے پھرتے اور آباد تو ہم ضرور اُن پر آسمان سے کسی فرشتے رہی، کو رسول بنا کر بھیجتے۔

یہ آیت رسالت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ایک متعین دستور بتا رہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ رسول کو اسی جنس اور اسی مخلوق میں سے ہونا چاہیے جس کے پاس جاکر اسے رسالت کا فرض انجام دینا ہے۔ دیکھنے میں یہ اگرچہ صرف ایک بات ہے لیکن فی الواقع یہ ایک ایسا کلمۂ حکمت ہے جو عقلِ سلیم کو پوری بات سمجھا دیتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت آپ سے آپ کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انسانوں تک اللہ کے احکام پہنچانے والے رسولوں کا انسان ہی ہونا ضروری تھا۔ ورنہ رسالت کا منشا پورا ہی نہ ہو پاتا۔ کیوں کہ رسول اگرچہ لوگوں تک احکامِ الٰہی کے پہنچنے کا واسطہ ہوتا ہے، لیکن واسطۂ محض نہیں ہوتا کہ وہ صرف 'پوسٹ مین' ہوتا ہے، اور اس کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ وہ بس فون اور ٹیلی گرام کے تاروں کی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام اس کے بندوں تک منتقل کردے۔ نہیں، وہ اس کے سوا بھی بہت کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کا پہنچانے والا ضرور ہوتا ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ ان حکموں کا داعی بھی ہوتا ہے، ہادی بھی ہوتا ہے، معلم بھی ہوتا ہے، شارح بھی ہوتا ہے، ان کے مطابق لوگوں کا علمی اور عملی تزکیہ بھی کرتا ہے اور سب سے پہلے خود ان کی پیروی کرکے دوسروں کے سامنے عمل کا معیاری نمونہ (اسوۂ حسنہ) بھی پیش کرتا ہے۔ اور یہ ساری باتیں اس کے فرائض میں شامل ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جب تک یہ سب کچھ نہ ہو، وہ مقصد حاصل ہی نہیں ہوسکتا جس کے لیے رسالت کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے۔ غور کیجیے کہ کیا کوئی دوسری مخلوق ان سارے کاموں کو انجام دے سکتی ہے؟ ظاہر ہے اس کا صرف ایک ہی جواب ہوگا،

---

[1] سورہ بنی اسرائیل - ۹۵

اور وہ یہ کہ دوسری کوئی مخلوق ان کاموں میں سے کچھ کو شاید انجام دے دے۔ مگر سب کو ہرگز نہ دے سکے گی۔ مثلاً فرشتوں ہی کو لے لیجیے، جن کی طرف اس سلسلے میں سب سے پہلے نگاہ اُٹھ سکتی ہے۔ اگر کسی فرشتے کو رسول بنا کر انسانوں کے پاس بھیجا جاتا تو سوچیے، صورتِ حال کیا بنتی؟ یہ تو صحیح ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں تک جوں کا توں ضرور پہنچا دیتا، مگر فرشتہ ہوتے ہوئے وہ ان میں ان احکام پر آخر خود کیسے عمل کر پاتا جن کا تعلق خالص بشری جذبات و مطالبات اور مخصوص انسانی مسائل و معاملات سے ہے؟ اور جب وہ ان پر عمل کر ہی نہ پاتا تو ان کی حد تک اپنے پیرووں کے لیے 'اسوۂ حسنہ' کیسے پیش کر سکتا؟ اسی طرح وہ ان بشری جذبات اور مطالبات سے بے خبر ہوتے ہوئے اُن سے تعلق رکھنے والے امور میں لوگوں کی بروقت رہنمائی کیسے کر پاتا؟ ان کے مسائل کو کیسے حل کرتا؟ ان کے لیے کتابِ الٰہی کے دیے ہوئے پورے نظامِ زندگی کے بنیادی خاکے میں تفصیلات کا رنگ کیسے بھرتا؟ وہ جانتا ہی نہ کہ نفسِ انسانی کے احوال کیا رُخ اختیار کرتے رہتے ہیں۔ پھر وہ اس کا تزکیہ کس طرح کرتا؟

قرآن مجید کا بیان ہے کہ ہر نبی اسی قوم کے اندر سے ہوتا جس کے پاس اسے نبی بنا کر بھیجا جاتا۔ اسی طرح اس پر اُترنے والا کلامِ الٰہی بھی اسی زبان میں ہوتا تھا جو زبان کہ اس کی قوم بولتی تھی (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ) تاکہ وہ اللہ کا پیغام قوم پر اچھی طرح واضح کر دے (لِيُبَيِّنَ لَهُمْ)۔ قرآن مجید کے اس بیان سے اندازہ لگائیے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اپنے پیغام کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دینے کا کیسا ہمہ جہتی اور کامل انتظام کر رکھا ہے، اور اس بات کو کتنی اہمیت دی ہے کہ کوئی واقعی زحمت یا عذر اس کے بھیجے ہوئے دین کے سمجھ پانے کی راہ میں حائل نہ رہ سکے، اور لوگوں پر اس کی حجت ہر طرح پوری ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس غرض کے لیے اگر نبی کا ہم قوم ہونا اور پیغامِ الٰہی کا اسی قوم کی زبان میں ہونا ضروری تھا تو کوئی شک نہیں کہ نبی کا انسان ہونا اُس سے کئی گُنا زیادہ ضروری تھا۔

---

[۱] [۲] سورہ ابراہیم۔۴

۲۔ منصب رسالت کی نوعیّت

رسالت کوئی اکتسابی چیز نہیں کہ اسے کوشش کر کے حاصل کر لیا جا سکے، بلکہ وہ ایک وہبی شے اور اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے، اور اسی کو ملتی ہے جسے وہ مرحمت فرماتا ہے۔ اس کے ملنے میں انسانی کوشش اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ اس منصب یا ذمہ داری کے لیے افراد کا "انتخاب" خود کرتا رہا ہے، جس کو قرآن کی زبان میں "اصطفاء" کہتے ہیں۔ "اصطفاء" کے معنی ہیں بہت سی چیزوں میں سے سب سے بہتر چیز کو چن لینا۔ یہ لفظ بتاتا ہے کہ رسالت کے لیے انتخاب ایسے ہی افراد کا ہوتا رہا ہے جو اپنی مختلف صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے اس عظیم اور مقدس منصب کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوتے تھے۔ یہ بات عقلاً بھی ضروری معلوم ہوتی ہے اور قرآن مجید کے بعض اشارات سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے جب آپؐ کے نبی بنائے جانے کے دعوے پر اعتراض کیا اور اپنے لیے بھی برابر کے استحقاق کی باتیں کیں تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ[1]

اللہ بہتر جانتا ہے کہ اسے پیغمبری کس کے سپرد کرنی چاہیے تھی۔

نہ صرف یہ کہ رسالت سیکھنے اور کوشش کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ دوسرے لوگ تو اس کی حقیقت کو پا بھی نہیں سکتے، جیسا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:-

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔[2]

یہ لوگ وحی کے بارے میں تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا ہے؟ ان سے کہہ دو کہ وحی میرے رب کے (خاص) امور میں سے ہے۔ اور (جہاں تک تم عام انسانوں کا تعلق ہے) تمہیں بہت کم علم بخشا گیا ہے۔

---

[1] سورہ الانعام - ۱۲۴ [2] سورہ بنی اسرائیل - ۸۵

یعنی فطری طور پر تمہارے علم و فہم کی رسائی اتنی ہے ہی نہیں کہ تم "وحی" کو سمجھ سکو، اور اس کی حقیقت کو پا سکو۔ وحی کا نہ سمجھ پانا دراصل نبوت کی حقیقت کا نہ سمجھ پانا ہے۔ کیوں کہ یہی وحی نبوت کی خاص بنیاد ہے، اور اسی کے ملنے سے ایک شخص نبی بنتا ہے۔

۳۔ رسالت کی ہمہ گیری

نبی ہر اُمت میں بھیجے گئے ہیں:-

وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ۔[1]

کوئی بھی امّت نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا (رسول) نہ گزر چکا ہو۔

اور ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ کیوں کہ انسان انسان سب برابر ہیں، چاہے ان کا تعلق جس قوم یا سرزمین سے ہو۔ سب ایک ہی مقصد کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اللہ کی بندگی کو سبھی کا فریضۂ زندگی ٹھیرایا گیا ہے۔ اور آخرت میں اس فرض کے متعلق جو پوچھ گچھ ہوگی وہ سبھی سے ہوگی۔ پھر ایسا کیوں ہوتا کہ کچھ لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ اُن کا یہ فریضہ یاد دلاتا اور کچھ کو غافل چھوڑ دیتا؟ کچھ گروہوں کو اپنے احکام کا علم دے دیتا اور کچھ کو اس سے محروم رکھتا؟ جب کہ وہ یکساں طور پر سبھی کا خالق، سبھی کا مالک، سبھی کا رب اور سبھی کا الٰہ ہے، اس کی رحمت سب کے لیے عام ہے اور اس کا انصاف دو نگاہی سے یکسر پاک ہے۔

واضح رہے کہ ہر "امّت" میں رسول کے آنے کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم اس کی کسی ایک پشت میں کوئی رسول ضرور بھیجا گیا ہے۔

۴۔ تعلیماتِ رسول کی حیثیت

رسول، دین و شریعت کے نام پر لوگوں کو جو کچھ بھی بتاتا ہے، وہ سب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ کوئی بات بھی اس کے اپنے جی کی نہیں ہوتی۔

---

[1] سورہ فاطر - ۲۴

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحَىٰ ۔[1]

نبی (دین کے معاملے میں) اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ صرف وہ وحی ہوتی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

'نبی کی ساری تعلیمات کے اللہ ہی کی جانب سے ہونے' کا مطلب ذرا وسیع ہے، اور اس کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں :-

ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام وہدایات متعین لفظوں میں خود براہِ راست، یا فرشتے کے ذریعے سے، نبی کو سکھا دیے ہوں۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کو جو احکام سکھائے اور بتائے گئے ہوں انھیں سامنے رکھ کر اس نے اجتہاد کیا ہو، اور اللہ کی مرضیات کی ترجمانی کرتے ہوئے اُن سے خود مزید احکام نکالے ہوں۔ گویا پہلی قسم کی تعلیمات کا اللہ کی طرف سے ہونا اصلاً اور براہ راست ہوتا ہے، اور دوسری قسم کی تعلیمات کا اللہ کی طرف سے ہونا نبی کے اجتہاد کے واسطے سے ہوتا ہے۔

۵۔ انبیاء کی عصمت

نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس سے نہ فکر و اجتہاد کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، نہ اعمال و اخلاق کی لغزشیں۔ نفس اور شیطان کی دراندازیوں سے اس کے جذبات، اخلاق، افکار اور اعمال، سبھی پاک ہوتے ہیں۔ اس سے اگر غلطیاں کبھی ہو سکتی ہیں تو صرف ایسے غور و فکر اور اندازے میں ہو سکتی ہیں جس کا تعلق، امورِ تدبیر اور غیر تشریعی معاملات سے ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے غور و فکر اور اندازے کی غلطی کا معصومیت کے مسئلے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیوں کہ معصوم ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ کے احکام کے سمجھنے اور ان سے مزید احکام نکالنے میں غلطی نہیں کرتا، اور نہ اس کی مرضیات کی عملی پیروی کرنے میں کسی کوتاہی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لیے دوسرے معاملات میں قیاس اور اندازے کی غلطی کا اس مسئلے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

---

[1] سورہ النجم۔ ۳، ۴

نبی معصوم اِس لیے نہیں ہوتا کہ فطری طور پر اس کی سوچ میں یا عمل میں کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے بخلاف حقیقت واقعی یہ ہے کہ دوسروں کی طرح انبیاء علیہم السّلام کے اندر بھی یہ امکانِ خطا لازماً موجود ہوتا ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ یہ امکان کبھی عمل کا جامہ نہیں پہن پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کی فکر اور بصیرت بھی حد درجہ کامل ہوتی ہے اور اس کی اخلاقی قوت بھی۔ ایک طرف تو وہ احکامِ الٰہی کا منشا سمجھنے اور ان سے اپنے اجتہاد کے ذریعے مزید احکام نکال لینے کی بہترین صلاحیتیں رکھتا ہے، دوسری طرف اسے اپنے نفس پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہوتا ہے، اور اس کی اخلاقی حس، اس کا خوفِ خدا اور اس کا اندیشۂ آخرت اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ گناہ کے محرکات سر اٹھا ہی نہیں پاتے۔

لیکن پھر بھی، واقعہ یہ ہے کہ انبیاء کے معصوم ہونے کی کل وجہ صرف یہی نہیں ہے، بلکہ ایک اور چیز بھی ہے جو انھیں اس "مقام محمود" تک پہنچا دیتی ہے۔ اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی خصوصی نگرانی۔ یہی 'نگرانی' ہے جو انھیں اخلاق اور عمل کی کوتاہیوں سے بھی محفوظ رکھتی ہے اور فکر اور اجتہاد کی غلطیوں سے بھی بچائے رکھتی ہے۔ پس حقیقت نفس الامری یہ نہیں ہے کہ نبی سے کبھی کوئی اجتہادی چوک ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ یہ ہے کہ اس سے یہ چوک ہو سکتی ہے، اور ہوتی ہے۔ لیکن جوں ہی ایسا ہوتا ہے اسے فوراً متنبّہ کر دیا جاتا ہے، اور قبل اس کے کہ نبی کا یہ اجتہاد شریعت کا حکم بن کر اُمّت تک پہنچے، اللہ تعالیٰ اپنے الہام یا وحی کے ذریعے اس کی تصحیح کر دیتا ہے۔ اسی طرح برائی کے رُجحانات جب سر اٹھانا چاہتے ہیں اور نبی کی اپنی قوتِ ایمان و اخلاق انھیں کچل ڈالنے کے لیے آگے بڑھتی ہے تو وہ تنہا نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس کے بعد ممکن نہیں رہ جاتا کہ یہ رجحانات زندہ باقی رہ جائیں۔

غور کیجیے تو صاف محسوس ہوگا کہ نبی کا معصوم ہونا اس مقصد کے لیے بالکل ناگزیر تھا جس کی خاطر رسالت کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے۔ ایک ایسے آدمی پر، جس سے اس بات کا اندیشہ ہو کہ مثلاً وہ جھوٹ بول سکتا ہے، خیانت کر سکتا ہے، نفسانیت کا شکار بن سکتا ہے، منشائے الٰہی کی غلط ترجمانی کر سکتا ہے، لوگ یہ اعتماد کس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی نبوّت کے

دعوے میں سچّا ہے اور کسی جھوٹ سے کام نہیں لے رہا ہے؟ یا خدا کے نام پر ہمیں جو ہدایتیں دے رہا ہے وہ سب کی سب فی الواقع خدا ہی کی طرف سے ہیں اور اس نے ان میں اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہیں کر دی ہے؟ پھر ایسا شخص لوگوں کے لیے عمل کا اچھا نمونہ (اسوۂ حسنہ) بھی نہیں پیش کر سکتا۔ کیوں کہ جس کا خود اپنا دامن داغ دھبوں سے پاک نہ ہو وہ دوسروں کو کیا دکھا کر تلقین کر سکتا ہے کہ تمہیں اپنے دامنوں کو اس طرح پاک رکھنا چاہیے۔ حالاں کہ نبوت کا کام انجام پا ہی نہیں سکتا جب تک کہ نبی اپنے پیرووں کے سامنے کامل 'اسلام' اور احکامِ الٰہی کی کامل اطاعت کا عملی نمونہ بھی پیش نہ کرتا رہے۔

نہ صرف یہ کہ نبی معصوم ہوتا ہے، بلکہ معصوم صرف نبی ہی ہوتا ہے۔ فکر و اجتہاد کی غلطیوں اور سیرت و کردار کی لغزشوں سے پاک ہونا اللہ کے صرف انہی خاص بندوں کی صفت ہے۔ دوسرے لوگ دینی فہم و بصیرت اور نیکی و تقویٰ کی چاہے کتنی ہی بلند چوٹیوں تک پہنچ جائیں، مگر اس آخری چوٹی تک، جس کا نام 'معصومیت' ہے، ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ پھر شاید یہ تو ممکن ہو کہ کسی کا اخلاق یا عمل معصومیت کی حدوں کے قریب پہنچ جائے، لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس کے فکر و اجتہاد کی قوتیں غلطیوں سے بالاتر ہو جائیں، اور وہ جو کچھ سوچے وہ لازماً دین اور منشائے الٰہی کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی ہی ہو۔

اس بحث کا یہ آخری نکتہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ جب تک یہ حقیقت بھی ذہنوں میں گہری اُتری ہوئی نہ ہو کہ غیر نبی معصوم نہیں ہوتا، اس وقت تک نبی کی محبّت اور اطاعت کا حق پوری طرح ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور کچھ بعید نہیں کہ انسان کسی نہ کسی حد تک 'شرک فی النبوۃ' کی گمراہی میں پڑ جائے۔

۶۔ انبیاء کی حیثیت

نبی کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہوتی ہے، اور ایسا سمجھنا شرطِ ایمان ہے۔ دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ بھی کہتا ہے، ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چوں نہ کرے۔ اس کے ارشاد کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے، بہرصورت یقین

یہی رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے، اور سراپا حق ہی ہے ـــــ نبی کی یہ حیثیت خود اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی ہے۔ اس نے فرمایا ہے:-

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔[1]

ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لیے بھیجا کہ اِذنِ خداوندی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

پھر یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہ ہونی چاہیے، بلکہ دل کی رضا کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اپنے ایک نبی، نبیِ آخرالزماںؐ کے حقِ اطاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔[2]

پس نہیں (اے نبی) تمہارا رب گواہ ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے آپس کے نزاعی معاملات میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں اور پھر تم جو کچھ فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں، بلکہ اسے پوری آمادگی کے ساتھ قبول کریں۔

اور ایسا ہونا بہر حال ضروری بھی تھا۔ عقل اس کے سوا ایک نبی کے لیے کسی اور حیثیت کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اور اگر اس بندگی کا طریقہ معلوم کرنے اور ان احکام کے جاننے کا واحد ذریعہ صرف نبی ہے، تو نبی کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل ممکن ہی نہیں رہ جاتی ـــــ اگر راستہ چلے بغیر آپ منزل تک نہیں پہنچ سکتے، اور آلاتِ پرواز استعمال کیے بغیر فضائی سفر نہیں کر سکتے، تو نبی کی ساری باتوں کے ماننے اور اس کے پیچھے

---

[1] سورہ النساء ـــــ ۶۴ [2] سورہ النساء ـــــ ۶۵

چلے بغیر اللہ کی بندگی بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے جو آپ قرآنِ حکیم میں دیکھتے ہیں کہ ہر نبی اپنی نبوّت کا اعلان کرتے ہی لوگوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ "خدا کا تقویٰ اختیار کرو، اور میری اطاعت کرو۔" (فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ[1]) یہ دراصل اس کی طرف سے اسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ تقویٰ اور بندگی کی راہ تمہیں صرف میری اطاعت کے ذریعے مل سکتی ہے، میں ہی بتا سکتا ہوں کہ تمہارے رب کے احکام کیا ہیں اور ان احکام پر عمل کس طرح کیا جانا چاہیے؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہی اطاعت کا حکم دینے پر اکتفا نہیں کر لیا ہے، بلکہ جگہ جگہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ[2] کے ساتھ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ[2] کا حکم بھی دیا ہے۔

پھر یہ حقیقت کہ نبی دین و شریعت کے دائرے میں جو کچھ کہتا ہے وہ سب کا سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، نبی کی اس حیثیت کو اور زیادہ مسلّم اور ضروری بنا دیتی ہے۔ کیوں کہ اس حقیقت کے پیشِ نظر نبی کی اطاعت فی الواقع خدا کی اطاعت بن جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا بھی گیا ہے:۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ[3]

جو اللہ کے رسول کی اطاعت کرتا ہے حقیقت میں وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

اور کوئی شک نہیں کہ جس کی اطاعت فی الواقع خدا کی اطاعت ہو، اس کی حیثیت مکمل اور غیر مشروط مطاع ہونے ہی کی ہوسکتی ہے۔

غرض رسالت پر ایمان لانے کا یہ ایک کھلا ہوا اور بڑا بنیادی تقاضا ہے کہ رسول کی کامل اطاعت کی جائے، ایسی اطاعت جس میں نہ کوئی قید و شرط ہو نہ کوئی بے دلی۔ جو شخص نبی کا مقام اس سے نیچے سمجھتا ہے، وہ صحیح معنوں میں اس پر ایمان ہی نہیں رکھتا، اور نہیں جانتا کہ نبوت کسے کہتے ہیں۔

۷۔ ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے

رسالت پر ایمان اس وقت تک کچھ نہیں جب تک کہ وہ سارے انبیاء کی رسالتوں

---

[1] سورہ شعراء ــــ ۱۲۶ [2] سورہ النساء ــــ ۵۹

[3] سورہ النساء ــــ ۸۰

پیرحاوی نہ ہو۔ قرآن اُن لوگوں کو مومن تسلیم نہیں کرتا جو کچھ انبیاء کو تو اللہ کا رسول مانتے ہوں اور کچھ کو نہ مانتے ہوں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۔[1]

جو لوگ اللہ کا اور اس کے پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم (پیغمبروں میں سے) بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے اور (اس طرح) چاہتے ہیں کہ کفر اور ایمان کے درمیان کی ایک راہ نکال لیں، بلاشبہ وہ پکّے کافر ہیں۔

اِن الفاظ کو غور سے دیکھیے، یہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ کسی ایک رسول کا بھی انکار آخری درجے کا کفر ہے، اور اس ایک انکار کی موجودگی میں باقی سارے انبیاء کا اقرار بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ بظاہر یہ ایک سخت فیصلہ معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت کا تقاضا یہی تھا کہ فیصلہ اس کے سوا کچھ اور نہ ہو، اور ایک نبی کے انکار کو بھی اس سے کمتر درجے کا جرم نہ قرار دیا جائے۔ جب یہ معلوم ہے کہ خواہ کوئی بھی رسول ہو وہ اللہ ہی کی طرف سے آتا ہے اور اسی کے احکام لوگوں کو سُناتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کائنات کے حقیقی فرماں روا ہی کی طرف سے مقرر کیا ہوا حاکم مجاز ہوتا ہے، تو اس کا انکار دراصل اس کا انکار نہیں ہے بلکہ فرماں روائے کائنات کے حق فرماں روائی کا انکار ہے، اس کے خلاف بغاوت کا اعلان ہے اور اس کا انکار و اعلانِ بغاوت کی موجودگی میں دوسرے انبیاء کا اقرار بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی حکومت کے مقرر کیے ہوئے بہت سے افسروں کو تو اس کا نمائندہ اور حاکم مجاز تسلیم کر لیا جائے، مگر پھر اسی حکومت کے کسی ایک افسر کو اس کا نمائندہ اور حاکم مجاز ماننے

---

[1] سورہ نساء - ۱۵۰ - ۱۵۱

سے انکار کر دیا جائے۔ یہ حکومت کی اطاعت تو نہ ہوئی اپنی رائے اور خواہش کی اطاعت ہوئی۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ جن افسروں کو حکومت کا نمائندہ اور حاکم مجاز تسلیم کیا گیا ہے ان کا یہ تسلیم کیا جانا بھی دراصل حکومت کے حقِ اطاعت کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اپنے جی کی خواہش کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اس تسلیم و اقرار کی فی الواقع کوئی قدر و قیمت نہیں۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو، جو کسی ایک رسول کا انکار کرتے ہوں سارے رسولوں کا منکر قرار دیا ہے۔ مثلاً قومِ نوحؑ کے بارے میں اس نے فرمایا ہے کہ 'جب انھوں نے ہمارے رسولوں کو جھٹلایا تو ہم نے بھی انھیں غرق کر دیا، (وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ[1]) حالاں کہ از روئے واقعہ انھوں نے صرف ایک رسول، حضرت نوحؑ کی تکذیب کی تھی، باقی رسولوں کا تو ان کے سامنے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔

ہمیں ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ "جو رسول بھی آتا ہے اسی لیے آتا ہے کہ اذنِ خداوندی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے"، نیز یہ کہ "جو اللہ کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی اطاعت کرتا ہے"، جب حقیقت یہ ہے تو کیا اس کا کھلا ہوا مطلب یہ نہیں کہ کسی رسول کو تسلیم نہ کرنا فی الواقع "اذنِ خداوندی" کو ٹھکرانا اور "اللہ کی اطاعت" کا انکار کرنا ہے؟ ایسی حالت میں ایک رسول کا انکار بھی کفر و بغاوت کا آخری درجہ کیوں نہ ہوگا؟ اور اللہ کے ایک ایک رسول کو برحق ماننے بغیر ایمان کی سند کا مل جانا اصول اور انصاف کی بات کیسے ہوگی؟

رسالتِ محمدیؐ

"رسالت" سے متعلق جو تفصیلات اُوپر کی سطروں میں آچکی ہیں۔ ان کی نوعیت اس عقیدے کی صرف عام اور اصولی وضاحت کی ہے، نہ کہ مکمل وضاحت کی۔ اس لیے اسلامی عقیدۂ رسالت کا یہی کل مفہوم نہیں ہے، اور نہ صرف انہی باتوں کا مان لینا اسلامی عقیدۂ رسالت کا مان لینا ہے۔ اسلامی عقیدۂ رسالت کا مفہوم جس بات سے پُورا ہوتا اور اپنی مکمل واضح

---

[1] سورہ الفرقان - ۳۷

شکل اختیار کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ آخری رسول، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی، اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کی پیروی کو ضروری تسلیم کیا جائے یعنی اُصولی حد تک تو آپ کو بھی اسی طرح اللہ کا رسول مانا جائے جس طرح کہ دوسرے رسولوں کو مانا جاتا ہے۔ اور دوسرے رسُولوں کو بھی اسی طرح اللہ کے رسول مانا جائے جس طرح کہ آپ کو مانا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک عملی پیروی کا تعلق ہے اس کے لیے انتخاب آپ ہی کا ہونا چاہیے، اور اس یقین کے ساتھ ہونا چاہیے کہ اب آپ ہی کی پیروی ضروری ہے، دوسرے تمام رسول، اللہ کے رسول تھے، اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ جب کوئی شخص عقیدۂ رسالت کے مذکورہ بالا عام اور اصولی حقائق کے ساتھ اس خاص حقیقت کو بھی تسلیم کر لیتا ہے، تب جا کر رسالت کے اسلامی عقیدے پر ایمان لانے والا قرار پاتا ہے[1]

---

[1] آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس امتیازی حیثیت پر مفصل گفتگو ایک مستقل عنوان "اسلام اور دیگر مذاہب" کے تحت آگے آرہی ہے۔

بنیادی اعمال

(ارکانِ اسلام)

عقائد کے بعد، فطری طور پر، اعمال کی بحث آتی ہے۔ اس لیے اسلام کے اعتقادی حصّے کو جان لینے کے بعد اب ہمارا ذہن آپ سے آپ اس کے عملی حصّے کی طرف مُڑے گا اور پوچھے گا کہ ان عقائد کے بعد وہ اعمال کیا ہیں جن کے کرنے کا اسلام حکم دیتا ہے؟ بظاہر یہ ایک بڑا وسیع عنوان ہے اور اس کے لیے جو بحث درکار ہے اس کے پورے پھیلاؤ کے سامنے ہزار صفحے بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن جہاں تک اسلام کے عمومی تعارف کا تعلق ہے اس کے لیے اتنی لمبی تفصیل میں جانا کچھ ضروری نہیں، بلکہ اتنی بات کافی ہے کہ اہم اور نمایاں احکامِ شریعت کا جائزہ لے لیا جائے۔ اسلام کے یہ اہم اور نمایاں احکام اصولی طور پر دو طرح کے ہیں: ایک[1] وہ جن کی اہمیت زیادہ بنیادی قسم کی ہے، اور جن کا مقام اسلامی تعلیمات کے اندر ایمانیات کے ٹھیک بعد ہی آتا ہے۔ دوسرے[2] وہ جن کی حیثیت اس پایے کی نہیں ہے، اور جن کا مقام بعد میں آتا ہے۔ قدرتی طور پر پہلے انہی احکام کا جائزہ لیا جانا چاہیے جن کی اہمیت زیادہ اور بنیادی قسم کی ہے۔

ایسے اعمال کون سے ہو سکتے ہیں؟ اس بارے میں ہمیں قیاس اور اندازے سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیزوں کی خود نشان دہی فرما دی ہے۔ آپؐ کا مشہور ارشاد ہے:-

بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ اَلَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ

مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ[1]

اسلام کی تعمیر پانچ چیزوں پر ہوئی ہے، اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا، رمضان کے روزے رکھنا۔

ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے "بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ" کے بعد "دَعَائِمَ" کا لفظ بھی فرمایا تھا۔ اس شکل میں ارشاد نبوی کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "اسلام کی تعمیر پانچ ستونوں پر ہوئی ہے۔" عمارت کے ستون نہ تو کل عمارت ہوتے ہیں، نہ عمارت سے الگ کوئی چیز ہوتے ہیں، بلکہ دوسری چیزوں کی طرح وہ بھی پوری عمارت کے حصے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن عمارت کے دوسرے حصوں کے اور ان ستونوں کے درمیان ایک بڑا فرق ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے حصوں کے مقابلے میں انھیں ایک خاص امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ بھی اگرچہ بجائے خود عمارت کے حصے ہی ہوتے ہیں مگر ایسے حصے ہوتے ہیں جن پر باقی حصوں کا وجود اور ان کی بقا موقوف ہوتی ہے۔ اس لیے توحید و رسالت کی شہادت، نماز، زکوٰۃ، حج اور روزے کے "اسلام کے ستون" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ:

(۱) جس طرح کسی عمارت کے ستونوں کو بنا لینے سے پہلے آپ کوئی مزید تعمیر نہیں کر سکتے ٹھیک اسی طرح ان اعمال کو انجام دیے بغیر دین کی دوسری تعلیمات پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کوئی عمل کیا جائے گا تو وہ دراصل عمل کا صرف نام ہوگا، حقیقت میں عمل نہ ہوگا۔

(۲) اگر یہ اعمال ٹھیک طور سے انجام پاتے ہیں تو باقی اعمال کا انجام پا جانا بالکل متوقع ہے، بلکہ قریب قریب لازمی اور ضروری رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسری حدیث میں صرف انہی چیزوں کو "اسلام" فرمایا گیا ہے۔

اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا

---

[1] بخاری، جلد اول، کتاب الایمان

وَرَسُوْلُ اللّٰہِ وَتُقِیْمَ الصَّلٰوۃَ وَتُؤْتِیَ الزَّکٰوۃَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً۔[1]

اسلام یہ ہے کہ تم شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو، اور کعبہ تک کے سفر کی استطاعت رکھنے کی شکل میں اس کا حج کرو۔

حالاں کہ پچھلی حدیث میں انھیں "اسلام"، نہیں بلکہ "اسلام کے ستون" کہا گیا تھا۔ اس لیے اب انھیں 'اسلام' فرمائے جانے کا کھلا ہوا مطلب یہ ہوگا کہ یہ پانچوں اعمال دین کے ایسے بنیادی اعمال ہیں کہ ان کا وجود میں آجانا دراصل پورے اسلام کے وجود میں آسکنے کی ضمانت ہے۔ اس طرح وہ اسلام کا ایک جزو ہوتے ہوئے بھی گویا پورا اسلام ہیں۔

یہ بات کہ یہ اعمال اسلام کے ستون اور مجازاً کل اسلام کیوں اور کس طرح ہیں، ان تفصیلات پر غور کرنے سے خود واضح ہوجائے گی جو آگے آرہی ہیں۔

ان اعمال کا تعین ہوجانے کے بعد، جن کو سارے اعمالِ شریعت میں اولیت اور سب سے زیادہ بنیادی اہمیت حاصل ہے، ان کے متعلق کتاب وسنت کے تفصیلی بیانات سنیے :-

۱۔ توحید ورسالت کا اقرار واعلان

جہاں تک توحید ورسالتِ محمدی کی گواہی اور اقرار کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا عمل ہے، جو صرف زبان سے انجام پاتا ہے۔ یہ گواہی اگرچہ بظاہر صرف توحید اور رسالتِ محمدیؐ کی گواہی ہے، مگر فی الواقع یہ پورے سلسلۂ رسالت کی، ساری آسمانی کتابوں کی، فرشتوں کی، آخرت کی، اور قضا وقدر کی، یعنی ساری ایمانیات کی گواہی ہے۔ کیوں کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مسلم، جلد اوّل، کتاب الایمان

کے نبی ہونے کی گواہی دے گا، وہ آپ سے آپ اُن تمام اَن دیکھی حقیقتوں کا بھی برحق ماننے والا یقین کیا جائے گا جن کی آں حضرتؐ نے خبر دی ہے۔

توحیدِ باری اور رسالتِ محمدیؐ پر دل سے یقین رکھنا ایک بات ہے، اور اس یقین کے مطابق ان عقائد کو زبان سے بھی برحق کہنا دُوسری بات ہے۔ یہ حدیثیں بتاتی ہیں، اور علماء نے اس بات کی صراحت کی ہے، کہ مومن اور مسلم قرار پانے کے لیے صرف دل کی تصدیق کافی نہیں ہے، بلکہ زبان کی تصدیق بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر کسی کا اسلام معتبر نہ ہوگا۔ زبان سے اس اقرار و اظہار کی اہمیت اتنی اس لیے ہے کہ اسلام، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، کوئی ایسا دین نہیں ہے جو کانوں میں باتیں کرتا ہو، اور جس کے تقاضے گوشوں میں پورے ہو جاتے ہوں۔ بلکہ ایسا دین ہے جو انسان کو بلندیوں سے خطاب کرتا ہے، اور اسے زندگی کے ہنگاموں کے ٹھیک بیچ میں لا کھڑا کرتا ہے، حق و باطل کی باہم کش مکش میں ڈالے رکھتا ہے اور کفر و فسق کے خلاف ایک کبھی ختم نہ ہونے والے محاذ پر اسے مقرر کر دیتا ہے۔ جب حقیقتِ نفس الامری یہ تھی تو بالکل ضروری تھا کہ وہ اپنے ماننے والوں سے اپنی حیثیت کا بآوازِ بلند اعلان کر دینے کا مطالبہ کرے، اور انھیں پہلے دن پوری دنیا کو یہ صاف صاف بتا دینے کا حکم دے کہ ہم اس جماعت کے رکن اور اس محاذ کے سپاہی ہیں، اور وہی کچھ کرنے کا عزم لے کر زندگی کے میدان میں اُتر رہے ہیں جس کا ہمارے یہ عقیدے تقاضا کرتے ہیں۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلامی عقائد کا برملا اقرار و اعلان بھی بجائے خود بڑی زبردست اہمیت رکھتا ہے۔

معاشرتی اور سیاسی پہلو سے دیکھیے تو اس اقرار و اعلان کی ایک اور بھی بڑی اہمیت نظر آئے گی۔ جو شخص اپنی زبان سے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتا ہے، وہ چاہے اس کے عملی تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو، حتّٰی کہ دل میں اس پر یقین بھی نہ رکھتا ہو، پھر بھی مسلم معاشرے کا ایک فرد سمجھا جائے گا اور سیاسی و معاشرتی طور پر اسے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ایک مسلمان کو حاصل ہوا کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص زبان سے یہ اقرار و اعلان نہیں کرتا تو چاہے دل میں اس پر کتنا ہی گہرا یقین کیوں نہ رکھتا ہو مسلمان نہ مانا جائے گا۔

بلکہ اس کا شمار غیر مسلموں میں ہوگا۔ سیاسی اور معاشرتی طور پر اس کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جائے گا جو ایک غیر مسلم سے کیا جانا چاہیے، نہ کہ وہ رویہ جو ایک مسلمان سے اختیار کیا جاتا ہے۔

جس شخص نے اسلامی عقائد کو دل سے سچا مان لیا، اس نے اسلام کی بنیاد جما لی۔ اور پھر جب اس نے اپنے دل کی یہ بات زبان سے بھی کہہ دی، اور دنیا کے سامنے اس کے حق ہونے کی شہادت دے دی تو اب اس نے اپنے دین کا پہلا ستون تعمیر کر لیا۔

۲۔ نماز

دین میں نماز کی اہمیت

اسلام کا دوسرا ستون نماز ہے۔ یہ عملی ارکان میں سرفہرست ہے، اور دین میں اس کا جو مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے۔ مومن کا ہر کام اللہ کی بندگی کا کام ہوتا ہے، مگر نماز جیسی بندگی کی شان کسی کام میں نہیں ہوتی۔ اس کا باطن ہی نہیں، ظاہر بھی سراپا بندگی ہوتا ہے۔ نماز کی ہیئتوں کو دیکھیے اور اس کی دعاؤں، تسبیحوں اور قراءتوں پر غور کیجیے۔ عاجزی و سرفگندی کے اظہار کی کوئی ممکن شکل نہیں جو نماز کے ظاہر یا اس کے باطن میں موجود نہ ہو۔ یہ سینے پر ہاتھ باندھے اور آنکھیں جھکائے ادب سے کھڑا ہونا، یہ کمر کا خم کرنا، یہ زمین پر اپنی پیشانی کا ڈال دینا، یہ زبان پر اللہ کی حمد کے، تسبیح کے، تکبیر کے، توحید کے کلمات کا مسلسل جاری رہنا، اور یہ دل کا اللہ کی خشیت اور عظمت اور محبت سے معمور رہنا، کیا کچھ نہیں ہے۔ آخر بندگی کی کون سی ادا ہے جس سے یہ نماز خالی ہو۔ قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجیے تو نماز کی اہمیتوں اور فضیلتوں سے ان کے صفحات بھرے نظر آئیں گے۔ ان میں کی چند نمایاں چیزیں یہ ہیں:-

نماز ہی ایمان کا سب سے پہلا عملی مظہر ہے۔ ابھی اوپر والی حدیثوں میں آپ نے دیکھا کہ شہادتِ ایمانی کے بعد سب سے پہلے جس چیز کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ یہی نماز ہے۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر انسان کے اندر ایمان موجود ہو اور اللہ کی معبودیت اور

اپنی عبدیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ بات صرف انہی دو حدیثوں میں نہیں پائی جاتی، بلکہ قریب قریب ہر اس حدیث میں دکھائی دیتی ہے جس میں دین کے بنیادی اعمال گنائے گئے ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید کو دیکھیے تو وہ بھی جگہ جگہ ایمان کے بعد سب سے پہلے نماز ہی کا نام لیتا نظر آئے گا۔ مثلاً:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ[1] الخ

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال کیے اور نماز قائم کی۔ الخ

وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتَابِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ[2] الخ

اور وہ لوگ جنہوں نے کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور نماز قائم کی۔ الخ

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی۔[3]

تو وہ نہ ایمان لایا اور نہ اس نے نماز پڑھی۔

اس اندازِ بیان سے وہ دراصل یہی بتانا چاہتا ہے کہ دل میں اگر ایمان کا بیج پڑ چکا ہو تو اس سے عمل کا جو پہلا پودا نکلے گا، وہ نماز کا پودا ہوگا۔

نہ صرف یہ کہ نماز ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہوتی ہے، بلکہ وہ ایمان کا لازمی مظہر بھی ہوتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ دل میں ایمان تو ہو، مگر سر میں رکوع اور سجدے کی تڑپ نہ ہو۔ ایمان دل کی ایک کیفیت کا نام ہے، یہی کیفیت ہے جو خارج میں نماز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے جہاں ایمان ہو وہاں نماز ضرور ہوگی، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ جہاں سورج نکلا ہوا ہوتا ہے وہاں روشنی اور گرمی ضرور ہوتی ہے۔ یہ بات کہ نماز ایمان کا لازمہ ہے، آں حضرتؐ کے صاف و صریح ارشادات کا فیصلہ ہے، کوئی قیاسی بات نہیں ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:۔

مَنْ تَرَکَ صَلٰوۃً مَکْتُوْبَۃً مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ ذِمَّۃُ اللّٰہِ۔[4]

جس نے جان بوجھ کر کوئی فرض نماز چھوڑ دی اس سے اللہ بری ہے۔

---

[1] سورہ البقرہ۔ ۲۷۷ [2] سورہ الاعراف۔ ۱۷۰ [3] سورہ القیامہ۔ ۳۱ [4] مسند احمد، جلد پنجم ص ۲۳۸

بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الشِّرْکِ وَالْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ۔[1]
بے شک انسان اور شرک وکفر کے درمیان علیٰحدگی پیدا کرنے والی چیز نماز ہے۔

سفر جہاد کے سلسلے میں آپؐ کا اصول اور آپؐ کی ہدایت یہ تھی کہ جس بستی سے اذان کی آواز آئے اُسے مسلم آبادی مانا جائے اور اس پر حملہ نہ کیا جائے، اور جس بستی سے اذان کی آواز نہ آئے اُسے کافر بستی سمجھا جائے اور اس پر حملہ کیا جائے۔ یہ ہدایت بھی اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ نماز ہی وہ چیز ہے جو عام حالات میں ایمان کی فیصلہ کُن علامت بنتی ہے اور اسی سے بادیٔ نظر کسی کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اہلِ دوزخ سے فرشتے جب یہ پوچھیں گے کہ "مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ"[2] (تمہیں جہنّم میں کس چیز نے ڈالا ہے؟) تو اُن کا جواب اِن لفظوں سے شروع ہوگا "لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ"[3] (ہم نمازیوں میں سے نہ تھے) اس سے معلوم ہوا کہ نمازی ہونا اور مومن وموحّد ہونا گویا ایک سی بات ہے۔ کیوں کہ یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ جنّتی اور دوزخی ہونے کا مدار ایمان اور کفر پر ہے۔ اب اگر دوزخی اپنے انجام بد سے دوچار ہوجانے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ "ہم نماز نہ پڑھنے کے باعث جہنّم میں ڈالے گئے ہیں، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قیامت کے دن ایمان اور نماز، لازم وملزوم کی حیثیت سے نمایاں ہوں گے جبھی تو وہ جواب میں "ہم مومن نہ تھے" کے بجائے "ہم نمازی نہ تھے" کے لفظوں سے بات کی ابتدا کریں گے۔

یہی سارے نصوص ہیں جن کی بنا پر بعض علمائے اسلام نے تو اُس شخص کو گردن زدنی تک قرار دے دیا ہے، جو نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دے اور نہ پڑھنے پر مصر رہے،

---

[1] مسلم، جلد اول، باب اطلاق اسم الکفر علیٰ من ترک الصلوٰۃ۔
[2] سورہ المدثر۔ ۴۲ [3] سورہ المدثر۔ ۴۳

جس طرح کہ دین سے پھر جانے والا گردن زدنی ہوا کرتا ہے۔

نماز[۳] کی ایک اور بڑی اہمیت کتاب وسنّت سے یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ پوری شریعت کے جذبۂ اتباع کا سرچشمہ بھی ہے اور اس کی محافظ بھی، وہ اگر ادا ہوگی تو شریعت کے باقی احکام بھی ادا ہوسکیں گے، اور اگر اس کا حق ادا نہ ہوا تو باقی شریعت بھی غفلت کی نذر ہوجانے سے نہ بچ سکے گی۔ یوں سمجھیے کہ شریعت کے مجموعۂ احکام کے اندر نماز کی حیثیت وہی ہے جو انسانی جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ دل میں اگر حرکت اور گرمی اور زندگی موجود ہو تو جسم کے دوسرے تمام حصّوں تک بھی خون کی روانی قائم رہتی ہے اور وہ زندہ رہتے ہیں۔ جس وقت یہ دل اپنی حرکت اور زندگی کھو دیتا ہے اس وقت دوسرے اعضاء بھی سرد اور بے جان ہوکر رہ جاتے ہیں۔ نماز کی اس حیثیت کے بارے میں قرآن مجید نے کئی جگہ اشارے کیے ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتیں فرمائی ہیں۔ چناں چہ اوپر کی حدیث میں جہاں آپؐ کو یہ فرماتے سُنا جا چکا ہے کہ "اسلام کی تعمیر پانچ ستونوں پر ہوئی ہے"، وہیں آپؐ کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ "دین کا ستون صرف نماز ہے":۔

رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعَمُوْدُهُ الصَّلٰوةُ۔[۱]

دین کی اصل، اسلام (یعنی توحید و رسالت اور آخرت کا اقرار) ہے
اور اس کا ستون نماز ہے۔

یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نماز ہی کی طرح دین کے ستون اگرچہ زکوٰۃ اور حج اور روزہ بھی ہیں اور ان کے بغیر دین کی عمارت بن نہیں سکتی، لیکن اس کے باوجود نماز کو ایک ایسی مخصوص اور امتیازی اہمیت بھی حاصل ہے جس کی بنا پر وہ اکیلی بھی دین کا ستون کہی جاسکتی ہے۔ اگر وہ ہے تو گویا پورا دین موجود ہے، وہ اگر نہیں ہے تو پُورا دین ناموجود ہے۔

---

[۱] ترمذی، جلد دوم، باب الایمان

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عمّالِ حکومت کو ایک تحریری ہدایت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

اِنَّ اَھَمَّ اَمْرِکُمْ عِنْدِیْ الصَّلٰوۃُ مَنْ حَفِظَھَا وَ حَافَظَ عَلَیْھَا حَفِظَ دِیْنَہٗ وَمَنْ ضَیَّعَھَا فَھُوَ لِمَا سِوَاھَا اَضْیَعُ۔[1]

بلاشبہ میرے نزدیک تمہارے مسائل میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ نماز کا ہے ۔ جس نے اپنی نماز کی حفاظت کی اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا ، اس نے اپنے پورے دین کو محفوظ کر لیا ، اور جس نے اپنی نماز کو ضائع کر دیا وہ باقی چیزوں کو اور زیادہ ضائع کرکے رہے گا ۔

نماز کی یہ اہمیت کیوں ہے ؟

کوئی شک نہیں کہ کتاب وسنّت کی جو شہادتیں ابھی ہمارے سامنے آئی ہیں ، اُن سے نماز کا مقام یہی ثابت ہوتا ہے ۔ اس سلسلے میں ذہن فطری طور پر یہ سوال کرسکتا ہے کہ آخر نماز کا یہ مقام کیوں ہے ؟ کیا بات ہے کہ وہ شریعت کا ایک جزو ہوتے ہوئے بھی گویا پوری شریعت ہے ، اور ایک عمل ہوتے ہوئے بھی گویا اصل ایمان ہے ؟ اس سوال کا جواب ایک اور سوال کے جواب سے مل سکے گا ، اور وہ یہ کہ خود یہ نماز کیا چیز ہے ، اور اس کی حقیقت کیا ہے ؟ قرآن مجید بتاتا ہے کہ نماز اللہ کی یاد کا نام ہے (اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ[2] میری یاد کے لیے نماز قائم کرو ۔) اور یہ کہ نماز بندے کو اپنے رب سے قریب کر دیتی ہے (وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ[3] ۔ سجدہ کر اور قریب ہو جا ۔) اتنا قریب کر دیتی ہے کہ اتنی قربت کسی بھی دوسرے عمل کے ذریعے ، اور کسی بھی دوسری حالت میں اسے حاصل نہیں ہوسکتی (اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّہٖ وَھُوَ سَاجِدٌ[4])

---

[1] موطا امام مالک ، باب وقوت الصلوٰۃ [2] سورہ طٰہٰ ۔ ۱۴

[3] سورہ العلق ۔ ۱۹ [4] مسلم ، باب مایقال فی الرکوع والسجود ۔

حتیٰ کہ وہ اس وقت ہر ماسوا سے کٹ کر اپنے آقا و مولا کی حضوری میں جا پہنچا ہوتا ہے اور اس سے ہم کلامی میں مشغول ہوتا ہے (اِنَّ اَحَدَکُمْ قَامَ فِی صَلوٰتِہٖ فَاِنَّہٗ یُنَاجِیْ رَبَّہٗ)[1] اللہ کی یاد، اس کا قرب، اس کی حضوری اور اس کی ہم کلامی — کیا دین کی روح اور بندگی کی معراج ان چیزوں کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اور ہرگز نہیں۔
خدا پرستانہ عمل، ایمان ہی کا ثمرہ ہوتا ہے اور ایمان کی جڑوں کو نمی اور تازگی صرف اللہ کی یاد ہی سے ملتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے وِرد سے اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہو (جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ... اَکْثِرُوْا مِنْ قَوْلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ)[2] جس درخت کی جڑوں کو نمی اور تازگی نہ پہنچتی ہو وہ سوکھنے لگتا ہے، اور پھولنا پھلنا بند کر دیتا ہے۔ اس لیے جس شخص کا دل اللہ کی یاد سے غافل ہو، اس کا ایمان لازماً مرجھا کر رہ جائے گا۔ اور جس کا ایمان مرجھا گیا ہو اس کا عمل نیکی اور خدا ترسی کا عمل نہیں ہو سکتا۔ ایسا عمل اگر ہو سکتا ہے تو صرف ایسے ہی شخص کا ہو سکتا ہے جس کے اندر ایمان کی تازگی موجود ہو، اور ایمان اسی شخص کا تازہ رہ سکتا ہے جس کے دل میں اللہ کی یاد گھر کیے ہو۔ نماز نہ صرف یہ کہ اللہ کی یاد ہے، بلکہ اس کی یاد کا سب سے بہتر، سب سے کامل، اور سب سے زیادہ موثر طریقہ ہے۔ اس لیے نیکی اور خدا پرستی کے وجود کو نماز کے وجود پر منحصر ہونا ہی چاہیے۔

اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔ بادشاہ کا جو درباری اس کے سامنے ہدایت کے باوجود حاضری نہیں دیتا اور اگر حاضری دیتا بھی ہے تو دلی احترام اور عقیدت کے ساتھ نہیں دیتا، اس سے یہ توقع رکھنا فضول ہوگا کہ وہ شاہی احکام بجالائے گا، اور دل و جان سے اس کی وفاداری کرے گا۔ یہ توقع اگر رکھی جا سکتی ہے تو اسی شخص سے رکھی جا سکتی ہے جو شاہی دربار میں حاضر ہونے، سلامیاں دینے اور آداب بجالانے سے بے پروا نہ رہتا ہو۔ ظاہر بات ہے جو شخص آپ کے سامنے آکر آپ سے محبت اور وفاداری کا اظہار بھی

---

[1] بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ۔ [2] مسند احمد، جلد دوم ص ۲۵۹

نہیں کرپاتا، وہ آپ کے احکام اور مرضیات کی خاطر اپنا خون تو کیا، پسینہ بھی نہ بہا سکے گا۔ نماز کھلے طور پر اللہ کے دربار کی حاضری، سلامی اور عہدِ وفاداری ہے۔ جو شخص اس حاضری اور سلامی کے لیے بھی دل سے آمادہ نہ رہتا ہو، وہ زندگی کے پھیلے ہوئے میدان میں، قدم قدم پر اُس کے مشقّت طلب حکموں کی کیا پیروی کرسکے گا؟

نماز کے کچھ ضمنی مقاصد

نماز کی اصل اہمیت اور اس کی حقیقی عظمت تو وہی ہے جو اوپر کی بحث میں معلوم ہوچکی۔ لیکن وہ اپنے دامنوں میں بہت سی ضمنی برکتیں بھی رکھتی ہے۔ یہ برکتیں نماز کی اصل غایت کی نسبت سے تو یقیناً ضمنی ہی ہیں، مگر اس کے باوجود وہ بجائے خود بڑی اہم اور بیش قیمت ہیں، اور انسان کو صحیح اسلامی ذہن اور مطلوبہ اسلامی زندگی عطا کرنے میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ اس لیے اُن کا جان لینا بھی ضروری ہے۔ نماز کی ان "ضمنی برکتوں" کو اس کے "ضمنی مقاصد" کہنا زیادہ صحیح ہوگا ان میں سے چند ایک یہ ہیں:۔

اِسلام اپنے پیروؤں کو ہدایت کرتا ہے کہ ان سب کے اندر ایک ہی مشن کے علَم بردار ہونے کا گہرا شعور پایا جانا چاہیے، اور اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک منظّم اجتماعی زندگی بسر کریں۔ ان کا ایک امیر ہو، جو شریعت کے احکام پر خود چلے اور پورے معاشرے کو چلائے، شرعی نظام قائم رکھے۔ لوگ ایک منظّم اور تربیت یافتہ فوج کی طرح ہوں، اور یہ ان کا سپہ سالار ہو۔ وہ اُنھیں جب حرکت میں آنے کو کہے تو حرکت میں آجائیں اور ——— جب ٹھیرنے کو کہے تو ٹھیر جائیں۔ نماز نظم اور اطاعت کا ٹھیک ایسا ہی پختہ مزاج پیدا کرتی ہے۔ اذان ہوتے ہی لوگ اپنے گھروں، دوکانوں اور کھیتوں سے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ سب کا رُخ مسجد کی طرف ہوجاتا ہے۔ یہاں آکر سب کے سب ایک امام کے پیچھے تیر جیسی سیدھی صفیں باندھ لیتے ہیں۔ امام کے ساتھ ساتھ، اور اس کے اشاروں پر، سب کے سب ایک ساتھ اُٹھتے، ایک ساتھ بیٹھتے اور ایک ساتھ جھکتے ہیں، مجال نہیں کہ کوئی شخص امام کی اس پیروی سے ذہناً یا عملاً،

ذرا بھی بے نیازی برتے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کا حکم، دین کا فریضہ اور آخرت کا کام سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ کیا نظم اور ڈسپلن اور اطاعتِ امر کی اس سے بہتر ذہنی اور عملی تربیت اور کسی طرح ہو سکتی ہے جو نماز سے انجام پاتی ہے۔؟

اسی طرح اسلام اپنے پیرووں میں غایت درجہ کی محبت اور بھائی چارگی دیکھنا چاہتا ہے۔ سچا مومن ہونے کی پہچان یہ بتاتا ہے کہ ہر شخص اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے۔ جو خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ نماز محبت اور بھائی چارگی کے اس احساس کو پوری قوت سے پیدا کرتی اور اسے برابر غذا دیتی رہتی ہے۔ محلّے اور بستی بھر کے مسلمان جب اپنے رب کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں تو ان کے صرف قدم اور شانے ہی باہم ملے ہوئے نہیں ہوتے، بلکہ ایک طرح سے ان کے دل بھی آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے پروردگار سے صرف اپنی ہی ذات کے لیے دُعائیں اور التجائیں نہیں کرتے بلکہ سب کے لیے کرتے ہیں، سب کے لیے ہدایت مانگتے ہیں، سب کے لیے مغفرت چاہتے ہیں، سب کے لیے مدد طلب کرتے ہیں۔ کیا دُوسرے بندگانِ خدا سے اخوت اور محبت کا حق ادا کرنے کی کوئی اس سے بھی برتر شکل ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے مالک سے نظرِ کرم کی عاجزانہ درخواستیں کرتے وقت بھی انھیں نہ بھولے اور ان خاص گھڑیوں میں بھی برابر پکارتا رہے کہ "خدایا! ہم سب کو راہِ راست دکھا" (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ[1])۔ "ہم سب پر اور اللہ کے سارے نیک بندوں پر سلامتی ہو۔" (اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ[2])۔ "ہم سب کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی۔" (اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً[3])۔ دنیا نے آپس کی انتہائی محبت کا جو اُونچے سے اُونچا معیار سوچا ہوگا، یقین رکھنا چاہیے کہ وہ اس معیار سے بہرحال نیچا ہی ہوگا۔

اسلام تمام انسانوں کو ایک ہی آقا کے غلام اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد

---

[1] سورہ الفاتحہ۔ ۵ [2] یہ ہر نماز میں پڑھے جانے والے تشہد کا ایک فقرہ ہے۔
[3] سورہ البقرہ۔ ۲۰۱

قرار دیتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ تم سب اپنے کو ایسا ہی سمجھو (کُونُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا)[1] کوئی کسی کو نیچا اور کم تر نہ خیال کرے۔ رنگ، وطن، نسل اور نسب یا دولت کی بنا پر کوئی اعلیٰ اور کوئی ادنیٰ نہیں ہوا کرتا۔ برتری اگر کسی کو مل سکتی ہے تو صرف نیکی اور خدا ترسی ہی کی بنا پر مل سکتی ہے (اِلَّا بِدِیْنٍ وَّ تَقْوٰی)[2]۔ نماز اس حقیقت کے شعور کو اپنے ظاہر سے بھی بیدار کرتی رہتی ہے اور اپنے باطن سے بھی۔ ظاہر سے اس طرح کہ نماز میں نہ کوئی "بندہ" رہ جاتا ہے اور نہ کوئی "بندہ نواز"، فاروقِ اعظم اور ایک حبشی غلام، دونوں ساتھ کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک ہی خاکِ نیاز ہوتی ہے جس پر سب کی پیشانیاں پڑی ہوتی ہیں۔ باطن سے اس طرح کہ نماز کے اندر سب کے دلوں میں بلندی و پستی کا ایک ہی تصوّر چھایا رہتا ہے، اور وہ یہ کہ ساری عظمتوں کا مالک صرف اللہ ہے، اور کوئی نہیں جسے حقیقی عظمت کا کوئی شمّہ بھی حاصل ہو، ہم میں سے ہر ایک کی حیثیت اگر کچھ ہے تو صرف عبد اور غلام ہونے کی ہے۔ جس شخص کو اس کی نماز اس کی حیثیت کا یہ احساس دلاتی رہے گی وہ رنگ و نسل یا مال و دولت کے سراب سے کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا، نہ دُوسروں کے مقابلے میں اپنے کو اونچا سمجھ سکتا ہے۔

مطلوبہ نماز

جس نماز کے یہ حقیقی اور یہ ضمنی مقاصد و فوائد ہیں، اور جس نماز کا اسلام نے حکم دیا ہے، اُسے بھی اچھی طرح جان پہچان لینا چاہیے۔ کیوں کہ ہر نماز "نماز" نہیں ہوتی، جس طرح کہ ہر انسان "انسان" نہیں ہوتا۔ جس نماز کا اللہ نے حکم دیا ہے اور جو نماز دین کا ستون ہی نہیں بلکہ "شاہ ستون" ہے، وہ وجود میں آتی ہی نہیں جب تک کہ اسے ٹھیک طور سے ادا نہ کیا جائے۔ "ٹھیک طور سے ادا کرنے" کے لیے کتاب و سنّت نے ایک خاص لفظ استعمال فرمایا ہے، اور وہ ہے "اقامت" یعنی نماز قائم کرنے،

---

[1] مسلم، جلد دوم، باب تحریم التحاسد
[2] احمد، بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ، باب المفاخرۃ

کا لفظ، جیساکہ مذکورہ بالا حدیثوں میں آپ ابھی دیکھ آئے ہیں، اور جیساکہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس لفظ کو بولا جاتے سُنا جاسکتا ہے۔ نماز قائم کرنے کا مفہوم دو لفظوں میں یہ ہے کہ اسے تمام ظاہری آداب اور باطنی صفات کے ساتھ ادا کیا جائے۔ ان آداب اور صفات کی پوری تفصیل قرآن و سنّت اور فقہ کی کتابوں میں ہر تلاش کرنے والے کو بہ آسانی مل جائے گی۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھیے کہ وہی نماز "قائم کی ہوئی نماز" ہوتی ہے جو ٹھیک وقت پر اور جماعت کے ساتھ پڑھی گئی ہو، ٹھیر ٹھیر کر اور باقاعدگی کے ساتھ ادا کی گئی ہو، جس کی قرأتوں میں ترتیل اور توجّہ الی اللّٰہ کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہو، قیام اور رکوع و سجود لمبے کیے گئے ہوں، جسم پر ادب اور فروتنی چھائی ہوئی ہو، اور ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ دل اللّٰہ کی یاد میں کھویا ہوا، اس کی خشیت سے بھرا ہوا اور اس کے خشوع میں ڈوبا ہوا ہو۔ جس نماز میں ان باتوں کا اہتمام ہوگا، صحیح معنوں میں وہی نماز ہوگی، اور اسی قدر معیاری ہوگی جس قدر کہ اس میں یہ صفتیں موجود ہوں گی۔ جس نماز میں یہ اوصاف کم سے کم درجے میں بھی نہ ہوں گے وہ صورتاً نماز ہو تو ہو، حقیقتاً نماز ہرگز نہ ہوگی، اور اس سے وہ فائدے کبھی حاصل نہ ہوسکیں گے جو نماز کے فائدے ہیں۔ اس طرح کی نماز اسلام کا بس ویسا ہی کچھ ستون، ثابت ہوسکے گی جیسی کہ ریت کی دیوار کسی قلعے کی فصیل ثابت ہوسکتی ہے۔

اوپر نماز کے جو حقیقی اور ضمنی فائدے بیان کیے گئے ہیں، ان کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ نماز کے فائدے ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہی نماز کی کسوٹی ہیں۔ انہی کو سامنے رکھ کر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ہماری نمازوں کے قالب میں نماز کی روح کس قدر موجود ہے اور وہ کس حد تک "قائم" کی جارہی ہیں؟ اور اس بات کا معلوم ہو جانا دراصل یہ معلوم ہو جانا بھی ہے کہ ہماری یہ نمازیں ہمارے اسلام کا واقعی ستون بن سکی ہیں یا نہیں؟ اور اگر بن سکتی ہیں تو کس حد تک بن سکتی ہیں؟

٭

۳۔ زکوٰۃ

زکوٰۃ کی اہمیت

اسلام کا تیسرا ستون "زکوٰۃ" ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا، شریعت میں کسی عمل کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو نماز کو حاصل ہے اس لیے یہ تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ زکوٰۃ بھی دین میں ٹھیک وہی حیثیت رکھتی ہے جو نماز کی ہے، مگر اس کے بارے میں کتاب و سنّت کے اندر جو کچھ فرمایا گیا ہے، اس پر نظر ڈالیے تو اس کا مقام، نماز کے مقام سے بس ایک ہی درجہ نیچا دکھائی دے گا۔ مثال کے طور پر دو باتوں کو دیکھیے:۔

(۱) قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر ایمان کے بعد صرف دو اعمالِ صالحہ کا تذکرہ آتا ہے۔ ایک نماز کا، دوسرے زکوٰۃ کا۔ یعنی جب اسے اجمالی انداز میں ایک معیاری مومن کا تصور سامنے لانا ہوتا ہے تو وہ عموماً اس طرح کے الفاظ فرماتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ[۱]

بلاشبہ وہ لوگ، جو ایمان لائے اور جنھوں نے صالح اعمال کیے، نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی، اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس اجر ہوگا۔

حالاں کہ نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ بہت سے صالح اعمال اور بھی ہیں جن کا وجود معیاری مومن و مسلم بننے کے لیے ضروری ہے۔ پھر قرآن حکیم ایسا اندازِ بیان کیوں اختیار فرماتا ہے؟ اور معیاری مومن و مسلم کا تصوّر دینے کے لیے اکثر ایمان کے بعد صرف نماز اور زکوٰۃ ہی کا نام لے کر خاموش کیوں ہو جاتا ہے؟ دوسری نیکیوں کا ذکر بھی کیوں نہیں کرتا؟ ظاہر ہے کہ گفت گو کا یہ انداز اس نے بلا وجہ تو اختیار نہیں کیا ہے۔ غور کیجیے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہ مل سکے گی کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نماز اور زکوٰۃ یہی دو چیزیں دین کی اصل

---

[۱] سورہ البقرہ - ۲۷۷

عملی بنیادیں ہیں۔ جس نے ان دونوں فرائض کو اچھی طرح ادا کر لیا اس نے گویا پورے دین پر عمل کرنے کی پکّی ضمانت اور عملی شہادت فراہم کردی، اور اب اُس سے اس بات کا کوئی واقعی اندیشہ باقی نہیں رہا کہ دوسرے احکامِ شریعت سے بے پروائی برت جائے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس بات کا جواب آپ کو ایک طرف دین کی، اور دوسری طرف نماز اور زکوٰۃ کی حقیقتوں اور غایتوں پر نظر ڈالنے سے مل سکے گا۔ احکامِ دین کی اصولی تقسیم کیجیے تو ان کی دو ہی قسمیں ہو سکیں گی:۔ ایک قسم اُن احکام کی ہوگی جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہے، دوسری قسم ان احکام کی ہوگی جن کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے۔ اس طرح دین کی پیروی دراصل اس بات کا نام ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اس کے بندوں کے حقوق، دونوں سے عہدہ برآ ہو جائے۔ نماز کی جو حقیقت ابھی ہم معلوم کر آئے ہیں، اور زکوٰۃ کی جو حقیقت ابھی سامنے آرہی ہے، ان دونوں سے صاف عیاں ہے کہ نماز اللہ کے حقوق سے، اور زکوٰۃ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آدمی کو پوری طرح تیار کر دیتی اور تیار کیے رکھتی ہے۔ اگر ایک شخص نے مسجد میں نماز کا حق تو ادا کر دیا، تو ممکن نہیں کہ وہ مسجد سے باہر آکر اللہ کے حقوق بھول جائے گا۔ اس سے تو یہ حقوق اسی طرح ادا ہوتے رہیں گے جس طرح چشمے سے پانی اُبلتا رہتا ہے۔ اسی طرح جس نے زکوٰۃ کا حق ادا کر دیا، اس سے یہ ممکن نہیں کہ وہ بندگانِ خدا کے حقوق پامال کرتا رہے گا۔ جو شخص دوسروں پر اپنی گاڑھی کمائی خود اپنی خوشی سے صرف کرے گا، اور صرف کر کے ان کو احسان مند بنانے کے بجائے اُلٹا کچھ انہی کا شکر گزار ہوگا، وہ تو اُن کا ایک ایک حق ادا کر کے ہی چین پا سکے گا۔

پھر ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ قرآن اس حقیقت کی بار بار تلقین کرتا ہے کہ دین و ایمان میں زندگی اسی وقت آسکتی ہے جب اللہ کی محبّت ہر محبت پر غالب، اور دُنیا کی طلب پر آخرت کی طلب مقدم ہو۔ نماز اور زکوٰۃ انسان کو ایسا ہی خدا پرست اور آخرت پسند بنانے کی سب سے مؤثر تدبیریں ہیں۔ ایک ایجابی طور سے، اور دوسری سلبی طور سے۔ نماز انسان کو اللہ اور آخرت کی طرف لے جاتی ہے، تو زکوٰۃ اُسے

دنیا کی طرف لڑھک جانے سے محفوظ رکھتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کا راستہ اگر کڑی چڑھائی کا راستہ ہے تو یہ دونوں چیزیں اس راستے پر سفر کرنے والی انسانی عمل کی گاڑی کے دو انجن ہیں۔ نماز کا انجن اُسے آگے سے کھینچتا ہے اور زکوٰۃ کا انجن اسے پیچھے سے دھکیلتا ہے۔ اس طرح یہ گاڑی اپنی منزل کی طرف برابر بڑھتی رہتی ہے۔ جب صورتِ واقعہ یہ ہے تو ان دونوں چیزوں کو یہ حق لازماً پہنچنا ہی چاہیے کہ انھیں دین کی اصل عملی بنیادیں قرار دیا جائے۔

(۲) قرآن مجید نے جب مسلمانوں کو کفّارِ مکّہ سے جنگ کرنے کا آخری حکم دیا تو فرمایا کہ اب تمہاری تلواریں اس وقت تک نیام میں نہ جائیں جب تک کہ ان دشمنانِ حق کا قصہ پاک نہ ہو جائے، یا پھر یہ کہ وہ اس دین کو قبول نہ کر لیں جسے انھیں سمجھانے میں بیس بائیس سال کی لمبی مدّت صَرف ہو چکی ہے، اور اب حجّت پوری ہو جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بتانے کے لیے، کہ ان کا اسلام لے آنا کب معتبر مانا جائے گا اور اس بنا پر ان کے خلاف جنگی کارروائیاں کب ختم کر دی جا سکیں گی، اس نے فرمایا:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ۔[1]

پس اگر یہ لوگ کُفر سے توبہ کریں، اور نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو اُن کا راستہ چھوڑ دو۔

آگے چل کر پھر فرمایا:-

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ۔[2]

سو اگر یہ لوگ توبہ کریں، نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو اب وہ تمہارے دینی بھائی ہوں گے۔

---

[1] سورہ توبہ — ۵ [2] سورہ توبہ — ۱۱

کلام اللہ کی یہ صراحتیں بتاتی ہیں کہ کسی غیر مسلم کا مسلمان قرار پانا کلمۂ شہادت ادا کرنے کے بعد بھی دو باتوں پر موقوف ہے :۔ ایک[1] یہ کہ وہ نماز قائم کرے، دوسری[2] یہ کہ وہ زکوٰۃ ادا کرے ۔ جب تک وہ ایسا نہیں کرتا اس کا مسلمان ہونا قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفر سے تائب ہو کر دائرۂ اسلام میں آجانے کی زکوٰۃ کی ادائی بھی ایک ضروری علامت اور لازمی شرط ہے ۔ اسی بات کی مزید وضاحت کی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ :۔

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ فَاِذَا فَعَلُوْہُ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَآئَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ[1]۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اِن لوگوں (اہلِ عرب) سے جنگ کرتا رہوں، یہاں تک کہ وہ اللہ ہی کے معبود ہونے اور محمدؐ کے رسولِ خدا ہونے کی گواہی دے دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں ۔ جب وہ ایسا کریں گے تبھی مجھ سے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو محفوظ پا سکیں گے ، اور اس کے بعد اُن کا حساب لینا اللہ کا کام ہے ۔

نہ صرف یہ کہ اسلام کے کسی منکر کا مسلمان ہونا ادائے زکوٰۃ کے بغیر معتبر نہ سمجھا جائے گا بلکہ جو لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہوں وہ بھی اگر زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیں تو اسلامی حکومت ان کے خلاف بھی تلوار اُٹھائے گی ۔ چناں چہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانۂ خلافت میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو آپؓ نے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ، اور جب حضرت عمرؓ نے ان کے اس اقدام کے درست ہونے میں تردّد کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا :۔

وَاللّٰهِ لَاُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ الصَّلٰوۃِ

---

[1] مسلم، جلد اوّل، کتاب الایمان ۔

وَالزَّکٰوۃِ۔[1]

بخدا میں اُن لوگوں سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرتے ہیں (حالاں کہ قرآن میں انھیں ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے)

یہ سُن کر بالآخر حضرت عمرؓ کو بھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سارے ہی صحابہؓ کو پورا پورا اتفاق ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان کی بھی جان و مال اسی وقت تک احترام کے قابل ہے جب تک کہ وہ نماز ہی کی طرح زکوٰۃ بھی ادا کرتا رہے۔ اگر کوئی شخص حکم نماز پر تو عمل کرتا ہے، مگر زکوٰۃ کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا، اور اس طرح دونوں کی حیثیتوں میں فرق کرتا ہے، تو ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جائے جیسا نماز نہ پڑھنے والے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں قرآن حکیم کی دو آیتیں اور بھی ملاحظہ ہوں:

.... وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ[2]

.... ہلاکت ہے اُن مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے، اور وہ انکارِ آخرت پر تُلے ہوئے ہیں۔

وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ[3]

.... سو میں اپنی رحمت ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو میرا تقویٰ رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جن کا ہماری آیتوں پر ایمان ہے۔

پہلی آیت میں جس طرح ہم دیکھ رہے ہیں کہ زکوٰۃ نہ دینے کو شرک اور انکارِ آخرت کی علامت قرار دیا گیا ہے، اسی طرح دوسری آیت میں زکوٰۃ دینے کو تقویٰ اور ایمان کی

---

[1] مسلم، جلد اوّل، کتاب الایمان

[2] سورہ حم السجدہ ۔ ۶-۷   [3] سورہ اعراف ۔ ۱۵۶

شہادت ٹھیرایا گیا ہے ۔ اس طرح یہ دونوں آیتیں ایک ہی حقیقت کا انکشاف کر رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ زکوٰۃ بھی ایمان کا ایک لازمی مظہر ہے ، جہاں ایمان ہوگا وہاں زکوٰۃ بھی ضرور ادا ہوتی ہوگی ۔

کتاب و سنّت کے یہ بیانات ، دین میں زکوٰۃ کا مقام واضح کر دینے کے لیے بالکل کافی ہیں ، ان کی روشنی میں صاف نظر آجاتا ہے کہ زکوٰۃ کے بغیر دین کی عمارت کسی طرح نہیں بن سکتی ، اور یہ اس کا ناقابلِ انکار حق تھا کہ اسے بھی اسلام کا ستون قرار دیا جاتا ۔

زکوٰۃ کے مقاصد

اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ زکوٰۃ کس غرض کے لیے فرض کی گئی ہے ، اور وہ کیا مقاصد ہیں جن کا حصول اس سے مطلوب ہے ؟ اس سلسلے میں کتاب و سنّت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے تین مقاصد ہیں :- ایک بنیادی اور شخصی ، باقی دو ثانوی اور اجتماعی ۔

۱ ۔ تزکیۂ نفس

زکوٰۃ کا حقیقی اور بنیادی مقصد ، جس کا تعلق بالکلیہ شخص کی اپنی ذات سے ہوتا ہے ، یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے کا دل دنیا کی حرص سے پاک ہو رہے ، اور پاک ہو کر نیکی اور تقویٰ کے کاموں کے لیے تیار ہو جائے ۔ قرآن مجید میں ہے :-

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۔ [۱]

اور اس جہنّم سے دُور رکھا جائے گا وہ شخص جو اللہ سے بہت ڈرنے والا ہے ، جو اپنا مال دوسروں کو دیتا ہے (محض) پاک ہونے کے لیے ۔

---

[۱] سورہ اللّیل ۔ ۱۷ - ۱۸

ایک اور جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے :۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔[1]

ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لو، جس کے ذریعہ انھیں پاک کروگے اور اُن کا تزکیہ کروگے۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ صدقہ وزکوٰۃ کی اصل غایت دل کی پاکی اور نفس کا تزکیہ ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کی محبّت ہی وہ چیز ہے جو خدا پرستی کی اصل دشمن ہے۔ یہ انسان کو خدا اور آخرت سے بے گانہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ "دُنیا کی محبّت ہر بُرائی کی جڑ ہے۔" (حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ)[2]۔ اس محبّت کا تعلق اگرچہ دنیا کی بہت سی چیزوں سے ہوتا ہے، مگر ان میں سب سے زیادہ طاقت ور اور خطرناک محبّت مال کی ہوتی ہے۔ چناں چہ آں حضرتؐ نے مال ہی کو امّت کے حق میں سب سے بڑا فتنہ قرار دیا ہے (فِتْنَةُ اُمَّتِی الْمَالُ)[3]۔ اس لیے اگر ایک صاحبِ ایمان حُبِّ مال کی گرفت سے اپنے کو بچا لے تو دوسری بہت سی چیزوں کی محبّت سے آزادی کا راستہ اس کے لیے آپ سے آپ کُھل جائے گا۔ اس طرح اس ایک پھندے سے نجات دراصل دوسرے بہت سے پھندوں سے نجات کی ہم معنی ہو جاتی ہے۔ دنیوی پھندوں سے دل کا آزاد ہو جانا ہی اس کا پاک ہو جانا ہے۔ زکوٰۃ چوں کہ قلبِ انسانی کو یہی آزادی عطا کرتی ہے، اس لیے حقیقت یہ قرار پائی کہ وہ دلوں کو پاک کرتی ہے۔ پھر چوں کہ دنیوی بندھنوں سے آزاد اور پاک ہو جانے کے بعد انسان رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کی طرف تیزی سے بڑھتا اور نیکیوں کی طرف مائل ہو رہتا ہے، اس لیے زکوٰۃ کا اثر دلوں کو پاک کرنے کے منفی عمل ہی تک محدود نہیں رہ جاتا، بلکہ مثبت طور پر اُن کے تزکیہ اور بہتر نشوونما تک جا پہنچتا ہے، اور ان کی

---

[1] سورہ توبہ ۔ ۱۰۳   [2] رزین، بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الرقاق

[3] ترمذی، جلد ثانی۔ باب ماجاء ان فتنۃ ہذہ الامۃ فی المال۔

قوتِ خیر کو متحرک کر دیا کرتا ہے۔ یہی ساری نفسیاتی حقیقتیں ہیں جو مذکورہ بالا دونوں آیتوں کے اندر سے بول رہی ہیں۔

زکوٰۃ کی یہی بنیادی غرض و غایت ہے جس کے باعث شریعت نے اس عمل کو "زکوٰۃ" کا نام دیا ہے۔ "زکوٰۃ" کے لفظی معنیٰ پاکیزگی اور نمو کے ہیں۔ گویا اپنی کمائی کا ایک حصّہ ضرورت مندوں کو محض رضائے الٰہی کی خاطر دے دینا "زکوٰۃ" اس لیے کہلاتا ہے کہ اس سے نفس میں پاکیزگی آتی ہے اور اس کا بہتر نشوونما ہوتا ہے۔

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ زکوٰۃ کا یہ بنیادی مقصد صرف اتنی سی بات سے حاصل نہیں ہو سکتا کہ بس اپنی دولت کا ایک حصّہ نکال کر کسی غریب کو دے دیا جائے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اس "دینے" کے پیچھے اس بنیادی مقصد کے حاصل کر لینے کی سچّی نیت اور عملی اہتمام بھی موجود ہو۔ یہ سچّی نیت اور یہ عملی اہتمام کیا ہے جسے زکوٰۃ دیتے وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟ قرآن حکیم نے اس سلسلے میں بڑی تفصیل سے ہدایتیں دی ہیں، جن کا ضروری خلاصہ یہ ہے:

(۱) سب سے اہم اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ زکوٰۃ دیتے وقت صرف رضائے الٰہی کی طلب ہی اس کا محرک ہو، کسی اور محرک اور غرض کا اس میں کوئی دخل نہ ہو:۔

مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ۔[1]

تم اپنی دولت صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خرچ کرتے ہو۔

"صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خرچ کرتے ہو" کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ تمہیں ایسا کرنا چاہیے۔

قرآن مجید نے سچّے اور معیاری مسلمان کی پہچان بتلاتے وقت جگہ جگہ اس بات کو دہرایا ہے کہ وہ زکوٰۃ اور صدقے صرف اللہ کی رضا کے لیے دیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ کو "انفاق فی سبیل اللہ" یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بھی کہا گیا ہے۔

---

[1] سورہ البقرہ — ۲۷۲

(۲) دُوسری بات یہ ہے کہ جو زکوٰۃ دی جائے وہ بجائے خود پاک کمائی میں سے ہو، اور اس میں کسی حرام کمائی کا شائبہ بھی موجود نہ ہو:۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَاكَسَبْتُمْ الخ [1]

اے ایمان والو! اپنی پاک کمائی میں سے خرچ کرو۔ الخ

اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مزید وضاحت سے اس طرح فرماتے ہیں کہ "لوگو! اللہ پاک ہے، اور وہ صرف پاک مال ہی کا صدقہ قبول فرماتا ہے۔" (يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَّا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا) [2]

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ میں جو چیز دی جائے وہ عمدہ قسم کی ہو۔ ردّی اور خراب چیزوں کو اس غرض کے لیے چھانٹا گیا تو یہ زکوٰۃ دینا نہ ہوگا، بلکہ زکوٰۃ کا چھدّا اُتارنا ہوگا:۔

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ [3]

اور (اپنے) اس (مال) میں سے خراب چیز کا ہی قصد نہ کیا کرو (راہِ خدا میں) خرچ کرنے کے لیے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ زکوٰۃ لینے والے پر کوئی احسان نہ رکھا جائے، نہ اس کی دل آزاری کی جائے، نہ اس کی عزّتِ نفس کو ٹھیس پہنچائی جائے۔ ایسی کوئی بات بھی ہوئی تو سارا کیا کرایا اکارت چلا جائے گا:۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ۔ [4]

اے ایمان والو! اپنے صدقے احسان جتا کر، اور دل آزاریاں کر کے ضائع نہ کر دیا کرو اُس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کیا کرتا ہے۔

---

[1] سورہ بقرہ ۔ ۲۶۷
[2] مسلم، جلد اول، کتاب الزکوٰۃ
[3] سورہ بقرہ ۔ ۲۶۷
[4] سورہ بقرہ ۔ ۲۶۴

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن تین آدمی جہنم میں سب سے پہلے جائیں گے۔ ان میں سے ایک وہ ہوگا جس نے دنیا میں اس لیے بہت خیر خیرات کی ہوگی کہ لوگ اسے بڑا داتا اور غریب نواز کہیں[1]۔ ایک اور حدیث میں اس سے بھی زیادہ سخت بات فرمائی گئی ہے:۔

مَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ ۔[2]

جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ دیا اس نے شرک کیا۔

یہ ہیں وہ خاص خاص ہدایتیں جن پر عمل کرنے کے بعد ہی زکوٰۃ دل کی پاکیزگی اور تزکیے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اندازہ لگائیے، یہ کتنی بلند اخلاقی ہدایتیں ہیں؟ اور عام خیر خیرات میں اور اسلامی زکوٰۃ میں کیسا زمین آسمان کا فرق ہے؟ ان ہدایات کو دیکھ کر ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ زکوٰۃ دیتے وقت نفس کے شدید احتساب کی شدید ترین ضرورت ہے۔ کیوں کہ یہ ایسی عبادت ہے جو نفس کی بے شمار آفتوں سے گھری ہوئی ہے، اور ہر طرف سے اس پر جان لیوا حملوں کا خطرہ برابر لگا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس باب میں اللہ کے مخلص بندوں کا حال قرآن مجید یہ بتاتا ہے:۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۔[3]

اور یہ لوگ اپنا کھانا محتاجوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں، در آں حالے کہ وہ خود انھیں اپنے لیے محبوب ہوتا ہے (اور ان سے زبانِ حال یا زبانِ قال سے کہتے ہیں کہ) ہم تمھیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکر گزاری کے خواہش مند نہیں ہیں۔

---

[1] مسلم۔ جلد دوم، باب من قاتل للریاء والسمعۃ

[2] مسند احمد، جلد ۴ صفحہ ۱۲۶

[3] سورہ مومنون ۔ ۶۲

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ [۱]

اور یہ لوگ (اللہ کی راہ میں) جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرے ہوئے ہوتے ہیں اس خیال سے کہ انھیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے۔

یعنی کسی اظہارِ فخر یا کسی احساسِ برتری، یا کسی جذبۂ نمائش، یا کسی طلبِ شکرگزاری یا کسی دل آزاری کا کیا سوال، زکوٰۃ دیتے وقت مومن کا دل تو اُلٹا اس اندیشے سے کانپ رہا ہوتا ہے کہ کہیں اندر ہی اندر شیطان کوئی کارستانی نہ کر رہا ہو۔ مبادا کل جب میں اپنے رب کے حضور پہنچوں تو معلوم ہو کہ میرا یہ دینا اور کھلانا پلانا رائگاں جا چکا ہے۔

۲۔ غریبوں کی کفالت

اب زکوٰۃ کے ثانوی مقاصد کو لیجیے۔ ان میں سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ ملت کے نادار افراد کی مدد کی جائے، اور ان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

اِنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآءِهِمْ فَتُرَدُّ فِيْ فُقَرَآئِهِمْ [۲]

بے شک اللہ نے لوگوں پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور اُن میں کے حاجت مندوں کو دے دی جائے گی۔

اسی طرح قرآن مجید جس ادائے زکوٰۃ کو ایک اچھے مسلمان کی ضروری صفت اور علامت قرار دیتا ہے، اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

... وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ۔ [۳]

---

[۱] سورہ مومنون۔ ۶۲ [۲] مسلم، جلد اول، کتاب الایمان۔ [۳] سورہ بقرہ۔ ۱۷۷

.... اور وہ اپنا مال، باوجود (خود اپنے لیے) محبوب ہونے کے، قرابت داروں کو، یتیموں کو، ناداروں کو، مسافروں کو اور سائلوں کو دیتا، اور گردنیں چھڑانے میں صرف کرتا رہتا ہے۔

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کا ایک خالص اجتماعی اور معاشی پہلو بھی ہے، اور اس کے بغیر زکوٰۃ کا اسلامی تصوّر مکمل نہیں ہوتا۔ ایک شخص نے پوری للّٰہیت کے ساتھ اپنی دولت کا ایک حصّہ نکال دیا۔ بلاشبہ اس طرح بنیادی طور پر اس نے اپنے دل کی پاکی اور اپنے نفس کے تزکیے کا اہتمام کر لیا۔ مگر اس کا یہ فعل صرف اتنا ہی کرنے سے شریعت کے نزدیک صحیح معنوں میں "ادائے زکوٰۃ" نہیں بن سکتا۔ اور جب وہ "ادائے زکوٰۃ" نہیں بن سکا تو ظاہر ہے اسلام کے ایک ضروری ستون کی تعمیر کا ذریعہ بھی نہ بن سکے گا۔ اس کا یہ فعل "ادائے زکوٰۃ" اسی وقت بن سکے گا، اور اس سے اسلام کا تیسرا ضروری ستون اسی وقت قائم ہو سکے گا جب وہ اپنی نکالی ہوئی یہ دولت حق داروں کے حوالے کر دے گا۔ یعنی دل کی پاکی اور نفس کے تزکیے کا، زکوٰۃ کی بنیادی غرض وغایت ہونا مسلّم، مگر اس مالِ زکوٰۃ کا لوگوں کی حاجت روائی کا ذریعہ بن جانا بھی اپنی جگہ بالکل ضروری ہے۔ اس کے بغیر زکوٰۃ کا شرعی فریضہ صحیح طور سے ادا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے زکوٰۃ کو ملّت کے کھاتے پیتے افراد کی دولت میں غریبوں کا "حق" قرار دیا ہے۔ "وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ"[1] (جن کے مالوں میں سائلوں اور تہی دستوں کا مقررہ حق ہوتا ہے) اور یہ حق ایسا ہے کہ اس کی خاطر اسلامی حکومت تلوار بھی اُٹھا سکتی ہے، جیسا کہ اسوۂ صدیقی سے ابھی معلوم ہو چکا ہے۔ غرض زکوٰۃ کا یہ دوسرا مقصد اگرچہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے، مگر اس کے باوجود دین میں اس کی جو اہمیت ہے اسے معمولی نہیں کہا جا سکتا، نہ اُخروی نقطۂ نظر سے نہ دنیوی نقطۂ نظر سے۔ اس بات کا پُورا اندازہ کرنے کے لیے ان حدیثوں کو بھی دیکھیے:۔

---

[1] سورہ معارج۔ ۲۴۔ ۲۵

"مومن وہ نہیں ہوتا جو خود تو سیر ہو کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔"[1]

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، لیکن تو نے مجھے نہیں کھلایا۔ بندہ جواب دے گا کہ خدایا! میں تجھے کیسے کھلا سکتا ہوں، تو تو خود ہی سارے جہانوں کا پالن ہار ہے۔ ارشاد ہوگا کہ کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے اسے کھلانے سے انکار کر دیا تھا۔"[2]

جو دین بندے کی بھوک پیاس کو خود اللہ تعالیٰ کی بھوک پیاس سے تعبیر کرتا ہو اس کے یہاں غریبوں اور ناداروں کی حاجت برآری کوئی معمولی اہمیت کی چیز نہیں ہو سکتی۔

۳۔ دین کی نصرت

زکوٰۃ کے ثانوی مقاصد میں سے دوسرا مقصد دین کی حفاظت اور نصرت ہے۔ قرآن مجید یہ بتاتے ہوئے کہ زکوٰۃ کی رقم کن لوگوں پر اور کہاں کہاں خرچ کی جانی چاہیے، ارشاد فرماتا ہے :۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ[3]

یہ صدقات تو صرف حاجت مندوں، مسکینوں، محکمۂ صدقات کے ملازموں، اور ان لوگوں کے لیے ہیں جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو،

---

[1] بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔

[2] مسلم، کتاب البرّ والصّلۃ، باب فضل عیادۃ المریض   [3] سورہ توبہ — ۶۰

نیز گردنیں چھڑانے میں، قرض داروں کی مدد کرنے میں، اللہ کی راہ میں، اور مسافروں کی خبرگیری میں صرف ہونے کے لیے ہیں۔

"اللہ کی راہ میں" صرف ہونے کے لیے یعنی اللہ کے دین کی خاطر کی جانے والی جدوجہد میں، خصوصاً جنگی ضرورتوں میں صرف ہونے کے لیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی مالی ضرورتوں کا فراہم ہونا بھی زکوٰۃ کے مقاصد میں شامل ہے۔ چناں چہ قرآن مجید میں اہلِ ایمان سے جگہ جگہ یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ "اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ذریعہ جہاد کرو"۔ (وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[1]) اور اہلِ ایمان کی جب بنیادی صفات بیان کی جاتی ہیں تو ان کے اندر "اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے جہاد کرنے" کی بات بھی لازماً موجود ہوتی ہے۔ "اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کے ذریعہ جہاد کرنے" کا مفہوم بالکل واضح ہے، اور وہ یہ کہ دین کی خاطر جہاد کرنے کے لیے جن مصارف کی بھی ضرورت پڑے انھیں اپنے پاس سے مہیّا کرو۔

ہر شخص جانتا ہے کہ دین کی حفاظت اور نصرت کوئی چھوٹے درجے کا کام نہیں، اس لیے اس کی خاطر اپنی دولت کا خرچ کرنا بھی کوئی معمولی کام نہیں ہوسکتا۔ قرآن حکیم نے جہاد کا حکم دیتے ہوئے ایک جگہ فرمایا ہے کہ "اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور (ہاتھ روک کر) اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔ (وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ[2])۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کی حفاظت اور نصرت کے لیے ضروری مصارف کا فراہم نہ کرنا ہلاکت مول لینا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جو کام دنیا اور آخرت، دونوں جہانوں کی ہلاکت سے محفوظ رہنے کی شرط ہو، اسے بھلا کون معمولی کام کہہ سکتا ہے!

زکوٰۃ کی مقدار

زکوٰۃ کے مقاصد معلوم ہوچکنے کے بعد اگر یہ سوال کیا جائے کہ زکوٰۃ کی مقدار کیا

---

[1] سورہ توبہ — ۴۱ [2] سورہ بقرہ — ۱۹۵

ہونی چاہیے؟ تو اس سوال کا فی الواقع ایک ہی جواب ہوگا، اور وہ یہ کہ زکوٰۃ اتنی نکالنی چاہیے جتنی سے یہ تینوں مقاصد حاصل ہو جائیں :- ایک[۱] طرف تو دل حبِ مال کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ دوسری[۲] طرف معاشرے سے بھوک اور ناداری کا خاتمہ ہو جائے۔ تیسری[۳] طرف دین کی حفاظت اور نصرت کے لیے ضروری مصارف پورے ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ادائے زکوٰۃ کا یہ معیار کسی مخصوص مقدار سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ان مقاصد کا تعلق اصلاً کیفیت سے ہے، نہ کہ کمیت سے۔ اور کیفیت کا اندازہ کسی تعداد یا کسی مقدار سے نہیں لگایا جا سکتا۔ اس صورتِ حال کا فطری تقاضا یہی ہے کہ آدمی جس قدر بھی ہو سکے برابر دیتا رہے، اور دیتا ہی رہے۔ کیوں کہ مومن اپنے عمل کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ یہ اطمینان کر لینا کہ میں نے فلاں شرعی مطالبے کا حق ادا کر دیا، اس کی فطرتِ ایمانی کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم مسلمانوں کو مسلسل یہ تلقین کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ "راہِ خدا میں خرچ کرو"، "راہِ خدا میں خرچ کرو"۔ جسے سُن سُن کر حضرات صحابۂ کرامؓ کا حال یہ تھا کہ وہ بڑی سے بڑی مالی قربانیاں دینے کے باوجود بھی مطمئن نہیں ہو پاتے تھے، اور آخر کار ان کے ایمانی احساس اور اضطراب نے انھیں یہ گزارش کرنے پر مجبور کر دیا کہ ہم سے جتنے انفاق کا مطالبہ ہو وہ واضح اور متعین شکل میں بتا دیا جائے۔ (یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ[۱])۔ جس کے جواب میں انھیں بتایا گیا کہ "جو کچھ تمہاری اپنی واقعی ضرورتوں کے پورا کر لینے اور حق داروں کے حقوق ادا کر دینے کے بعد بچ رہے وہ سب کے سب اللہ کی راہ میں دے دو"۔ (قُلِ الْعَفْوَ[۲]) اس جواب سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ راہِ خدا میں خرچ کرنے کا معیارِ مطلوب کیا ہے؟ بالخصوص اس کے دونوں ثانوی مقاصد کی حد تک تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ جب تک غریبوں کی انفرادی حاجتیں اور دین و ملّت کی اجتماعی ضرورتیں پوری نہ ہو جائیں، صاحبِ استطاعت مسلمانوں سے انفاق کا مطالبہ بھی حقیقت میں باقی ہی رہے گا، اور وہ بہت کچھ دینے کے باوجود بھی اس فرض سے صحیح معنوں میں

---

[۱] سورہ بقرہ - ۲۱۹ [۲] ایضاً۔

سبک دوش نہ قرار پائیں گے۔ لیکن عام حالات میں اس بات کے اطمینان کی بھی کوئی صورت ذرا مشکل ہی سے پیدا ہوسکتی ہے کہ دین و ملّت اور افرادِ امّت، سب کی ضرورتیں پوری ہوچکی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ صاحبِ استطاعت مسلمانوں کے سامنے راہِ خدا میں خرچ کرنے کا ایمانی مطالبہ ہر آن باقی رہتا ہے، جسے پورا کرنے کے لیے ان کے احساسِ فرض کو انھیں برابر اکساتے رہنا چاہیے، اور انھیں کبھی بھی اس خیال میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ ہم نے اس فریضے کو معیارِ مطلوب کے مطابق ادا کر دیا۔ اس طرح اس بات کا فیصلہ کرنا کہ زکوٰۃ کتنی دی جائے اور راہِ خدا میں کتنا خرچ کیا جائے، حقیقتاً افراد کے اپنے ایمانی احساس پر منحصر ہو جاتا ہے۔

لیکن چوں کہ اسلام تصوّراتی سے زیادہ ایک عملی دین ہے، وہ انسانی فکر و عمل کی صرف بلندیوں ہی پر نگاہ نہیں رکھتا، بلکہ دوسری حقیقتیں بھی اس کی نظر میں رہتی ہیں، اس لیے اس نے اپنے دوسرے ارکان کی طرح اس رکنِ زکوٰۃ کو بھی تمام تر لوگوں کے اپنے احساس ہی پر نہیں چھوڑ دیا ہے کہ جس حد تک چاہیں اس کا حق بجا لائیں۔ اس کے بخلاف اس نے اس عبادت کی بلند سے بلند منزلوں تک پہنچنے کی پیہم ترغیبوں کے ساتھ ساتھ وہ حد بھی مقرر کر دی ہے جو اس کی سب سے نچلی حد ہوسکتی تھی، اور جو اُن مقاصد کے پیشِ نظر بالکل ہی ناگزیر تھی جن کی خاطر اسے دین کا ایک رکن قرار دیا گیا ہے۔ یہ حدبندی اس نے مختلف ضرورتوں اور مصلحتوں کی بنا پر کی ہے:۔

ایک[1] تو اس لیے کہ ہر معیار، ہر ذہن اور ہر صلاحیت کے لوگ اس دین کے مخاطب تھے۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسانوں کی اکثریت ایسی ہی ہوتی ہے جسے اس حدبندی کی بہر حال ضرورت ہوتی ہے، اور جو احکام پر اگر عمل کر پاتی ہے تو اسی وقت جب کہ انھیں تعداد یا مقدار کے تعین کے ساتھ واضح کر دیا جائے۔

دوسرے[2] اس لیے کہ اپنی ایمانی قوت کے لحاظ سے بھی تمام اہلِ ایمان ایک درجے کے نہیں ہوتے۔ ان میں ایسے کمزور لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا نفس تاویلوں اور گنجائشوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ اس لیے یہ بتا دینا ضروری تھا کہ دین کے

بنیادی اعمال کی وہ کم سے کم مقدار کیا ہے جسے بہر حال پورا ہونا چاہیے، اور جو گروہِ مومنین کی آخری صف میں بھی جگہ پانے کے لیے بالکل ناگزیر ہے۔

تیسرے[۳] اس لیے کہ زکوٰۃ صرف فرد کی اپنی ذاتی اصلاح اور اس کے تزکیۂ نفس ہی کے لیے فرض نہیں کی گئی ہے، بلکہ غریبوں کی کفالت اور دین کی حفاظت و نصرت بھی اس کے مقاصد میں شامل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل سے معلوم ہو چکا۔ ہو سکتا تھا کہ جہاں تک زکوٰۃ کے پہلے مقصد کا تعلق ہے، اسے فرد کے اپنے احساسِ فرض پر چھوڑ دیا جاتا، وہ اگر اپنی آخرت بنانی چاہتا تو زکوٰۃ دیتا، ورنہ اس کے بُرے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہتا۔ لیکن جب اس کے مقاصد میں غریبوں کی حاجت برآری اور دین کی حفاظت و نصرت بھی شامل ہے، اور ان دونوں باتوں کا تعلق آخرت سے نہیں، بلکہ اسی دنیا سے ہے، تو اس معاملے کو بالکلیہ لوگوں کے اپنے احساسات ہی پر کسی طرح نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نادار بندوں کی مادّی ضرورتوں اور دین کے اجتماعی مصالح کو اتنی کم اہمیت نہیں دی ہے کہ ان کے بارے میں لوگوں کو بس ترغیبیں دے دیتا، اور یہ بات تمام تر اُن کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیتا کہ جب چاہیں، اور جتنے ٹکڑے چاہیں، بھوک سے نڈھال انسانوں کی طرف پھینک دیں، یا دین کی حفاظت و نصرت کے نام پر کچھ سِکّے 'چندے' میں دے دیں! اور چاہیں تو یہ تکلّف بھی نہ کریں!! یہ مقاصد زکوٰۃ کے ثانوی مقاصد سہی، مگر اس کے باوجود اسلام نے انہیں جو اہمیت دی ہے وہ بجائے خود بہت بڑی ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ زکوٰۃ کی ایک ایسی حد لازماً مقرر کر دی جائے جسے ادا کرنے کی حیثیت اخلاقی سے آگے بڑھ کر قانونی بھی ہو۔ تاکہ غریبوں کی کفالت اور دین کی حفاظت و نصرت کا، کم سے کم ابتدائی درجے میں، انتظام بہر حال موجود رہے۔

زکوٰۃ کی یہ قانونی اور لازمی مقدار مختصراً حسبِ ذیل ہے:-

(۱) زرعی پیداوار میں سے، اگر آب پاشی کی ضرورت پیش آئی ہو تو پانچ فیصد، ورنہ دس فی صد۔

(۲) جمع شدہ رقموں، زیوروں اور تجارتی مالوں میں سے ڈھائی فی صد۔

(۳) جنگل کی چرائی پر پلنے والے مویشیوں میں سے تقریباً ڈیڑھ سے ڈھائی فی صد تک۔
(۴) معدنیات اور دفینوں میں سے بیس فی صد تک۔

اتنی زکوٰۃ کا ادا کرنا ہر صاحبِ نصاب (یعنی مال دار) مسلمان کے لیے اخلاقی ہی نہیں، قانونی طور پر بھی ضروری ہے۔ اس میں وہ کسی حال میں بھی کمی نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اس فریضے کے ادا ہونے کی یہ بالکل ابتدائی اور ناگزیر شرح ہے۔ اس میں بھی اگر کوئی کمی رہ گئی تو اسلام زکوٰۃ کی حد تک 'بے ستون' ہی رہ جائے گا، اس کی عمارت ہرگز نہ کھڑی ہو سکے گی۔ نہ صرف یہ کہ اس مقدار میں کسی کمی کی گنجائش نہیں، بلکہ جہاں تک زکوٰۃ کے مقاصد کا تعلق ہے ان کے پیشِ نظر تو اس مقدار کی پوری پوری ادائی بھی کسی اطمینان کا موجب نہیں بن سکتی۔ چناں چہ ان کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس قانونی حد پر ہرگز نہ رُکا جائے، بلکہ آگے بڑھا جائے اور آگے بڑھنے کی یہ رضا کارانہ کوشش برابر جاری رکھی جائے۔ تاکہ ان مقاصد کے پورے ہو جانے کی زیادہ سے زیادہ توقع ہو سکے۔ آگے بڑھنے کی اس کوشش کو اگرچہ لوگوں کی اپنی مرضی ہی پر رکھا گیا ہے، وہ چاہیں تو یہ کوشش کریں اور چاہیں تو نہ کریں، لیکن اس کا مطلب اب بھی یہ نہیں ہے کہ یہاں اُن کی مرضی ہی سب کچھ ہے، اور اسے قانون کسی حال میں بھی اپنا پابند نہیں بنا سکتا۔ پہلے مقصد کی حد تک تو بلاشبہ بات ایسی ہی ہے، اور اس کے بارے میں قانون مزید کوئی مطالبہ نہ کرے گا۔ لیکن دوسرے اور تیسرے مقاصد کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ان کی خاطر قانون اب بھی مطالبے کر سکتا ہے۔ چناں چہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:-

اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ[1]

مالِ مسلم میں مقررہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی (دوسروں کا) "حق" ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان اپنے مال کی متعیّنہ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد بھی دین کے مالی مطالبات سے سبک دوش نہیں ہو جاتا، اور اب بھی اس کی دولت پر

---

[1] ترمذی، جلد اوّل، باب ما جاء ان فی المال حقًّا سوی الزکوٰۃ۔

" حق "، باقی رہ جاتا ہے ۔ یہ " حق " تینوں ہی قسم کا ہوسکتا ہے :۔ اپنے نفس[1] کا بھی اس کے تزکیے کے سلسلے میں، غریبوں[2] کا بھی ان کی کفالت کے سلسلے میں اور دین[3] کا بھی اس کی حفاظت ونصرت کے سلسلے میں ۔ یعنی یہ " حق " اس لیے بھی باقی رہ سکتا ہے کہ انسان نے زکوٰۃ کی متعیّنہ مقدار اگرچہ ادا کردی لیکن اس کا دل حبِّ مال کی گرفت سے ابھی آزاد نہیں ہو پایا ہے ۔ اس لیے بھی باقی رہ سکتا ہے کہ اس مقدار میں مالِ زکوٰۃ مل جانے کے باوجود معاشرے میں بھوک اور ناداری باقی رہ گئی ہے ۔ اور اس لیے بھی باقی رہ سکتا ہے کہ اتنی رقم سے، جو زکوٰۃ کے عام قانونی مطالبے کے تحت اکٹھی ہوئی تھی، دین کی حفاظت اور نصرت کا ضروری اہتمام نہیں ہوسکا ہے ۔ لیکن جہاں تک نفس کے تزکیے کا تعلق ہے، کھلی بات ہے اس کی حد تک تو یہ " حق " قانونی کسی طرح نہیں ہوسکتا ۔ اگر ہوسکتا ہے تو صرف اخلاقی ہی ہوسکتا ہے ۔ کیوں کہ قانون کی مجبوری سے اگر انسان اپنی ساری دولت بھی غریبوں کو دے دے تو اس سے اس کے نفس میں کوئی پاکیزگی نہیں پیدا ہوسکتی ۔ یہ پاکیزگی تو اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب وہ قانون کے دباؤ سے نہیں، بلکہ دل کے احساس کے تحت یہ انفاق کرے ۔ البتہ دوسرے اور تیسرے مقاصد چوں کہ قانون سے بھی حاصل ہوسکتے ہیں اس لیے ان کی حد تک یہ " حق " قانونی بھی ہوگا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگوں کے اخلاقی احساسات معاشرے کی بھوک اور ناداری پر قابو نہ پا رہے ہوں، یا دین کی حفاظت اور نصرت کا فرض ادا کرنے سے قاصر ہوں، تو ایسی حالت میں یہ " حق " یقیناً اخلاقی سے قانونی بن جائے گا ۔ اور اس ارشادِ نبوی کی رو سے اسلامی حکومت اس بات کی مجاز ہوگی، بلکہ شاید یہ اس کی ذمہ داری قرار پا جائے گی کہ وہ غرباء کی ضرورتوں اور دین کے مفاد کی خاطر مال داروں کے اوپر مزید بار ڈالے، اور ان سے متعیّنہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مالیہ وصول کرے ۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اسلامی شریعت میں " مال دار " کا مفہوم دُنیا کے عام تصوّرات سے بہت مختلف ہے ۔ جس شخص کے پاس اس کے مالی سال کے آخر میں ساڑھے باون تولے چاندی، ڈھلے، سکّے یا نوٹ کی شکل میں موجود ہو، یا اتنی مالیت کا

وہ تجارتی سامان رکھتا ہو، اس کے نزدیک وہ بھی "مال دار" ہی ہے۔

زکوٰۃ کا نظم

زکوٰۃ کس طرح نکالی اور صرف کی جائے گی؟ شریعت نے اس بارے میں بھی متعین ہدایتیں دی ہیں۔ جو صدقات قانونی نوعیت کے نہیں ہوتے انھیں تو آپ بطورِ خود، جس طرح چاہیں، دے سکتے اور تقسیم کر سکتے ہیں۔ لیکن قانونی زکوٰۃ کے بارے میں آپ کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح نماز کی اقامت کے لیے اس کا با جماعت ادا کیا جانا ضروری ہے، اسی طرح زکوٰۃ کا بھی ایک اجتماعی نظم مقرر ہے، اور ضروری ہے کہ اسی نظم کے تحت اسے صرف کیا جائے۔ پوری مملکت کی زکوٰۃ اسلامی حکومت اپنے تحصیل داروں کے ذریعے وصول کرے گی، اور پھر وہی اسے مستحقین میں تقسیم کرے گی۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی زکوٰۃ حکومت کے حوالے کرنے سے انکار کرے، اور اپنی مرضی کے مطابق جہاں اور جس طرح چاہے تقسیم کر دے۔ قرآن مجید میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کن لوگوں پر، اور کن مدوں میں خرچ کی جائے گی وہاں "محکمۂ زکوٰۃ کے سرکاری ملازموں" (وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا[1]) کا ذکر بھی ایک مستقل مد کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ زکوٰۃ کا حکومت کے ذریعے وصول کر کے تقسیم کیا جانا اسلام کے اجتماعیت پسند مزاج کا عین تقاضا، اور اسلامی نظامِ معیشت کی ایک مسلّم دفعہ ہے۔ چناں چہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا طریقِ کار بھی اسی حقیقت کی گواہی دیتا ہے، اور اس صراحت کے ساتھ دیتا ہے کہ لازماً ایسا ہی ہونا چاہیے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانۂ خلافت میں جب کچھ لوگوں نے اپنی زکوٰۃ حکومت کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ تو آپ نے ان کے خلاف جنگی اقدام کیا، اور فرمایا:۔

---

[1] سورہ توبہ۔ ۶۰

وَاللّٰہِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ عِقَالاً کَانُوْا یُؤَدُّوْنَہٗ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتُھُمْ عَلٰی مَنْعِہٖ۔[1]

خدا کی قسم، اگر ان لوگوں نے اونٹ باندھنے کی وہ ایک رسّی بھی میرے حوالے کرنے سے روک رکھی جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس کی خاطر ان سے جنگ کروں گا۔

"میرے حوالے کرنے سے روک رکھی" کے الفاظ صاف کہہ رہے ہیں کہ زکوٰۃ لازماً حکومت کے حوالے ہونی چاہیے، اور "جنگ کروں گا" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنا اسلامی حکومت سے بغاوت کرنا ہے، جس کا انجام یقیناً نہ دنیا میں اچھا ہوگا نہ آخرت میں۔ بلاشبہ خلافت راشدہ کے زمانوں کی بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ کچھ قبیلوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کردیا گیا تھا، اور انھیں اپنے یہاں کی زکوٰتیں بطور خود غریبوں میں تقسیم کردینے کا مجاز کردیا گیا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ انھیں مستثنیٰ کیا گیا تھا، وہ آپ سے آپ مستثنیٰ نہیں ہوگئے تھے۔ یعنی ایسا خود حکومت کی مرضی سے ہوا تھا، اور یہ بھی دراصل حکومت کے ہی ذریعے زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کا ایک خاص انتظام تھا جو کچھ مصلحتوں اور سہولتوں کی خاطر اختیار کرلیا گیا تھا۔

زکوٰۃ کے لیے ایسا اعلیٰ پایہ کا اجتماعی نظم کیوں ضروری قرار دیا گیا ہے؟ اس کی دو ہی وجہیں سمجھ میں آتی ہیں:-

ایک تو یہ کہ اسلام کے مزاج کا یہی تقاضا تھا، جو غیر معمولی حد تک اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے۔ اور ایسا اس لیے ہے کہ وہ جو کچھ دنیا کو دینا چاہتا ہے اسے دنیا اس کے بغیر پا ہی نہیں سکتی کہ اس کے پیرو ایک ٹھوس اور منظم پارٹی کی شکل میں رہیں، اور جہاں تک ہوسکے ان کا کوئی کام نظم و اجتماعیت سے بے بہرہ نہ رہے۔

---

[1] مسلم۔ جلد اول، کتاب الایمان۔

دوسری یہ کہ غریبوں کے مفاد کا، اور دین کے دفاعی اور توسیعی مصالح کا قابلِ اطمینان تحفظ اسی شکل میں ہو سکتا تھا کیوں کہ، جیسا کہ بتایا جا چکا، یہ خطرہ بہرحال ایک عملی خطرہ تھا کہ کہیں مال داروں کا احساسِ فرض کبھی سرد نہ پڑ جائے، اور ان کے مالوں میں دین کا اور غریبوں کا جو حق ہے اس سے وہ غفلت نہ برت جائیں۔ اس خطرے کا ٹھیک ٹھیک ازالہ اسی طرح ممکن تھا کہ اس حق کو قانون اور حکومت کا قطعی تحفّظ حاصل ہو، اور وہ اس کے وصول کرنے کی ذمّہ دار بنا دی جائے۔

اگر زکوٰۃ کے اجتماعی نظم کی یہ مصلحتیں سامنے ہوں تو انھی سے اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ ادائے زکوٰۃ کی شکل اس وقت کیا ہو گی جب اسلامی حکومت کا ادارہ موجود نہ ہو؟ نماز کی اقامت چاہتی ہے کہ امامت کے لیے خلیفۃ المسلمین یا اس کا کوئی نائب موجود ہو، خصوصًا جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی اقامت۔ لیکن ایسے کسی امام کے موجود نہ ہونے کا تقاضا کبھی یہ نہیں سمجھا جا سکا ہے کہ ایسی حالت میں نماز ہر شخص بطور خود پڑھ لیا کرے، بلکہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ محلّے اور بستی کے تمام مسلمان اپنا ایک چھوٹا سا اور مقامی اجتماعی نظم قائم کر لیں، اور اپنے میں سے ایک شخص کو امام بنا کر نماز کو جماعت ہی کی شکل میں ادا کیا کریں۔ ٹھیک یہی معاملہ زکوٰۃ کا بھی ہے۔ اگر حکومت کا ادارہ موجود نہ ہو، جو تمام لوگوں کی زکوٰتیں وصول کر کے تقسیم کر سکے، تو اسلام کا مزاج اور اس کی اصولی ہدایتیں تو موجود ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ مسلم بستیاں جس طرح اپنی نمازوں کے لیے مسجد کا، جماعت کا، اور امامت کا انتظام کرتی ہیں، اسی طرح اپنی زکوٰتوں کے لیے بھی بیت المال قائم کریں، اور بستی بھر کی زکوٰتیں اکٹھی کر کے انھیں مستحقوں تک پہنچانے کا انتظام کریں۔ تاکہ اسلام کے اس اہم رکن کا جو منشا ہے وہ نظمِ حکومت کی عدم موجودگی میں بھی اس قدر ضرور حاصل ہوتا رہے جس قدر کہ حاصل کیا جا سکتا ہو۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ ایک اجتماعی غلط کاری ہو گی۔

☆

"زکوٰۃ"، "صدقے" اور "انفاق کی مختلف اصطلاحیں

اسلام نے "زکوٰۃ" کے لیے دو الفاظ اور استعمال کیے ہیں :- ایک "صدقے" کا، دوسرا "انفاق فی سبیل اللہ" کا، جیساکہ اوپر کے حوالوں میں آپ ابھی دیکھ بھی آئے ہیں۔ "زکوٰۃ" کی لغوی تحقیق شروع بحث میں گزر چکی ہے۔ اب ان دوسرے لفظوں کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ "صدقہ" کا لفظ "صدق" سے بنا ہے، جس کے معنیٰ 'سچائی' اور 'خلوص' کے ہیں۔ گویا زکوٰۃ کو صدقہ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ دینے والے کے ایمان میں سچائی اور خلوص بھی پیدا کرتی ہے اور اس کے موجود ہونے کی دلیل بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح "انفاق فی سبیل اللہ" کے معنیٰ ہیں 'اللہ کی راہ میں خرچ کرنا'۔ یہ ابھی جانا جا چکا ہے کہ زکوٰۃ کی اصل روح رضائے الٰہی کی طلب ہے۔ گویا زکوٰۃ کو 'انفاق فی سبیل اللہ' اگر فرمایا گیا ہے تو اس لیے تاکہ اس کی اصل روح کی طرف اشارہ ہو جائے۔ اس طرح یہ تینوں الفاظ ایک ہی چیز کے صرف تین مختلف نام ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کی حقیقت اور معنویت کے مختلف پہلوؤں کے عکاس بھی ہیں۔

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے، اس میں یہ تینوں الفاظ عموماً ایک ہی مفہوم و مدّعا میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے جو کچھ بھی خرچ کیا وہ "زکوٰۃ" بھی ہے، "صدقہ" بھی ہے، اور "انفاق فی سبیل اللہ" بھی ہے۔ چاہے یہ خرچ زکوٰۃ کے قانونی مطالبے سے متعلق ہو چاہے اخلاقی مطالبے سے۔ ان میں سے کوئی لفظ قانونی یا اخلاقی، یعنی فرض یا نفل انفاق کے لیے اس طرح مخصوص نہیں ہے کہ دوسرے کے لیے بولا ہی نہ جا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اور سُنّت کی نگاہ زیادہ تر حقیقت اور اصل مقصد پر ہوا کرتی ہے نہ کہ معاملات و مسائل کے قانونی پہلوؤں پر۔ لیکن فقہ نے ان الفاظ کے درمیان فرق کر رکھا ہے۔ اس کی زبان میں زکوٰۃ صرف اس دینے اور خرچ کرنے کو کہتے ہیں جو فرض اور قانوناً ضروری

ہو، اور" صدقہ"، اور" انفاق فی سبیل اللہ" کی اصطلاحیں بالعموم رضا کارانہ خرچ کے لیے مخصوص ہیں۔ ظاہر ہے کہ فقہ قانون کا ہی دوسرا نام ہے، اس لیے اس طرح کا اصطلاحی فرق کرنا اس کے لیے ضروری بھی تھا۔ بخلاف کتاب و سنّت کے، کہ ان کا معاملہ اس سے بہت کچھ مختلف ہے۔

۴۔ روزہ

اِسلام کا چوتھا رکن 'روزہ' ہے۔ روزے کا شرعی اصطلاحی نام" صوم" یا" صیام" ہے۔ جس کے لغوی معنیٰ" رُکنے" کے ہیں۔ اس عمل کو" صیام" اس لیے فرمایا گیا ہے کہ اس میں انسان صبح کی پَو پھٹنے سے لے کر سُورج کی ٹکیا غائب ہونے تک کھانے، پینے اور جنسی ملاپ سے رُکا رہتا ہے۔

روزے کی خاص اہمیتیں اور مصلحتیں

روزے کے سلسلے میں احکام وہدایات قرآن اور صاحبِ قرآن نے دی ہیں، ان پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ متعدد دینی اہمیتوں اور مصلحتوں کا مالک ہے۔ جن میں سے کچھ کی حیثیت بنیادی، اور بنیادی سے بھی آگے بڑھ کر امتیازی قسم کی ہے۔ روزے کو سمجھ لینا موقوف ہے اس بات پر کہ اس کی ان بنیادی اور ممتاز اہمیتوں اور مصلحتوں کو سمجھ لیا جائے۔ یہ اہمیتیں اور مصلحتیں درجِ ذیل ہیں:۔

۱۔ روزہ تقویٰ کا سرچشمہ

سب سے پہلی اور سب سے نمایاں چیز تو یہ ہے کہ روزہ انسان میں خُدا ترسی کی صفت اور تقویٰ کا جوہر پیدا کرتا ہے۔ اس بارے میں کتاب[۱] اور سنّت[۲] اور عقل[۳]، سب کی شہادتیں آپ کو موجود ملیں گی۔ چناں چہ قرآن مجید نے روزے کی فرضیت کا جو اعلان کیا ہے اس میں یہ حقیقت صراحت سے

مذکور ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔[1]

اے ایمان لانے والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح کہ تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو سکے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ :۔

اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ ۔[2]

روزہ (دنیا میں گناہوں سے، اور آخرت میں دوزخ سے بچانے والی) ڈھال ہے۔

"روزہ گناہوں سے بچانے والی ڈھال ہے"۔ اس جملے کا مفہوم بعینہٖ وہی ہے جو اس بات کا ہے کہ روزہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا کرتا ہے۔ اسی سلسلے میں آگے مزید ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

فَاِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ يَوْمَئِذٍ وَّ لَا يَسْخَبْ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ اِنِّيْ صَائِمٌ اِنِّيْ صَائِمٌ ۔[3]

پس جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہیے کہ وہ نہ فحش گوئی کرے، نہ غل مچائے۔ اور اگر کوئی اس سے گالی گلوچ کرتے یا لڑنے بھڑنے پر اتر آئے تو (اس سے بھی اور اپنے جی میں بھی) کہے کہ میں روزے سے ہوں، میں روزے سے ہوں۔

---

[1] سورہ بقرہ ۔ ۱۸۳ [2] مسلم، جلد اول، باب فضل الصیام۔

[3] مسلم، جلد اول، باب فضل الصیام

مطلب یہ کہ اگرچہ بد کلامی، گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑے وغیرہ بری حرکتوں سے بچنا ایک مومن کے لیے ہر حال میں ضروری ہے، لیکن جب وہ روزے سے ہو تو سلامت رَوی کا یہ رویّہ اس کے لیے اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے عام حالات میں اگر وہ اس طرح کی لغزشوں سے پوری طرح محفوظ نہیں رہ پاتا، تو کم سے کم روزے کی حالت میں تو اُسے ان کے قریب ہرگز نہ جانا چاہیے۔ آپؐ کا یہ فرمانا دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ روزہ، نیک روی اور خدا ترسی کی ایک مسلّمہ تدبیر ہے۔ اور مسلمہ تدبیر بھی ایسی، جس کی قوتِ تاثیر، کسی نہ کسی پہلو سے، اپنی مثال آپ ہے۔

ان منصوص شہادتوں کے بعد اگرچہ کسی اور دلیل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، لیکن دل کے مزید اطمینان کے لیے مناسب ہے کہ عقل کی نگاہوں سے بھی اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیا جائے، اور یہ سمجھ لیا جائے کہ روزے سے تقویٰ کیوں اور کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

اِس سلسلے میں سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ خود یہ تقویٰ کیا چیز ہے؟ یہ جان لینے کے بعد ہی یہ سمجھا جا سکے گا کہ روزے سے تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ تقویٰ اللہ کی ناراضی سے بچنے کے اس گہرے احساس کا نام ہے جو آدمی کو ہر بھلے کام پر اُبھارتا، اور ہر بُرے کام سے روکتا رہتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ تقویٰ ایک خاص قلبی کیفیت ہے، جس سے ایک خاص عملی رویّہ وجود میں آتا ہے۔ یہ عملی رویّہ اللہ کی اطاعت اور رضا جوئی کا رویّہ ہوتا ہے۔ اس خاص کیفیت سے جو دِل بہرہ ور ہوتا ہے وہ ہر وقت یہ دیکھتا رہتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے ناراض نہ ہونے پائے، میں کوئی ایسی حرکت نہ کر جاؤں جس کو وہ پسند نہیں کرتا، اور کسی ایسے کام کے کرنے سے رُک نہ رہوں جسے وہ پسند کرتا ہے۔

اللہ کی ناراضی سے بچنے کی، اور اس کی خوشنودی حاصل کر لینے کی یہ خواہش اور کوشش، سوچیے، عملاً کب پوری ہو سکتی ہے؟ واضح طور پر یہ خواہش اور کوشش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب انسان اپنے آپ کو قابو میں رکھے، اور اپنے نفس کو من مانی کرنے سے روکے رہے۔ گویا تقویٰ کا مقام پا لینے کی واحد

سبیل یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو لگام لگائے، اور اپنی خواہشوں میں اسے آزاد نہ چھوڑے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے:۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی

فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔[1]

رہا وہ شخص جس نے اپنے دل میں یہ ڈر رکھا کہ اسے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور اپنے نفس کو خواہشوں کی پیروی سے روکا تو یقیناً جنّت ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔

اب روزے کو دیکھیے کہ وہ کیا چیز ہے؟ روزے کا بنیادی اور قانونی وجود تین باتوں پر منحصر ہے: صبح صادق سے سورج ڈوبنے تک کچھ نہ کھایا جائے، کچھ نہ پیا جائے، جنسی خواہش پوری نہ کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کھانے پینے اور جنسی ملاپ، نفس کے ان تین مطالبات سے بالکلیہ رکا رہا جائے۔ ان تینوں چیزوں کو نفس کے مجموعی مطالبات میں جو مقام حاصل ہے، بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ انہی کے لیے مخصوص ہے۔ ایسی کسی اور خواہشِ نفس کا نام نہیں لیا جاسکتا جو اتنی ہمہ گیر، اتنی مُنہ زور اور اتنی طاقت ور ہو، جیسی کہ یہ ہیں۔ ایک تو بجائے خود ان میں ایسی بلا کی قوت ہے کہ انسان کو آسانی سے زیر کرلیتی ہیں، دوسرے وہ صرف خواہشیں ہی نہیں، بلکہ انسان کی فطری ضرورتیں بھی ہیں۔ انہی پر اس کی بقائے ذات بھی موقوف ہے اور بقائے نوع بھی۔ وہ زندہ رہنے کے لیے کھانے پینے کا، اور اپنی نسل کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے جنسی ملاپ کا ہر حال میں ضرورت مند رہتا ہے۔ ان چیزوں کی یہ دوہری حیثیت ان کی قوت واثر کو بھی لازماً دوآتشہ بنا دیتی ہے، اور اُن کا مقابلہ مشکل سے مشکل تر ہو جاتا ہے۔ روزے میں انہی تینوں سب سے زبردست خواہشوں پر قدغن ہوتی ہے۔ مسلسل ایک مہینے تک، روزانہ بارہ بارہ

---

[1] سورہ نازعات ۔ ۴۰ ۔ ۴۱

اور چودہ چودہ گھنٹے انسان اپنے نفس کے ان مطالبات پر قفل ڈالے رہتا ہے۔ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑے ہوتے ہیں، منہ سے آواز تک اچھی طرح نکل نہیں پاتی، ٹھنڈا پانی پاس رکھا رہتا ہے، نفس بے تاب ہوکر اسے ہونٹوں سے لگالینا چاہتا ہے، مگر روزہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور وہ بے بس ہوکر رہ جاتا ہے۔ کچھ یہی عالم دوسری دونوں خواہشوں کا بھی ہوتا ہے۔ اندازہ کیجیے کہ مسلسل تیس۳۰ دنوں کی یہ مشق انسان میں صبر و ضبط کی کیسی کچھ قوت نہ پیدا کردے گی؟ جو شخص اپنے نفس کی ان سب سے زیادہ مضبوط اور بے قرار خواہشوں کو بھی ایک قابلِ لحاظ وقت تک دبائے رکھنے کی مشق بہم پہنچا لیتا ہے، اس سے توقع یہی رکھی جائے گی کہ وہ اس کی دوسری خواہشوں کو اور زیادہ آسانی اور کامیابی سے قابو میں رکھ سکے گا۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کے اعتراف سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس حقیقت کا اعتراف دراصل اس امر کا اعتراف ہے کہ روزہ انسان کے اندر اپنے نفس کو اور اس کی ساری خواہشوں کو کنٹرول کرنے کی پوری طاقت پیدا کر دیتا ہے، ایسی طاقت جس کو پاکر وہ دین کی پیروی اور احکامِ الٰہی کی اطاعت میں نفس اور شیطان کی ساری مزاحمتوں سے بخوبی نمٹ سکتا ہے۔ یعنی وہ صحیح معنوں میں ایک خدا ترس اور متقی انسان بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے جس سے روزے تقویٰ کا غیرمعمولی ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، اور جس کی طرف خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں کھلا ہوا اشارہ کیا ہے:

لَیْسَ فِی الصِّیَامِ رِئَآءٌ۔[۱]

روزے میں ریا نہیں ہوا کرتی۔

کسی عبادت میں ریا کار نہ ہونا اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ

---

[۱] فتح الباری، جلد ۴ صفحہ ۹۱

وہ بندے کو خدا سے قریب کرنے والی ہے، اور یہ کہ ایسی عبادت سے زیادہ تقویٰ کا قابلِ اعتماد سرچشمہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ غلط نہ ہوگا اگر اسے تقویٰ کی سب سے زیادہ قوت بخش خوراک کہا جائے۔ رسولِ خدا کے مطابق جب روزے کی یہ ایک مستقل صفت ہے کہ اس میں ریا نہیں ہو سکتی، تو اس کے تقویٰ کا نہایت مؤثر ذریعہ ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اگر وہ عبادتیں انسان کو تقویٰ کی دولت سے مالا مال کر سکتی ہیں جن میں ریا کا دخل ہوتا رہتا ہے، تو کوئی شک نہیں کہ وہ عبادت ایسا بدرجۂ اولیٰ کر سکے گی جو اس روگ سے لازماً پاک ہی رہتی ہے۔

یہ بات کہ روزے میں ریا کیوں نہیں ہو سکتی، کوئی چھپا ہوا راز نہیں ہے۔ بلکہ آسانی سے سمجھ میں آجانے والی حقیقت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کی نوعیت سرتا سر منفی ہے۔ یعنی وہ کچھ اعمال یا حرکات کے کرنے سے وجود میں نہیں آتی (جیسا کہ نماز اور زکوٰۃ اور حج کا حال ہے) بلکہ کچھ کاموں کے نہ کرنے سے وجود میں آتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرح کی عبادت دوسروں کے نہ دیکھنے میں آسکتی ہے نہ سننے میں۔ اور جب کسی عبادت کا حال یہ ہو کہ اسے کوئی نہ دیکھ سکتا ہو نہ سُن سکتا ہو، تو اس میں ریا اور دکھاوے کا کوئی امکان بھی کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے سارے ارکانِ اسلام میں یہ امتیاز صرف ایک روزے ہی کو حاصل ہے کہ ریا کاری کا خطرناک شیطان اس پر شب خون نہیں مار سکتا۔ بظاہر روزے کی یہی امتیازی حیثیت تھی جس کی بنا پر قرآنِ حکیم نے لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ اگر فرمایا ہے تو صرف روزے کے حکم کے ساتھ فرمایا ہے کسی اور عبادت کے حکم کے ساتھ ان لفظوں کا اعادہ نہیں کیا ہے۔ حالاں کہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم تھی کہ انسان میں نیکی کا جوہر اور تقویٰ کا نور ہر عبادت پیدا کرتی ہے۔ پھر غالباً روزے کی یہی امتیازی حیثیت تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مخصوص اسی ایک فعلِ عبادت کو "اپنا" یا "اپنے لیے" فرمایا ہے، اور اجر و ثواب کی میزان میں بھی اسے سب سے زیادہ باوزن قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

کُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ یُضَاعَفُ الْحَسَنَۃُ عَشْرَ اَمْثَالِھَا اِلٰی

سَبْعِ مِاۃِ ضِعْفٍ قَالَ اللہُ عَزَّوَجَلَّ اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ یَدَعُ شَھْوَتَہٗ وَطَعَامَہٗ مِنْ اَجْلِیْ۔ [1]

انسان کے ہر عملِ خیر کا اجر دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لیکن روزہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ کیوں کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا (جتنا چاہوں گا) بدلہ دوں گا۔ (آخر) انسان اپنی شہوتِ نفس اور اپنا کھانا پینا میری ہی خاطر تو روکے رہتا ہے۔

"روزہ میرے لیے ہے"، یہ ارشاد دراصل اسی حقیقت کی ایک دل نواز تعبیر ہے کہ روزے میں ریا نہیں ہوا کرتی۔

اگر روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو، جیسا کہ معلوم ہوا، تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہی تقویٰ روزے کی اصل کسوٹی بھی ہے۔ روزے کی صورت اور اس کا قانونی وجود اگر یہ ہے کہ انسان کھانے پینے اور جنسی یک جائی سے دُور رہے، تو اس کی حقیقت اور اس کا واقعی وجود یہ ہے کہ ان تمام باتوں سے دور رہا جائے جو اللہ کو ناراض کرنے والی ہوں۔ اگر ایک شخص روزہ رکھ کر اپنی صرف انہی تین خواہشوں کو کنٹرول نہیں کرتا، بلکہ اپنی ساری خواہشوں کو احکامِ الٰہی کے کنٹرول میں دے دیتا ہے تو وہ حقیقی معنوں میں روزے دار ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا روزہ روزہ نہیں، بلکہ صرف فاقہ ہے۔ کیوں کہ کھانے پینے اور جنسی خواہش سے اجتناب ہی اصل روزہ نہیں ہے، بلکہ اصل روزے کی صرف ظاہری صورت اور قانونی علامت ہے۔ اگر کوئی شخص اس ظاہری اور قانونی حد ہی تک جا کر رُک رہا تو اس کا معاملہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ روزے کے گھر کے چاروں طرف گھوم کر واپس چلا آیا، اس میں داخل ہوا ہی نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاف فرماتے ہیں کہ:

كَمْ مِّنْ صَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ صِیَامِہٖ اِلَّا الظَّمَاُ۔ [2]

---

[1] مسلم، جلد اوّل، باب فضل الصیام۔ [2] دارمی، کتاب الرقاق، باب فی المحافظۃ علی الصوم۔

کتنے ہی روزے دار ایسے ہیں جن کے پلے اپنے روزے سے، پیاس کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا۔

یہ نام نہاد روزہ دار کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں؟ اس کی وضاحت ایک دوسرا ارشادِ رسولؐ اس طرح کرتا ہے:-

مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ۔[1]

جس کسی نے (روزے کی حالت میں) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا وہ جان لے کہ اللہ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہ شخص بس اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

ان ارشادات نے یہ بات بالکل واضح کردی کہ نفس کے صرف ان تین مطالبات پر بندشیں لگانے کا مقصد دراصل اس کی تمام ہی خواہشوں پر قابو حاصل کرلینا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس مشق اور تربیت کے ذریعے اپنے نفس کو لگام نہ لگا سکا اور روزے کی حالت میں بھی اس کی شرارتیں جاری رہیں، تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ اس نے روزے کے مقصد کو ہی نہیں سمجھا۔ اور اگر سمجھا تو اُسے اپنایا نہیں۔ اور جب اس نے روزے کے مقصد کو سمجھا یا اپنایا نہیں تو کوئی شک نہیں کہ وہ روزہ رکھ کر بھی بے روزے کا رہا۔ اور حقیقت کے اعتبار سے اس میں اور ایک بے روزہ شخص میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

۲- روزہ تقویٰ کا لازمی ذریعہ

روزے کی دوسری بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر تقویٰ کی مطلوبہ صفت پیدا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں کہ روزہ تقویٰ

---

[1] بخاری، جلد اوّل، باب من لم یدع قول الزور والعمل به فی الصوم۔

پیدا کرتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بغیر صحیح تقویٰ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ بلاشبہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو تقویٰ کو نشو و نما دیتی ہیں۔ مگر روزہ اس سلسلے میں جو کردار انجام دیتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ دُوسرا کوئی عمل اس کا نعم البدل نہیں بن سکتا۔ یہ حقیقت ہمیں مذکورہ بالا آیت کے الفاظ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ کے اندر سے جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس آیت کا منشا اگر صرف یہ بتانا ہوتا کہ روزے مسلمانوں پر اس لیے فرض کیے گئے ہیں تاکہ ان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو سکے، تو ان لفظوں کے اضافے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ اس صورت میں ان لفظوں کا اضافہ تاریخ کے ایک واقعے کے اظہار و بیان سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا۔ حالاں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن حکیم مجرد تاریخ نگاری سے بہت اونچا ہے، اور وہ اس وقت تک کوئی ایک لفظ بھی نہیں بولتا جب تک کہ اس سے کوئی دینی غرض وابستہ نہ ہو۔ اس لیے ان لفظوں کے بارے میں بھی یہی سمجھا جانا چاہیے کہ ان کا اضافہ یقیناً کسی نہ کسی دینی غرض و مصلحت ہی سے کیا گیا ہے۔ یہ دینی غرض اور مصلحت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ساتھ کے ساتھ حصول تقویٰ کے بارے میں روزے کی ناگزیر ضرورت کا بھی اظہار ہو جائے۔ لوگوں کو روزے کی فرضیت اور اس کی غرض و غایت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تقویٰ کے مقام مطلوب تک پہنچنے کے لیے روزے بہرحال ضروری ہیں۔ کوئی بھی دوسری چیز اس سلسلے میں وہ کام نہیں کر سکتی جسے یہ روزہ انجام دے سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو روزہ ہر آسمانی شریعت کا ستون نہ بنتا رہتا۔ اگر کوئی شریعت اس سے خالی نہیں رکھی گئی تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ کے دین کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزے کو بھی ایک فطری مناسبت ہے۔ اور اس کے بغیر اس کا تربیتی نظام عبادت کسی طرح مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔

جہاں تک اس نکتے کا تعلق ہے کہ روزے تقویٰ کا مطلوبہ جوہر پیدا کرنے کے لیے کیوں ضروری ہیں، تو اسے سمجھنے کے لیے، ہمیں پچھلی بحث کو ایک بار پھر پڑھ لینا چاہیے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ روزہ انسان کے اندر تقویٰ کس طرح پیدا کرتا ہے؟ یہ امر واقعی

کہ روزہ انسان میں ضبطِ نفس پیدا کرنے کا بڑا موثر ذریعہ اور بہت قریب کا راستہ ہے، اور یہ حقیقت، کہ روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں ریا دخیل نہیں ہوسکتی، یہ دونوں چیزیں اس نکتے کو سمجھا دینے کے لیے بہت کچھ کافی ہیں۔ وہ اس راز کو، اگر پوری طرح نہیں تو ایک بڑی حد تک، ضرور کھول دیتی ہیں کہ ایک عام انسان کے لیے روزے کیوں ناگزیر ہیں؟ ذہن کی باقی گرہیں ان شاء اللہ اس بحث کے پڑھنے سے کھل جائیں گی جو آگے آرہی ہے۔

۳۔ روزہ اسلامی تصوّر کا آئینہ

روزے کی تیسری خاص اہمیت یہ ہے کہ وہ بعض اعتبارات سے اسلام کے اصل مزاج کا سب سے بڑا عکاس ہے، اور دین کا جو تصوّر قرآن نے دیا ہے اس کے امتیازی خط و خال روزے کے آئینے میں سب سے زیادہ واضح شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ انسان کو صرف عمل ہی کا متقی نہیں بناتا، بلکہ فکر و نظر کا بھی 'متقی' بناتا ہے۔ وہ انسان کو صرف تقویٰ نہیں دیتا، بلکہ تقوے کا جامع اور مانع مفہوم بھی دیتا ہے۔ اس اجمال کی شرح، یا اس حقیقت کا سُراغ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ملتا ہے:۔

(۱) لَا صَامَ مَنْ صَامَ الدَّهْرَ۔ [1]

جس نے زندگی بھر مسلسل روزے رکھے، اس کا روزہ، روزہ نہیں۔

(۲) اِيَّاكُمْ وَالْوِصَالَ۔ [2]

تمہیں دو یا دو سے زائد دنوں کو ملا کر (بلا سحری و افطار) روزہ رکھنے سے پوری طرح دُور رہنا چاہیے۔

(۳) ایک سفر کے دوران آپؐ نے دیکھا کہ لوگوں کی ایک بھیڑ اکھٹی ہے، اور ایک

---

[1] بخاری، جلد اول، کتاب الصوم۔ [2] مسلم، جلد اوّل، کتاب الصیام۔

شخص کے اوپر سایہ کر رکھا گیا ہے۔ دریافت فرمایا کہ "کیا معاملہ ہے؟"۔ بتایا گیا کہ "ایک روزہ دار ہے"۔ ارشاد ہوا کہ :۔

لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِی السَّفَرِ۔ [1]

یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ سفر میں (اس طرح کا) روزہ رکھا جائے (جس کی مشقتیں عام قوتِ برداشت سے باہر ہوں۔)

(۴) بیرونِ مدینہ کے رہنے والے ایک صحابیؓ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ملاقات کی، اور واپس چلے گئے۔ سال بھر بعد دوبارہ آئے، اور اب جو آئے تو اس حال میں تھے کہ ان کی شکل وصورت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ انھوں نے آپؐ سے پوچھا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپؐ مجھے پہچان نہیں رہے ہیں؟ آپؐ نے دریافت فرمایا "تم کون ہو؟"۔ جواب دیا "میں وہی شخص تو ہوں جو گزشتہ سال حاضرِ خدمت ہوا تھا۔" ارشاد ہوا "کس چیز نے تمہاری ہئیت بدل کر رکھ دی ہے؟ تم تو بڑی اچھی شکل وصورت کے تھے۔" انھوں نے بتایا کہ "یہاں سے واپس جانے کے بعد آج تک میں نے رات کے سوا کبھی کھانا نہیں کھایا" (یعنی مسلسل روزے رکھتا رہا۔) یہ سن کر آپؐ نے فرمایا :۔

لِمَ عَذَّبْتَ نَفْسَکَ۔ [2]

تم نے اپنے کو کیوں عذاب دیا؟

اِن ارشادات کے الفاظ پر ذرا غور سے نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ روزہ ان کی زبان سے دین داری کے ایک انقلابی تصوّر کا اعلان کر رہا ہے، وہ زور دے کر کہہ رہا ہے کہ جس تقویٰ کو میرا مقصد قرار دیا گیا ہے اس کا منشا نفس کشی نہیں۔ بلکہ صرف ضبطِ نفس ہے۔ گویا روزہ تقویٰ صرف پیدا ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کی ایک ایسی حقیقت بھی سمجھاتا ہے جو عام طور سے بہت کم سمجھی اور جانی جاتی ہے۔ کیوں کہ "تقویٰ"

---

[1] بخاری، جلد اوّل، کتاب الصوم۔ [2] ابوداؤد۔ جلد اوّل، کتاب الصیام۔

کا لفظ سُنتے ہی ذہنوں کے اندر عموماً کچھ اس طرح کا تصوّر ابھرنے لگتا ہے کہ انسان اپنے نفس کے مطالبات ٹھکرا دینے میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھتا جائے۔ جو شخص اپنے نفس کو جتنا زیادہ مارے گا تقویٰ کا اتنا ہی اونچا مقام حاصل کرلے گا، جیساکہ خود قرآن نے وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى[1] فرماکر بتا رکھا ہے کہ خوفِ خدا (یعنی تقویٰ) اپنے نفس کو اس کی خواہشوں سے باز رکھے بغیر حاصل نہیں ہوتا لیکن رسولؐ خدا کے یہ ارشادات کہتے ہیں، اور خود روزے کے عمل کی نوعیت وضاحت کرتی ہے کہ آیت کا منشا اور مطالبہ یہ ہرگز نہیں ہے، اور اسلام میں تقویٰ کا جو مفہوم ہے وہ اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ وہ جس طرزِ عمل کا انسان سے مطالبہ کرتا اور جس چیز کو برّ (نیکی) اور تقویٰ (خُداترسی) ٹھیراتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو سرکش نہ ہونے دے، اور اسے من مانی کرنے سے روک کر احکامِ شریعت کا تابع بنائے رکھے، یہ نہیں ہے کہ اسے اذیّتیں دے دے کر بے دم بنالے، اور اس کے جبلّی مطالبات کو یکسر ختم کرکے رکھ دے۔ دُوسروں کے نزدیک یہ دین داری کا چاہے کتنا ہی بلند اور مقدّس تصوّر کیوں نہ ہو، اسلام کے نزدیک قطعاً ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔ وہ اسے حقیقی دین داری اور صحیح بندگی کا طریقہ نہیں کہتا۔ اس کے تصوّرِ دین کی رو سے یہ تقویٰ نہیں ہے، بلکہ اپنے آپ کو "عذاب" دینا ہے۔ روزہ کا عمل اس امر کی ایک مستقل یاد دہانی ہوتا ہے۔

اس کے بعد چند ارشادات اور سُنیے، آپؐ فرماتے ہیں:۔

۱۔ تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السُّحُوْرِ بَرَکَۃً۔[2]

سحری کھا لیا کرو۔ کیوں کہ سحری کھانے میں برکت ہے۔

۲۔ لَا یَزَالُ النَّاسُ بِخَیْرٍ مَّا عَجَّلُوا الْفِطْرَ۔[3]

جب تک لوگ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے حالتِ خیر میں رہیں گے۔

---

[1] سورہ النازعات۔ ۴۰ [2] مسلم، جلد اوّل، باب فضل السحور [3] ایضاً۔

۳۔ لَا یَزَالُ الدِّیْنُ ظَاھِرًا مَّا عَجَّلَ النَّاسُ الْفِطْرَ۔ [1]

دین اس وقت تک برابر غالب رہے گا جب تک لوگ افطار کرنے میں عجلت سے کام لیتے رہیں گے۔

۴۔ قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ اَحَبُّ عِبَادِیْ اِلَیَّ اَعْجَلُھُمْ فِطْرًا۔ [2]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو افطار کرنے میں سب سے زیادہ جلدی کرتا ہے۔

پچھلی حدیثوں سے جو اہم اور انقلابی حقیقت روشنی میں آئی تھی، یہ حدیثیں اس کو روشن سے روشن تر کر رہی ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے پورے مفہوم کو اجاگر کر دیتی ہیں۔ اُن حدیثوں کی زبانی اگر روزے نے یہ بتایا تھا کہ تقویٰ کا منشا نفس کُشی نہیں، بلکہ صرف ضبطِ نفس ہے، تو اِن حدیثوں کی زبانی وہ اس 'ضبطِ نفس' کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس میں "ضبطِ رائے" اور 'ضبطِ ذوق' بھی داخل ہے۔ یعنی جس طرح اپنے نفس کو احکامِ الٰہی کا تابع رکھا جائے اسی طرح احکامِ الٰہی کی پیروی کرنے میں اپنے ذوق و رجحان اور اپنی رائے کو بھی کسی طرح دخیل نہ بنایا جائے۔ حقیقی تقویٰ کا اصل مقام صرف اتنی بات سے حاصل نہیں ہو سکتا کہ نفس کو احکامِ خدا و رسول کی مخالفت سے باز رکھا جائے، بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان احکام کی بجا آوری اور رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی رائے، اپنے رجحان اور اپنے ذوق کو اُس وقت بھی کچھ بولنے کا حق نہ دیا جائے جب کہ وہ بظاہر خدا پرستی کے حق میں جاتے نظر آتے ہوں۔ انسان کو خدا کی بندگی، نفیاً اور اثباتاً، ہر حیثیت سے ٹھیک اسی شکل میں کرنی چاہیے جس کی اسے اوپر سے ہدایت ملی ہو۔ وہ جس طرح اپنے نفس کی اُن خواہشوں کو دیوار پر دے مارتا ہے

---

[1] ابوداؤد۔ جلد اوّل، کتاب الصیام۔

[2] ترمذی، جلد اوّل، باب ما جاء فی تعجیل الافطار۔

جو اُسے احکامِ دین کی بجا آوری سے روک رہی ہوں، اسی طرح چاہیے کہ ان احکام کی بجا آوری کی شکلیں اور حدیں مقرر کرنے میں بھی اپنے جی کی کوئی بات نہ سُنے۔ وہ اللہ کی بندگی اور تقویٰ کی زندگی صرف اس چیز کو سمجھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جس کام کو جس طرح، اور جس شکل میں کرنے کو کہا ہے اسے ٹھیک اسی طرح اور اسی شکل میں انجام دیا جائے، اور جس بات سے جس حد تک اور جس شکل میں روکا ہے اس سے بس اسی حد تک اور اسی شکل میں رُکا جائے۔ اس کا دل اس حقیقت پر مطمئن ہو کہ جس طرح فلاں کام دین کا حکم ہے اور اس کا کرنا نیکی اور تقاضائے بندگی ہے، اسی طرح یہ بھی نیکی اور تقاضائے بندگی ہی ہے کہ جذبۂ اطاعت کے تحت بھی اس کی حدود اور مقدار میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہ کیا جائے۔

روزہ ضبطِ نفس کے ساتھ ساتھ 'ضبطِ رائے' اور 'ضبطِ ذوق' کو بھی تقویٰ کے مفہوم میں جس طرح شامل بتاتا ہے، وہ کسی لمبی چوڑی توضیح کا محتاج نہیں۔ ایک طرف[۱] تو یہ بات کہ روزے کے فرض کیے جانے کی غرض و غایت تقویٰ کا حصول ہے، دوسری[۲] طرف یہ تنبیہ کہ سحری کھائے بغیر روزہ رکھنا ایک بڑی برکت سے محروم رہنا اور افطار میں دیر لگانا حالتِ خیر اور غلبۂ دین کے ختم ہو جانے کی علامت ہے، ان دونوں باتوں کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھیے تو صاف معلوم ہوگا کہ سحری نہ کھانا اور افطار دیر سے کرنا منشائے تقویٰ کے خلاف ہے۔ حالاں کہ ان باتوں سے نفس کو کوئی رعایت نہیں ملتی، بلکہ اس کی سرکشی کو ختم کرنے میں کچھ اور مدد ہی ملتی ہے۔ اس لیے یہ باتیں بظاہر روزے کے مقصد (یعنی تقویٰ) کے حصول میں سازگار ہی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اللہ کا رسول[ؐ] فرماتا ہے کہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ کیوں؟ اس "کیوں" کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح روزہ رکھنے میں اپنی رائے اور اپنے ذوق کو بھی دخیل بنا لیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کی جو ابتدا اور جو انتہا مقرر کر دی ہے، سحری نہ کھانے اور افطار میں دیر لگانے سے ان کا پورا پورا احترام باقی نہیں رہ جاتا۔ اُنھی کا روزے کی ابتدا اور انتہا ہونا پسندِ خاطر نظر نہیں آتا۔ انھی کو فیصلہ کن اہمیت ملتی دکھائی

نہیں دیتی۔ بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روزے کی اس متعینہ مدت کو کافی نہیں سمجھا جاتا، اور اسے بڑھا دینا مقصد برآری کے لیے زیادہ موزوں اور مفید خیال کیا جاتا ہے۔ اور یہ صاف طور پر اپنی رائے اور اپنے ذوق کو عبادت کے معاملے میں دخیل قرار دینا ہے۔ اگر سحری نہ کھانے اور افطار دیر سے کرنے کو باعثِ محرومی اور خلافِ تقویٰ ٹھہرائے جانے کی وجہ اس ایک بات کے سوا اور کوئی نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر یقیناً نہیں ہے، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ روزہ تقویٰ کا صحیح مفہوم و منشا صرف ضبطِ نفس ہی کو نہیں بتاتا، بلکہ "ضبطِ رائے" اور "ضبطِ ذوق" کو بھی اس میں لازماً شامل قرار دیتا ہے۔ وہ حقیقی تقویٰ کی تعبیر یہ کرتا ہے کہ نفس کی خواہشوں کی طرح ذوق و رائے کی آزادیوں پر بھی احکامِ الٰہی کا پورا پورا کنٹرول ہو۔[۱]

۱؎ حقیقی تقویٰ کا یہ تصور، اور مذکورہ بالا ارشاداتِ رسول عام مذہبی ذہنوں کو بڑے عجیب معلوم ہوں گے۔ مگر یہی "اعجوبہ پن" دراصل دینِ حق کا وہ خاص وصف ہے جو اُسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہی عام مذہبی ذہنیت تھی جس کے پیشِ نظر اس طرح کے ارشادات پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے بھی ہیں۔ یہ فرماتے وقت آپؐ کے سامنے پچھلی اُمتوں کی تاریخ تھی، تحریفِ ادیان کے تجربے تھے، نفس کشی اور رہبانیت کے فلسفے تھے۔ آپؐ کو معلوم تھا کہ اللہ کے دین کو صرف نفس کے پجاری ہی ملیامیٹ نہیں کرتے رہے ہیں، بلکہ پاک نفسوں کا غلو اور تشدد بھی اس کو نئی ہیئت اور نیا مزاج دیتا رہا ہے، اور جس چیز اور جس عبادت میں یہ تشدد پسندی سب سے زیادہ راہ پاتی رہی ہے، وہ یہی روزہ ہے۔ روزے کی عبادت کو لوگوں نے مسلسل فاقہ کشی کی شکل دے دی، اور اس معصوم یقین کے ساتھ دے دی کہ فاقہ جتنا ہی زیادہ لمبا ہوگا روزے کا مقصد اتنا ہی زیادہ کامل شکل میں پورا ہوگا۔ پھر یہ طرزِ فکر آگے بڑھا، اور نفس کشی و رہبانیت دین داری کا کمال بن گئی۔ یہ تھا وہ پس منظر

(باقی اگلے صفحہ پر)

روزے کی ان غیر معمولی اہمیتوں پر نظر ڈالیے تو یہ اندازہ کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہ رہ جائے گا کہ اسے اسلام کا ایک ستون کیوں بنایا گیا ہے، اور اس کے بغیر

(بقیہ حاشیہ صہ) جس کی موجودگی میں اللہ کے آخری رسولؐ ہونے کی حیثیت سے آپؐ نے بجا طور پر ضروری سمجھا کہ لوگوں کو اچھی طرح متنبہ کر دیں، اور اُن خطرات سے اسلام کو پوری طرح محفوظ رکھنے کا پورا پورا اہتمام کر جائیں جو ہمیشہ سے دینِ خداوندی کو پیش آتے رہے اور اسے بدل کر کچھ سے کچھ بناتے رہے ہیں۔ اور اس غرض سے روزے کو بطورِ خاص نفس کشی، ترکِ لذّات اور رہبانیت کے دل فریب تصورات کی پناہ گاہ بننے سے مضبوطی کے ساتھ روک دیں۔ اس لیے یہ بات آپؐ نے اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین کرا دی کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کی جو ابتدا اور انتہا مقرر کی ہے، عملاً بھی اُنہیں برقرار رکھا جائے، اور اس کی مدت میں کوئی توسیع اپنے طور پر ہرگز نہ کی جائے ورنہ تم تو اس خوش گمانی میں مبتلا رہو گے کہ ہمارا یہ عمل 'للہ و فی اللہ' ہے اس لیے اس سے ہمارا اور زیادہ بھلا ہوگا، مگر حقیقتِ حال کچھ دوسری ہوگی۔ کیوں کہ تمہارا یہ کام بظاہر نیکی و طاعت کا کام، اور نیت کے اعتبار سے 'للہ و فی اللہ' سہی، مگر اس کے ساتھ یہ بھی تو ہوگا کہ وہ دین کے اصل مزاج اور بندگی کے حقیقی تصور کو باقی نہ رہنے دے گا، اور یہ ایسی عظیم محرومی ہوگی جس کی تلافی کسی طرح نہ ہو سکے گی۔ دین کی علم بردار اُمّت اگر یہی نہ جانتی ہوگی کہ ٹھیک ٹھیک اس کی راہ اور منزل کیا ہے، تو وہ اپنے فرائضِ منصبی کو صحیح طریقے سے انجام کس طرح دے سکے گی؟ اس اہم ترین مصلحت کو اگر سامنے رکھا جائے تو نظر آئے گا کہ سحری و افطار کا بظاہر ایک معمولی سا مسئلہ فی الواقع ایک بڑا ہی عظیم مسئلہ ہے۔ یہ دراصل دین کے صحیح تصور کی بقا کا مسئلہ ہے۔ سحری اور افطار کا ان شرعی ہدایتوں پر عمل کرنا درحقیقت دین کے حقیقی مزاج کو محفوظ رکھنے کی ایک ناگزیر تدبیر ہے، اور انھیں پسِ پُشت ڈال دینا اس مزاج میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

دین کی عمارت کیوں نہیں بن سکتی ؟

روزے کے بعض خاص ثمرات

یہ جان لینے کے بعد کہ روزہ انسان کو تقویٰ کے حقیقی جوہر سے کس طرح اور کیوں کر آراستہ کر دیتا ہے، فی الواقع اب کوئی اور بات جاننے کی باقی نہیں رہ جاتی۔ کیوں کہ جس شخص میں تقویٰ کا نور پیدا ہو گیا، اس سے وہی کچھ سرزد ہوگا جسے اللہ اور اس کا رسول چاہتا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس میں دین کی ساری مطلوبہ چیزیں سمائی ہوئی ہیں۔ لیکن پھر بھی بعض صفات اور اعمال ایسے ہیں جو روزے کے بڑے نمایاں اور اہم ثمرات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے روزے کا مقام عظمت پوری طرح محسوس کر سکنے میں مزید آسانی ہو جائے گی اگر ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے:۔

(۱) روزہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ حاکمیت کا یقین حق الیقین سے بدل دیتا ہے۔ سحر کا وقت آیا، اُٹھو کھا پی لو۔ افق پر صبح کی سفید دھاری دکھائی دینے کو ہے، کھانے پینے سے ہاتھ روک لو۔ اب شام تک، ہر طرح کی پاک اور لذیذ نعمتیں رکھنے کے باوجود بھوکے پیاسے رہو۔ سورج ڈوب گیا، روزے کی حالت ختم کر دو اور کچھ نہ کچھ ضرور ہی کھا پی لو۔ حکم اور تعمیلِ حکم کا، آقائی اور غلامی کا، یہ ایسا غیر معمولی مظاہرہ ہے جس کی نظیر کسی دوسرے عمل شریعت میں مشکل ہی سے ملے گی۔ یہ صورت حال بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے حاکم و فرماں روائے مطلق ہونے کو گویا آنکھوں دیکھی حقیقت بنا دیتی ہے۔

(۲) روزہ اسلامی معاشرے میں ہمدردی اور مواسات کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص) بگاڑ پیدا ہو جانے کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اس طرح دین اپنا مزاج و تصوّر بدل کر اگر جزوی طور پر بھی رہبانیت کی شکل اختیار کر گیا تو یقیناً امّت کے حالتِ خیر' میں ہونے اور دین کے 'غالب و نافذ' رہنے کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہ جائے گا۔ (ص)

وہ مال داروں کو مسلسل ایک ماہ تک ناداری کے عملی تجربے کراتا رہتا ہے۔ وہ انھیں کم از کم تیس بار یہ محسوس کراتا ہے کہ فاقہ اور بھوک کسے کہتے ہیں، اور اُن بندگانِ خدا کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی جو اُن کے شکار ہوا کرتے ہیں؟ یہ عملی تجربہ اور یہ احساس قدرتی طور پر اُن کے اندر اس جذبے کو اُبھار دیتا ہے کہ اپنے غریب اور نادار بھائیوں کو اُن کے اپنے حال پر نہ چھوڑا کریں گے۔ اس طرح اُن میں انسانی ہمدردی اور انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ روزے میں فزوں سے فزوں تر ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے مہینے کو اسی بنا پر "شَھْرُ الْمُوَاسَاۃ" (ہمدردی کا مہینہ) فرمایا ہے[1]۔ اور خود آپؐ کا حال اس زمانے میں یہ ہوا کرتا تھا کہ "نہ کسی قیدی کو قید میں باقی رکھتے اور نہ کسی سائل کو محروم واپس کرتے (اِذَا دَخَلَ شَھْرُ رَمَضَانَ اَطْلَقَ کُلَّ اَسِیْرٍ وَاَعْطٰی کُلَّ سَائِلٍ[2]) اور بقول حضرت ابنِ عباسؓ، اگرچہ آپؐ سب سے بڑے فیاض انسان تھے، مگر رمضان کے مہینے میں آپؐ کی فیاضی غیر معمولی حد تک بڑھ جاتی تھی (کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ بِالْخَیْرِ وَکَانَ اَجْوَدَ مَا یَکُوْنُ فِیْ رَمَضَانَ)[3]

(۳) روزہ مساوات کے شعور کو مضبوط سے مضبوط تر کر دیتا ہے۔ اس مہینے میں امیر اور غریب، راعی اور رعایا، خاص اور عام، غرض اُمّت کے سارے افراد نمایاں حد تک ایک سی حالت میں ہوتے ہیں۔ سب کے سب غلامی کی ایک ہی سطح پر کھڑے ہوتے ہیں۔ سب کے چہروں سے ایک ہی اقتدارِ اعلیٰ کی محکومی کا، اور یکساں محکومی کا مظاہرہ ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال ان کے اندر سے اونچ نیچ کے خیال کو نکال کر باہر کر دیتی ہے اور اس طرح پوری فضا پر حقیقی مساوات کا گہرا رنگ چھا جاتا ہے۔

(۴) روزہ مومن کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار کرتا ہے۔ جہاد میں اللہ کی رضا کے لیے بھوک کی، پیاس کی، بے آرامی کی مشقتیں جھیلنی پڑتی ہیں، اپنی دولت کو خرچ کرنا

---

[1] بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ ص۱۷۳ [2] بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الصیام

[3] بخاری، جلد اول، باب اجود ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یکون فی رمضان۔

پڑتا ہے، اپنی جان کو قربان کرنا ہوتا ہے ۔ اتنی کڑی مہم کی جرأت وہی کرسکتا ہے جس میں صبر اور برداشت کی قوت موجود ہو، اور جو یہ مشقتیں اُٹھا سکتا اور یہ قربانیاں دے سکتا ہو ۔ روزہ اس قوتِ صبر کے پیدا کرنے کا اور ان مشقتوں کا خوگر بنانے کا بہترین ذریعہ ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر رمضان کے مہینے کو " شَھْرُ الصَّبْرِ "، یعنی صبر کا مہینہ بھی فرمایا ہے[۱] اور روزے کو " آدھا صبر " قرار دیا ہے ۔

(۵) فرض روزوں کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ مِلّی اجتماعیت کے احساس کو بھی جِلا دیتا ہے، اور مسلمانوں کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ تم سب ایک ہی مشن کے عَلَم بردار ہو ۔ حکم ہے کہ ایک ہی متعینہ مہینے (رمضان) میں روزہ رکھا جائے ۔ ہدایت ہے کہ طلوعِ فجر سے ذرا دیر پہلے سحری کھائی جائے اور سُورج ڈوبتے ہی افطار کرلیا جائے ۔ اس طرح روزہ رکھنے کی شکل یہ بن جاتی ہے کہ سارے کے سارے لوگ ایک ہی مقررہ مہینے میں ایک ساتھ روزہ رکھتے ہیں ۔ تقریباً ایک ہی وقت میں سحری کھاتے ہیں اور ایک ہی وقت پر افطار کرتے ہیں ۔ کسی گروہ کے افراد کو ایک ہی مقصد کے حامل اور ایک ہی مہم کے سپاہی ہونے کا احساس دلانے کی یہ کیسی غیر معمولی اور کتنی لطیف تدبیر ہے کہ ان کا کھانا پینا تک بھی ایک ہی ساتھ ہو، ایک ہی نوعیت کا ہو اور ایک ہی مقصد کے تحت ہو ۔

حصُولِ مقاصد کی شرطیں

ہر دوسری عبادت اور عمل کی طرح روزے کے بھی یہ مقاصد اور ثمرات اسی وقت حاصل ہوسکتے ہیں جب کہ :-

(۱) وہ ضروری آداب اور شرائط کے ساتھ رکھا جائے ۔ نیت میں خلوص ہو، دل میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت کا اور اپنی عبدیت کا یقین ہو، آقائے حقیقی کی اطاعت کا

---

[۱] مشکوٰۃ، کتاب الصوم ۔

جذبہ ہو، رضائے الٰہی کی طلب ہو، فلاحِ آخرت کی آرزو ہو۔ یعنی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظوں میں روزہ "ایمان اور احتساب" کے ساتھ رکھا گیا ہو۔ اگر دل اللہ کی حاکمیت اور معبودیت کے یقین سے، اور نیت اجرِ آخرت کی طلب سے بے بہرہ ہو تو پھر روزہ، روزہ نہیں، فاقۂ محض ہے۔ دیکھنے اور کہنے میں تو اسلام کی عمارت کا ایک ضروری رکن تعمیر ہو رہا ہو گا مگر فی الواقع وہاں تعمیر نام کی کوئی چیز موجود نہ ہو گی۔

(۲) صرف فرض روزوں ہی کو کافی نہ سمجھ لیا جائے، بلکہ نفل روزے بھی رکھے جائیں۔ تاکہ ان مقاصد کی رہ رہ کر برابر یاددہانی ہوتی رہے جن کے لیے روزہ فرض کیا گیا ہے اور رمضان کے بعد دوسرے مہینوں میں بھی تربیتِ نفس کی اس موثر عملی تدبیر کا تھوڑا بہت اعادہ ہوتا رہے۔ نفل روزے کتنے اور کن دنوں میں رکھے جائیں، اس کے لیے احادیث میں مفصل ہدایتیں موجود ہیں۔ ہر شخص اپنی طاقت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ان میں سے مناسب انتخاب خود ہی کر سکتا ہے۔

۵۔ حج

اِسلام کا پانچواں اور آخری رکن "حج" ہے۔ حج کے لغوی معنی "زیارت کا ارادہ کرنے" کے ہیں۔ شریعت کی زبان میں حج کی عبادت کو "حج" اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں آدمی کعبہ کی زیارت کا ارادہ کرتا ہے۔

حج کا مرکز

حج ہر اس بالغ مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے۔ جو مکے تک آنے جانے کی قدرت رکھتا ہو۔ اگر کوئی شخص قدرت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتا تو وہ اپنے مسلمان ہونے کو جھٹلاتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:-

وَلِلّٰہِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ
اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ

عَنِ الْعَالَمِيْنَ۔ [1]

لوگوں پر یہ اللہ کا حق ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچ سکتا ہو وہ اس کا حج کرے۔ اور جس نے کفر کی روش اختیار کی تو وہ جان لے کہ اللہ سارے اہلِ جہانوں سے بے نیاز ہے۔

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

مَنْ لَّمْ يَحْبِسْهُ مَرَضٌ اَوْ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ اَوْسُلْطَانٌ جَائِرٌ وَّلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ اِنْ شَآءَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا۔ [2]

جسے کسی بیماری نے، یا کسی واقعی ضرورت نے یا کسی ظالم حکمراں نے روک نہ رکھا ہو، اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے، تو چاہے وہ یہودی مرے چاہے نصرانی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہتے سنا گیا کہ :۔

لِيَمُتْ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا، يَقُوْلُهَا ثَلٰثَ مَرَّاتٍ، رَجُلٌ مَّاتَ وَلَمْ يَحُجَّ وَوَجَدَ لِذٰلِكَ سَعَةً وَّخُلِّيَتْ سَبِيْلُهُ الخ [3]

اس شخص کو یہودی یا نصرانی مرنا چاہیے، یہ الفاظ آپؓ نے تین بار دُہرائے، جو سفر کی استطاعت اور راستے کا امن پانے کے باوجود بنا حج کے مر گیا ہو۔

اس کے برعکس اس شخص کے بارے میں، جس نے اس فریضے کو صحیح طریقے سے ادا کر لیا، وہ کچھ فرمایا گیا ہے جس سے زیادہ کی تمنّا بھی نہیں کی جا سکتی :۔

اَلْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهٗ جَزَآءٌ اِلَّا الْجَنَّةَ۔ [4]

مقبول حج کا بدلہ جنّت کے سوا اور کچھ نہیں۔

---

[1] سورہ آل عمران۔ ۹۷
[2] سنن کبریٰ، جلد ۴، باب امکان الحج
[3] ایضاً
[4] مسلم، جلد اول، باب فضل الحج والعمرۃ

مَنْ حَجَّ هٰذَا الْبَيْتَ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ ۔[1]

جس نے اس گھر کا حج کیا اور اس دوران اُس نے نہ تو کوئی شہوانی حرکت کی، نہ کسی معصیت کا ارتکاب کیا، وہ جب حج کرکے لوٹتا ہے تو ایسا پاک ہوتا ہے جیسا اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے پیدا کیا تھا۔

یہ جاننے کے لیے کہ اللہ اور رسولؐ نے حج کعبہ کو ایسی آخری درجے کی اہمیت کیوں دی ہے اور اس کے بغیر اسلام کی پیروی کا دعویٰ کیوں ناقابلِ اعتناء ہوتا ہے، اور وہ جنت کی ضمانت کیوں اور کس طرح ہے؟ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ حج کیا چیز ہے؟ دین کی رُوح سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اسلامی ذہن، اسلامی سیرت اور اسلامی کردار پیدا کرنے میں وہ کیا حصّہ لیتا ہے؟ اور انسان جس عبادت الٰہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اسے اس کی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنانے میں وہ کیا کردار انجام دیتا ہے؟ حج کے بارے میں ہمیں یہ باتیں دو چیزوں سے معلوم ہوسکیں گی:- ایک تو یہ کہ خود وہ کعبہ کیا چیز ہے جس کا حج کیا جاتا ہے؟ وہ کس لیے بنایا گیا ہے۔ اسلام سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ دوسری یہ کہ حج میں جو مراسم ادا کیے جاتے ہیں وہ کیا ہیں۔ اور اُن کے پیچھے کون سے تصورات کام کرتے ہیں؟ اگر ان باتوں کی وضاحت ہوجائے تو وہ سب کچھ آپ سے آپ نظر آجائے گا۔ جو حج کی اس بلند ترین اہمیت کا موجب ہے۔

کعبہ کی تعمیر اور اس کی اہمیت

پہلے کعبہ کی تعمیر اور اس کی حیثیت کو لیجیے۔ کعبہ کی تعمیر آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار برس پہلے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السّلام کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ (وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ[2])

---

[1] بخاری، جلد اول، باب فضل الحج المبرور [2] سورہ بقرہ - ۱۲۷

تعمیر کا حکم اور جگہ کا تعین، دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا تھا۔ (وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ[۱]) اور اسی وقت انھیں یہ ہدایت بھی کردی گئی تھی کہ جب یہ گھر بن جائے تو لوگوں میں منادی کرادینا کہ اس کا حج کرنا فرض ہے۔ (وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ الخ[۲])

اس گھر کی جو حیثیت اور غایت اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اس کا اظہار ان آیتوں سے ہوتا ہے:۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى۔[۳]

یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ[۴] (الخ)

یقیناً پہلا گھر، جو لوگوں کے لیے (مرکزِ عبادت کی حیثیت سے) بنایا گیا تھا، وہی ہے جو مکّے میں واقع ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ برکتوں والا اور سارے اہلِ جہان کے لیے ہدایت (کا سرچشمہ) ہے۔

وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَلَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْقَائِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔[۵]

اور جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر کی جگہ متعین کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرا کسی کو ساجھی نہ ٹھیرانا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں،

---

[۱] سورہ حج ۔ ۲۶ [۲] سورہ حج ۔ ۲۷ [۳] سورہ بقرہ ۔ ۱۲۵
[۴] سورہ آلِ عمران ۔ ۹۶ [۵] سورہ حج ۔ ۲۶

قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے (شرک کی آلودگیوں سے) پاک رکھنا۔

یعنی یہ گھر سراپا خیر و برکت ہے۔ ساری دنیا کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اللہ کے پرستاروں کا مرجع ہے۔ نماز قائم کیے جانے کی اصل جگہ ہے[1]، اور توحید خالص کا مرکز ہے۔ ذرا غور کیجیے تو محسوس ہوگا کہ یہ صفتیں آپس میں گہری مناسبت رکھتی ہیں، بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ دراصل ایک ہی جامع صفت کے مختلف پہلو ہیں۔ جو چیز توحیدِ خالص کا اصل مرکز ہوگی حقیقتاً نماز کی اصل جگہ بھی وہی ہوگی، اور جو چیز توحید اور نماز کا مرکز ہو کوئی شک نہیں کہ وہ سراپا ہدایت اور مجسّم برکت ہی ہوگی۔

کتاب کی پچھلی بحثوں میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اعتقادی طور پر توحید، اور عملی طور پر نماز یہی دونوں چیزیں حقیقتاً پورے دین کا مغز ہے۔ اس لیے کعبہ اگر توحید اور نماز دونوں کا مرکز ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ پورے دین کا مرکز ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اُسے صراحۃً "اپنا گھر" (بَیْتِیَ) فرمایا بھی ہے۔ جس کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ وہ اللہ کے دین کا گھر یا مرکز ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا یہ کعبہ، اللہ کے دین کا گھر اور اسلام کا مرکز کیوں اور کس طرح ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے ایک طرف تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی تعمیر کا پس منظر کیا ہے؟ دوسری طرف یہ کہ اس کی تعمیر کے بعد اس کے مقصدِ تعمیر کی خاطر عملی قدم کیا اٹھایا گیا؟

● کعبہ کی تعمیر کا پس منظر یہ ہے:

حضرت ابراہیمؑ کو جب ان کی قوم نے ہجرت پر مجبور کر دیا تو وہ مختلف علاقوں

---

[1] یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ کہیں بھی نماز پڑھی جائے ضروری ہے کہ رُخ اُسی گھر کی طرف ہو، تاکہ اگر نماز کے اصل مقام پر نماز پڑھنے کی آسانی میسّر نہیں تو کم از کم چہرے کا رُخ تو اُس طرف ضرور ہی رہے۔ "اصل مصلّی"، یعنی حقیقی مسجد یہی کعبہ ہے، اور دنیا کی دوسری تمام مسجدیں اس کی قائم مقام ہیں۔ (ص)

یں دعوتِ حق کی منادی کرتے ہوئے مکّے کی چٹیل وادی میں پہنچے۔ یہیں اس مشہور خواب کا واقعہ پیش آیا جس میں آپ نے اپنے اکلوتے فرزند (حضرت اسمٰعیلؑ) کو اپنے ہاتھوں ذبح کرتے دیکھا تھا۔ یہ خواب جب آپؑ نے اپنے جگر گوشے کو سنایا تو سعادت مند بچے نے کہا کہ "بابا جان! اللہ کا جو حکم ہو اس پر بے دریغ عمل کیجیے، یہ گردن اِن شاء اللہ صبر و رضا کی گردن ثابت ہو گی۔ باپ نے بیٹے کو زمین پر پچھاڑ کر چھُری گردن پر رکھ دی۔ ہاتھ چلنے ہی کو تھے کہ اوپر سے ندا آئی " ابراہیمؑ! بس ہاتھ روک لو، تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھا، ہم نے اسمٰعیل کو ایک بڑی قربانی کے عوض چھڑالیا۔" حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی مثالی آزمائشوں کی زندگی تھی۔ یہ ذبح کا واقعہ ان آزمائشوں کی آخری کڑی تھا۔ اس آخری اور سب سے بڑی آزمائش میں بھی جب آپؑ پورے اُتر چکے تو اب اجر پانے کا دَور شروع ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت آئی:-

اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔[1]

ابراہیم! میں تمہیں سارے انسانوں کا 'امام' بنا رہا ہوں۔

اور پھر 'امام بنانے' کی بندہ نوازی کا آغاز اس طرح ہوا کہ اُن اعلانوں اور ہدایتوں کے ساتھ، جن کے حوالے ابھی گزر چکے، آپ کو کعبہ کی تعمیر کا حکم ہوا۔

اس پس منظر کی، یعنی اس پورے واقعہ کی دو باتیں خاص طور پر نظر میں رکھنے کی ہیں:-

(۱) ذبح کا واقعہ مروہ کے مقام پر پیش آیا، جو کعبہ کی جگہ کی بغل میں واقع ہے، اور کعبہ اس جگہ سے صاف نظر آتا ہے۔

(۲) خواب کے بعد باپ اور بیٹے، دونوں نے تسلیم و رضا کے جس جذبے کے ساتھ اس اشارۂ غیبی پر عمل پیرا ہونے کا اقدام کیا تھا اس کی تعبیر اللہ تعالیٰ نے 'اسلام' کے لفظ سے کی ہے۔ (فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ[2])

---

[1] سورہ بقرہ - ۱۲۴

[2] سورہ صافات - ۱۰۳

● کعبہؑ کے مقصدِ تعمیر کی خاطر عملی قدم یہ اٹھایا گیا:۔
جس وقت کعبہ کی تعمیر شروع ہوئی اسی وقت اس کے مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں اس کے مقدس معماروں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کی:۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ [1]

خدایا! ہمارے عمل کو قبول فرما۔ یقیناً تو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ مالک! ہمیں اپنا "مسلم" (سچا فرماں بردار) بنا، اور ہماری اولاد میں سے ایک ایسا گروہ برپا کرنا جو تیرا "مسلم" (سچا فرماں بردار) ہو، اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، ہم پر کرم کی نظر رکھ، تو بلاشبہ نظرِ کرم فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس دعا سے معلوم ہوا کہ جس مقصد کی خاطر کعبہ بنایا گیا تھا اس کی تکمیل ایک ایسے گروہ کے ذریعے ہونے والی تھی جو انہی بزرگوں کی، دوسرے لفظوں میں حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی نظر میں رکھ لینے کی ہے کہ جس صفت سے اس گروہ کو متصف بنا کر پیدا کیے جانے کی دعا کی گئی تھی، اس کے لیے بھی جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ "مسلمہ" کا لفظ ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں اسلام والا۔

جب خانۂ کعبہ بن چکا تو ایسا نہیں ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ کو لے کر اپنے باقی اہل و عیال کے پاس، یا کسی اور آباد مقام پر واپس چلے گئے ہوں، بلکہ انھوں نے کیا یہ کہ اسی چٹیل میدان میں، اور اسی کعبہ کے پاس

---

[1] سورہ بقرہ۔ ۱۲۷

انھیں بسادیا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کا وہ سچّا فرماں بردار گروہ (اُمَّةً مُسْلِمَةً) جس کے برپا کیے جاتے کی انھوں نے دعا کی تھی۔ جب برپا کیا جائے تو اسی کعبہ کے پاس وجود میں آئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خود عرض کی تھی:۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ۔[۱]

پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک شاخ کو ایک بن کھیتی کے میدان میں، تیرے محترم گھر کے پاس بسا دیا ہے۔ خدایا! انھیں بسایا اس لیے ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں۔

"نماز قائم کریں"، یعنی تیری بندگی کریں، تیرے دین کی پیروی اور علم برداری کریں۔ چناں چہ اوپر یہ بات پوری طرح واضح کی جاچکی ہے کہ عملی طور پر نماز ہی دین کا مغز ہے اور نماز کی اقامت ہی دراصل پورے دین کی اقامت کی ضمانت ہے۔ اس لیے نماز کی اقامت گویا پورے دین کی اقامت ہوتی ہے۔

اولادِ اسماعیلؑ میں سے اللہ کا یہ سچّا فرماں بردار گروہ (اُمَّةً مُسْلِمَةً) عملاً کس طرح وجود میں آئے گا، اور اسے اللہ ربّ العزت کی سچی فرماں برداری (اسلام) کا طریقہ کیسے معلوم ہوگا؟ اس کے لیے آں جناب نے یہ دعا کی تھی:۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔[۲]

اے ہمارے پروردگار! ان کے اندر انھی میں سے ایک ایسا رسول برپا کیجیو جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، تیرے احکام بتائے، حکمت سمجھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ خلیل کی یہی دونوں دعائیں تھیں

---

[۱] سورہ ابراہیم۔ ۳۷ [۲] سورہ بقرہ۔ ۱۲۹

جو اللہ کے حضور مقبول ہو کر پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔ چناں چہ اس مقدس گروہ کا نام ہی "مسلم" اور "اُمّتِ مسلمہ" پڑا، اور اسی لیے پڑا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی اس دعا میں اُسے اسی لفظ اور نام سے یاد کر چکے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہی اس کا یہ نام رکھ چکے تھے۔ جیسا کہ سورۂ حج میں واضح بھی کر دیا گیا ہے۔ (هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ۔[1])

تعمیرِ کعبہ کے سلسلے کی ان ساری باتوں کو بیک نظر دیکھیے، کعبہ کا مرکزِ دین و سرچشمۂ اسلام ہونا دوپہر کے سُورج کی طرح آپ سے آپ روشن ہو جائے گا۔

حج کے مراسم

اب اُن مراسم پر ایک نظر ڈالیے۔ جو حج میں ادا کیے جاتے ہیں:۔

جب کوئی شخص حج کے لیے روانہ ہوتا ہے تو مکّے سے کافی دور پہلے ایک متعینہ مقام پر پہنچ کر حج کی باقاعدہ نیّت باندھتا ہے، جس کو "احرام" کہتے ہیں۔ احرام باندھتے وقت وہ پہلے غسل یا وضو کرتا ہے، پھر عام استعمال کے کپڑوں کے بجائے بن سلی ایک تہ بند اور ایک چادر پہن لیتا ہے۔ اس کے بعد دو رکعت نماز پڑھتا ہے۔ نماز پڑھ کر حج کی باضابطہ نیّت کا اعلان و اظہار کرتے ہوئے اپنے خدا کو مخاطب کرتا اور بلند آواز سے پکارتا ہے:۔

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔[2]

حاضر ہوں، میرے اللہ! میں حاضر ہوں۔ حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ کوئی شک نہیں کہ حمد تیرے لیے ہے، نعمت تیری ہے،

---

[1] سورہ حج۔ ۷۸

[2] بخاری، جلد اول، کتاب المناسک

بادشاہی تیری ہے، کوئی تیرا شریک نہیں۔

"لبیک لبیک"، کی اس پُکار کے ساتھ ہی وہ "احرام" کی حالت میں آجاتا ہے اور اب یہ پُکار اس کی زبان کا ورد بن جاتی ہے۔ ہر نماز کے بعد، ہر بلندی پر چڑھتے ہوئے ہر نشیب میں اُترتے ہوئے، ہر قافلے سے ملتے وقت، اور ہر صبح بیدار ہوتے ہی یہ کلمات اس کی زبان پر جاری ہوتے رہتے ہیں۔ احرام باندھ چکنے کے بعد اس کے لیے زیب وزینت اور عیش وعشرت کی ایک ایک چیز ممنوع ہو جاتی ہے۔ اپنے عام استعمال کے کپڑے وہ اُتار ہی چکا ہے، جو دو کپڑے، چادر اور تہ بند، اس کے جسم پر ہوتے ہیں ضروری ہے کہ وہ بھی سِلے ہوئے نہ ہوں، اور نہ کسی خوشبو دار رنگ سے رنگے ہوئے ہوں۔ اسی طرح وہ اب ٹوپی یا عمامے یا اور کسی چیز سے اپنے سر کو ڈھک نہیں سکتا۔ نہ مُنہ چھپا سکتا ہے۔ نہ بال بنوا سکتا ہے۔ نہ ناخن ترشوا سکتا ہے۔ نہ خوشبو لگا سکتا ہے۔ نہ نہانے میں صابون وغیرہ استعمال کر سکتا ہے۔ جنسی تعلقات کے قریب بھی نہیں جا سکتا۔ حتّٰی کہ اس کا تذکرہ بھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اسے شکار کرنے کی اجازت باقی نہیں رہ جاتی، بلکہ وہ کسی اور کو بھی شکار کی طرف اشارہ تک نہیں کر سکتا۔ اس حالت کے ساتھ وہ مکّے کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ دُور سے جوں ہی کعبہ دکھائی دیتا ہے پکار اٹھتا ہے "اللہ اکبر" (اللہ سب سے بڑا ہے) "لا الٰہ الّا اللہ" (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) مکّے میں داخل ہو کر سیدھا کعبہ پہنچتا ہے، درِ کعبہ کے قریب دیوار میں جو حجرِ اسود نصب ہے اس پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتا اور پھر اسے چومتا ہے۔ چومنے کے بعد کعبہ کا طواف کرتا یعنی اس کے اِردگِرد سات چکّر لگاتا ہے اس کے بعد مقامِ ابراہیم پر، یا کعبہ کے پاس اور جگہ نماز کی دو رکعتیں پڑھتا ہے۔ پھر باہر آتا ہے اور صَفا نامی پہاڑی پر، جو قریب ہی واقع ہے، جا چڑھتا ہے۔ چڑھ کر پہلے کعبہ پر نظر ڈالتا ہے اور پھر پُکارتا ہے اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) لا الٰہ الّا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) اس کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہے اور اپنے اللہ سے ہاتھ پھیلا کر جو مانگنا ہوتا ہے مانگتا ہے۔ پھر اس کے بعد نیچے اُترتا ہے، اور سامنے کی ایک دوسری پہاڑی، مروہ کی طرف

"سعی"، کرتا یعنی تیز تیز قدموں سے چلتا ہے۔ اس پر پہنچ کر پھر کچھ دیر تک اسی طرح تکبیر و تہلیل اور درود و دعا میں مشغول رہتا ہے جس طرح ابھی صفا پر مشغول رہ چکا ہے۔ اسی طرح کی "سعی" وہ سات بار کرتا ہے۔ اس سعی سے فارغ ہو چکنے کے بعد مکّے میں ٹھیر جاتا ہے، اور جیسی کچھ اسے توفیق ہوتی ہے کعبے کا طواف کیا کرتا ہے۔ جب ذی الحجّہ کی ساتویں تاریخ آتی ہے تو اس طرح کے تمام لوگ کعبے کی مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں، اور امام المسلمین ان کے سامنے خطبہ دیتا ہے۔ جس میں حج کے احکام و آداب اور اس کی رحمتیں اور برکتیں انھیں بتاتا ہے۔ آٹھویں تاریخ کو دن نکلنے پر سب لوگ منیٰ روانہ ہو جاتے ہیں، جو مکّے سے تین میل دُور واقع ہے۔ وہاں اگلے دن کی صبح تک ٹھیرتے ہیں۔ پھر عرفات کی طرف کوچ کرتے ہیں، جو مکّے سے بارہ میل دُور ایک وسیع میدان ہے۔ سارے لوگ اس وسیع میدان میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ سُورج ڈھلنے پر یہاں امام سب کے سامنے پھر خطبے دیتا ہے اور لوگوں کو ضروری امور کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے بعد ظہر ہی کے وقت میں ظہر اور عصر دونوں وقتوں کی نمازیں پڑھاتا ہے۔ نمازوں سے فارغ ہو کر لوگ ایک خاص انداز میں پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔ امام کا پڑاؤ "جبل الرحمۃ" نامی پہاڑ کے قریب ہوتا ہے وہ اپنی اونٹنی سے نیچے نہیں اُترتا، بلکہ اسی پر بیٹھا رہتا ہے۔ اس کا رُخ کعبے کی طرف ہوتا ہے جناب باری تعالیٰ میں گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگتا ہے۔ درمیان میں رہ رہ کر لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ پکارتا جاتا ہے۔ باقی سارے لوگ اس کے پیچھے یا اردگرد ٹھیرے ہوتے ہیں، اور سب کا رُخ کعبہ ہی کی طرف ہوتا ہے۔ امام اس موقع پر انہیں پھر خطاب کرتا ہے، اور پوری توجہ سے وہ اس کے ارشادات سُنتے ہیں۔ سُورج ڈوب چکنے پر یہاں سے واپسی ہو جاتی ہے، اور سب لوگ روانہ ہو کر مُزدَلفہ نامی مقام پر آپہنچتے ہیں، اور اپنی اپنی جگہیں لے کر ڈیرے ڈال لیتے ہیں۔ امام "جبلِ قُزَح" نامی پہاڑ کے قریب ٹھہرتا ہے۔ عشا کا وقت ہو چکنے پر مغرب اور عشا دونوں وقت کی نمازیں ایک ساتھ پڑھاتا ہے۔ یہ رات یہیں بسر ہوتی ہے۔ دسویں کی صبح نمودار ہونے پر منہ اندھیرے ہی فجر کی نماز ادا کر لی جاتی ہے جس کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ ذکر و استغفار میں مشغول

ہو رہتا ہے، اور رہ رہ کر لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ پکارتا رہتا ہے۔ جب بالکل اُجالا ہو جاتا ہے تو وہاں سے منیٰ کے لیے چل پڑتے ہیں۔ منیٰ پہنچ کر جَمْرَۃُ الْعَقَبَۃ، کو سات بار کنکریوں سے مارتے ہیں، اور اس طرح مارتے ہیں کہ ہر بار "اللّٰہُ اَکْبَر" کہتے جاتے ہیں۔ اب لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کہنے کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ کنکریاں مارنے کے بعد قربانی کرتے ہیں۔ پھر سر مُنڈاتے ہیں، اور حالتِ احرام سے نکل آتے ہیں۔ اب کعبہ کا پھر سات بار طواف کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر منیٰ جاتے ہیں، جہاں دو یا تین دن قیام کرتے ہیں، اور اس قیام کو اللہ کے ذکر اور دعا و استغفار میں گزارتے ہیں، اور ہر روز تینوں 'جمرات' کو سات سات بار تکبیر کے ساتھ کنکریاں مارتے ہیں۔ پھر کعبہ کے پاس واپس آجاتے ہیں۔ اور آکر اس کا آخری طواف کرتے ہیں۔ طواف کر کے درِ کعبہ کو بوسہ دیتے ہیں، حجرِ اسود اور بابِ کعبہ کے درمیانی حصّے (مُلتَزَم) کو اپنے چہرے اور اپنے سینے سے لگاتے ہیں، اور غلافِ کعبہ کو پکڑ کر خوب خوب دُعائیں مانگتے ہیں، التجائیں کرتے ہیں، روتے اور گڑگڑاتے ہیں۔ اور پھر اس حال میں اپنے گھروں کو واپس ہوتے ہیں کہ اللہ کے اس گھر پر محبت اور حسرت بھری نگاہیں تا دیر ٹکی رہتی ہیں۔

یہ ہے مراسمِ حج کی مختصر تفصیل۔ ان میں سے اکثر باتیں تو ایسی ہیں جو بہت کچھ واضح ہی ہیں مگر کچھ ایسی بھی ہیں جن میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا ایک خاص پس منظر ہے، اور ان کی معنویت اچھی طرح سمجھ میں اسی وقت آسکتی ہے جب یہ پس منظر بھی نگاہوں کے سامنے ہو۔ اس لیے کم از کم نمایاں اور اہم چیزوں کی حد تک تھوڑی سی یہ وضاحت بھی یہاں ضرور سُن لینی چاہیے:-

(۱) کعبہ:- جہاں تک کعبہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں ضروری معلومات تو اوپر مذکور ہو چکی ہیں۔

(۲) صَفا اور مروَہ:- صفا اور مروہ کے بارے میں قرآن مجید نے فرمایا ہے:-

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰہِ۔ —— (سُورہ بقرہ-۱۵۸)

بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

"اللہ کی نشانیوں میں سے" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کی نشانیاں ہیں۔ یہ دونوں مقامات اللہ کی بندگی کی نشانیاں کس طرح ہیں، یہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں تاریخ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جو بتاتی ہے کہ مروہ وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا تھا تاکہ اسے اللہ کی رضا پر قربان کریں۔ اس لیے اسے دیکھتے ہی فطری طور پر مومن کی نگاہوں میں "بندگی" اور "اسلام" کی وہ تصویر پھر جاتی ہے جسے اللہ کے خلیلؑ اور اللہ کے ذبیحؑ نے اپنے عمل سے کھینچا تھا۔

(۳) جمرات:۔ منیٰ کے میدان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین مقامات ہیں، جن میں سے ہر ایک کو جمرہ کہتے ہیں، اور تینوں کا اگر ایک ساتھ ذکر کرنا ہوتا ہے تو جمع کے اصول پر انھیں جمرات کہتے ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں تک ایک وقت جبشہ کے عیسائی حکمراں (ابرہہ) کی فوجیں کعبہ کو ڈھانے کے ارادے سے بڑھ آئی تھیں، اور پھر پتھروں سے ہلاک کر دی گئی تھیں۔

حج اور جذباتِ عبودیت

حج کے ان مراسم پر اگر گہری نظر ڈالیے تو ان میں کی ایک ایک چیز بندگی کی اُبھری ہوئی تصویر دکھائی دے گی:۔

احرام کا لباس، لباس نہیں ہوتا، بلکہ ایک طرف فقیری کے احساس کا، دوسری طرف فداکاری کے جذبے کا منہ بولتا نشان ہے۔ جس وقت ایک فقیر بے نوا اپنی جھولی لیے کسی داتا کے دربار میں، یا ایک جاں باز فوجی اپنی وردی پہن کر اور اپنے اسلحے لے کر میدانِ جنگ کی طرف جاتا ہے تو اس کے جذبات اور اس کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے الفاظ کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، بلکہ اس کی ہیئت ہی سب کچھ بتا اور سمجھا دیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح کعبے کی طرف جانے والے کی یہ ہیئت خود بولتی ہے کہ وہ اللہ ہی کے در کا بھکاری ہے، اور ساتھ ہی اس کی رضا کے سوا ہر چیز سے بے نیاز بھی ہے۔ دنیا کا ہر بندھن وہ کاٹ چکا ہے۔ اسی کے تصور میں ڈوبا ہوا اور اسی کے اشاروں پر

نثار ہو جانے کے اشتیاق میں کھویا ہوا ہے۔ وہ اللہ کا فقیر بھی ہے اور کفن بردوش سپاہی بھی۔

اس کے علاوہ احرام کا یہ لباس ایک اور عظیم حقیقت کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔ دُنیا کی مختلف قوموں کے افراد جب اپنا اپنا وطنی لباس اُتار کر ایک ہی قسم کے کپڑے پہن لیتے ہیں، اور ایک ہی نعرہ۔ "حاضر ہوں، میرے اللہ میں حاضر ہوں"، کا نعرہ، سب کی زبانوں سے بلند ہو رہا ہوتا ہے تو اسلامی قومیت، مجاز کا پیکر اختیار کر لیتی ہے، اندھے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اسلام کا رشتہ سارے مادّی رشتوں سے کتنا زیادہ مضبوط ہے، اور یہ کہ انسان، انسان کو جوڑنے والا حقیقی رشتہ صرف وہی ہے۔

جس وقت اُتّر، دکھن، پُورب، پچھم، ہر طرف سے فضا میں مسلسل یہ آوازیں گونجتی ہیں کہ میَں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کعبے کے معمارؑ نے اپنے آقا کے حکم (اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ[1]) کی تعمیل میں حج کی جو منادی کی تھی، یہ آوازیں اسی کا جواب ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی یہ منادی یقیناً چند ظاہری رسموں کے ادا کرنے کی منادی نہ تھی، بلکہ اپنے آپ کو رُوحِ ایمان اور حقیقتِ اسلام میں ڈھال لینے کی منادی تھی۔ اس لیے اس منادی کا جواب، لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کا یہ نعرہ بھی محض چند لفظوں کو فضا میں بکھیر دینے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ اپنے آپ کو اپنے مالک کے حوالے کر دینے کی ایک بے چین خواہش کا اظہار ہے۔ یہ اعلان ہے اس بات کا کہ غلام اپنے آقا کے حکموں پر کان لگائے اس کے حضور بڑھے لپکے چلے آ رہے ہیں۔

جوں ہی کعبے پر نظر پڑتی ہے، تصوّر کی نگاہوں میں وہ سب کچھ پھر جاتا ہے جو اس کی تعمیر سے وابستہ ہے۔ انسان کو یاد آ جاتا ہے کہ میں اُسی اُمّت کا ایک فردِ ہوں جس کے ظہور کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دُعا کی تھی، جس کا نام انھوں نے 'اُمّتِ مسلمہ' رکھا تھا، جس کی حیثیت یہ قرار دی گئی تھی کہ وہ اللہ کے لیے اور اس کے دینِ توحید کے لیے

---

[1] سورہ الحج۔ ۲۷

وقف ہوگی۔

حجرِ اسود پر جب وہ اپنے دونوں ہاتھ رکھتا ہے تو دل پر یہ حقیقت نقش ہوجاتی ہے کہ یہ اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے رہا ہوں، بندگی و غلامی کا عہد تازہ کررہا ہوں، اقرار کررہا ہوں کہ اس عہد سے کبھی نہ پھروں گا۔ پھر ہاتھ رکھنے کے بعد جب اسے بوسہ دیتا ہے تو اب ایک اور شعور بیدار ہوجاتا ہے، ذہن میں یہ تصوّر اُبھر آتا ہے کہ جس ہستی سے اس وقت بندگی کا عہد تازہ کررہا ہوں، وہ میرا حقیقی حاکم اور آقا بھی ہے اور حقیقی محبوب و مقصود بھی ہے۔ اس لیے اس کے دربار کی حاضری کے وقت ضروری ہے کہ اس کی آستاں بوسی بھی کروں۔

طواف ہے کیا ہے؟ فقط رضائے الٰہی کی خاطر اپنے آپ کو قربان کردینے کا والہانہ جذبہ۔ جب مردِ مومن کعبہ کے ارد گرد چکّر لگاتا ہے تو "شمع و پروانہ" کا شاعرانہ تخیّل ایک واقعہ بن جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کے دربار میں آکر مجسّم فدویت اور سراپا کیف و سرمستی بن گیا ہے، اسے خود اپنے وجود کی خبر نہیں، وہ اپنے مالک کے اشاروں پر نثار ہوجانے کے لیے بےتاب ہے، اور اپنا سب کچھ تج کر اسے پالینا چاہتا ہے۔

پھر یہ طواف کچھ اور بھی بتاتا ہے۔ کالے اور گورے، عربی اور عجمی، سامی اور آریائی غرض ہر رنگ، ہر نسل، ہر زبان اور ہر قومیت کے لاکھوں انسانوں کا یہ بھاری گروہ جب ایک ہی سے لباس پہنے اور ایک ہی سے جذبات لیے کعبہ کے گرد گھومتا ہے تو یہ منظر یقین دلاتا ہے کہ جس طرح اللہ ایک ہے اور اللہ کا دین ایک ہے، اسی طرح اس کے دین پر ایمان رکھنے والے بھی، ظاہر کے ہزار اختلافات کے باوجود حقیقت میں ایک ہی ہیں، سب کا محور ایک ہی ہے، سب ایک ہی مرکز سے وابستہ ہیں اور سب کی وفاداریاں اور جاں نثاریاں ایک ہی ذاتِ حق کے لیے وقف ہیں۔

صفا اور مروہ کے درمیان کی "سعی" اس عزم کا اظہار ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السّلام کا راستہ ہی ہمارا راستہ بھی ہوگا، اور اس راستے پر

چلنے میں ہم اپنے قدموں کو سُست نہ ہونے دیں گے۔ اُنھوں نے اس سرزمین پر اپنے عمل سے "اسلام" کی جو شرح کی تھی، ہمارے نزدیک بھی اسلام اس سے کم کسی چیز کا نام نہ ہوگا۔ مَروہ کی "شہادت گاہ" تک بار بار ہمارا دوڑ کر پہنچنا یہ ذہن نشین کرلینے کے لیے ہے کہ ہمارے سفرِ حیات کا آخری مرحلہ بھی ایسی ہی کوئی شہادت گاہ ہونی چاہیے۔

ساتویں[۲] ذی الحجہ سے لے کر دسویں تک سارے حاجیوں کا، ایک امام کی قیادت میں، یہ اجتماعی کوچ اور اجتماعی قیام — آج سب کے سب مسجدِ حرام میں اکٹھے ہیں، کل منیٰ کے میدان میں جمع ہیں، اگلے دن عرفات میں خیمہ زن ہیں، رات مُزدلفہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں، صبح ہوتے پھر منیٰ آپہنچے ہیں، اس دوران کبھی امام کے خطبے سُنتے ہیں، کبھی لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ پکارتے ہیں، نمازیں جمع کرکے، یعنی عجلت کی پڑھتے ہیں — یہ ساری باتیں واضح طور پر ایک منظّم فوجی زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہیں، اور لاکھوں بندگانِ خدا کا یہ احرام پوش گروہ کفن بردوش سپاہیوں کا ایک لشکرِ جرار نظر آتا ہے — یہ صورتِ حال یاد دلاتی ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کے تصور کے ساتھ منظّم اجتماعیت اور فوجی زندگی کا تصوّر بالکل لازم ہے، اور اس کی ساری توانائیاں اللہ کی بندگی کے لیے اور اس کے دین کی نصرت و اقامت کے لیے وقف ہیں۔

جمرات[۸] کے ستونوں پر کنکریاں مارنا پتھروں کی اُس بے پناہ بارش کی یادگار ہے جس نے اَبرہہ کے لشکر کو انھی مقامات پر تہس نہس کرکے رکھ دیا تھا۔ ان مقامات پر کنکریاں مارنا، اور ہر کنکری کے ساتھ "اَللّٰہُ اَکْبَرُ"، کہہ کر اللہ کی کبریائی کا اعلان کرتے جانا گویا اپنے اس عزم اور اس فیصلے سے دنیا کو خبردار کرنا ہے کہ کوئی اللہ کے دین پر ترچھی نگاہ ڈالے گا ہم اس کا مُنہ پھیر دیں گے اور جو اس کی بنیادیں ڈھانا چاہے گا ہم اُسے پیس کر رکھ دیں گے۔

قُربانی[۹] وہ "ذِبحِ عظیم" ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ

قرار دیا ہے (وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ[1]) اس لیے اللہ کی راہ میں جانور کو قربان کرنا دراصل اپنے آپ کو قربان کرنے کا قائم مقام ہے۔ یہ اس بات کا خاموش اقرار ہے کہ ہماری جان اللہ کی راہ میں نذر ہو چکی ہے اور وہ جب اسے طلب کرے گا ہم بلا تامّل پیش کر دیں گے۔ یہ جانور کا خون بہانا دراصل اس امر کی علامت اور پیش کش ہے کہ اللہ کی رضا کا جب بھی تقاضا ہوگا ہم اپنا خون تک بہا دینے کے لیے تیار ہیں۔ ورنہ جانور کو ذبح کرنا بجائے خود نہ دین ہے نہ تقویٰ (لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔[2])

مراسمِ حج کے پیچھے کام کرنے والی ان ساری حقیقتوں کو دیکھیے، بندگیِ رب کا کون سا جذبہ ہے جو اس کے اندر لہریں نہیں لے رہا ہے۔ خصوصاً جذبۂ جہاد، جو بندگی کی معراجِ کمال ہے، وہ تو ان سارے اعمال میں اس طرح سمویا ہوا ہے کہ یہ پورا حج جہاد کی ایک بہت بڑی علامتی مشق نظر آنے لگتا ہے، ذہنی حیثیت سے بھی اور عملی حیثیت سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عائشہؓ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "ہم جہاد کو سب سے افضل عمل پاتے ہیں، اس لیے ہم عورتیں بھی کیوں نہ یہ فریضہ بجالائیں؟" تو آپؐ نے فرمایا:۔

لَكُنَّ اَفْضَلُ الْجِهَادِ حَجٌّ مَّبْرُوْرٌ۔[3]

تم عورتوں کا سب سے افضل جہاد وہ حج ہے جو کوتاہیوں سے پاک ہو۔

حج کی شانِ جامعیّت

ان باتوں کے علاوہ اگر حج کے مراسم کو ایک اور پہلو سے دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ

---

[1] سورہ صافات۔ ۱۰۷ [2] سورہ حج۔ ۳۷

[3] بخاری، جلد اول، کتاب المناسک

یہ حج اگرچہ کہنے کو ایک عبادت ہے، مگر فی الواقع اس میں ہر عبادت اور ہر عملِ خیر کی شان موجود ہے۔ چناں چہ:-

وہ نماز[۱] بھی ہے، کیوں کہ نماز کی حقیقت اللہ کا ذکر ہے، اور آپ نے دیکھا کہ حج ذکرِ الٰہی سے بھرا ہوا ہے۔

وہ زکوٰۃ[۲] بھی ہے، اس لیے کہ ہر حج کرنے والے کو حکم ہے کہ وہ قربانی کا گوشت غریبوں کو کھلائے (وَ اَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِیۡرَ[۱]) اس کے علاوہ یہ بات تو بالکل ظاہر ہی ہے کہ محض اللہ کی خاطر اپنی دولت خرچ کیے بغیر حج کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور زکوٰۃ کی حقیقت بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اللہ کی خاطر اپنی دولت خرچ کی جائے۔

وہ روزہ[۳] بھی ہے، اس لیے کہ جنسی ملاپ روزے میں اگر صرف دن میں ممنوع ہے تو حج کے دوران راتوں میں بھی ممنوع رہتا ہے۔ رہا کھانے پینے کا معاملہ، تو روزے کی طرح اگرچہ حج میں کھانا پینا منع نہیں ہے، مگر اس کے باوجود اس میں زیب وزینت وغیرہ کی جو دوسری بہت سی پابندیاں عائد رہتی ہیں وہ بڑی حد تک اس ممانعت کی قائم مقام بن جاتی ہیں۔ اس طرح نفس کی خواہشوں کو کنٹرول کرنے کی مشق جس طرح روزے میں ہوتی ہے اسی طرح حج میں بھی ہوتی ہے۔

وہ توحید[۴] کا معلّم بھی ہے۔ کیوں کہ کعبے کی تعمیر ہی توحید پر ہوئی ہے، اور اسے دیکھتے ہی مومن کے دل میں وحدانیت کی رُوح جاگ اُٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ لَبَّیۡکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیۡکَ کی مسلسل پکار، حجرِ اسود کا بوسہ، طواف، سعی، قربانی، غرض حج کے کتنے ہی افعال ایسے ہیں جو توحید کے جذبات سے انسان کو سرشار کرتے جاتے ہیں۔

وہ آخرت[۵] کی یاددہانی بھی ہے۔ کیوں کہ جمرات کے ستون اَبرہہ کا انجام یاد دلاتے ہیں، جو قانونِ جزا کی ایک کھلی ہوئی شہادت ہے۔

وہ ایمانی[۶] صفات کا ـــــ حبِّ الٰہی کا، صبر کا، رضا کا، فقر کا، توکل کا، دُنیا

---

[۱] سورہ حج - ۲۸

سے بے رغبتی کا، آپس کی ہم دردی کا، انسانی مساوات کا ــــ ایسا درس دیتا ہے جو اپنی نظیر آپ ہے۔

حج کے بارے میں ضروری تفصیلات سامنے آ چکیں۔ انھیں دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اس عبادت سے بے پروا شخص کے اندر بھی دینی زندگی موجود ہو سکتی ہے! ایمانی نفسیات سے اس بے پروائی کا یقیناً کوئی میل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے استطاعت کے باوجود بھی اگر کوئی 'مسلمان' اپنے دین و ایمان کے اس مرکز کی طرف نہ کھنچا تو کوئی شک نہیں کہ اس کا اسلام بے ستون ہی رہے گا۔ اسی طرح اس بات میں بھی کوئی شک نہ ہونا چاہیے کہ جب کسی نے اس عبادت کو اپنے بس بھر اس طرح ادا کر لیا جس طرح کہ اسے ادا کیا جانا چاہیے، اس نے اپنے دین کو ایک اور مضبوط ترین بنیاد پر قائم کر لیا۔

ارکانِ اسلام پر ایک مجموعی نظر

یہ ہیں اسلام کے بنیادی اعمال، اور اُن کی حقیقتیں، غایتیں اور حکمتیں۔ ان پر جو شخص بھی گہری نظر ڈالے گا صاف محسوس کرے گا کہ یہ اعمال صرف چند نیکیاں اور عبادتیں نہیں ہیں، بلکہ نیکی اور عبادت کے سرچشمے بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، انسان کے اندر بندگی کا احساس اُبھارنے اور اسے مکمل کرنے میں بڑا اہم حصّہ لیتا ہے اور ایسا حصّہ لیتا ہے جو اسی کے لیے مخصوص بھی ہے۔ کوئی دوسرا عمل اس کی قائم مقامی نہیں کر سکتا۔ اور پھر یہ سب مل کر مومن کو ایک ایسا ذہن عطا کرتے ہیں جو اسلام کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہوتا ہے، ایک ایسا دل عطا کرتے ہیں جو دین کے حکموں پر برابر کان لگائے رکھتا ہے، ایک ایسی رُوح عطا کرتے ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب سے سرشار ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کے نتیجے میں وہ اللہ کی اطاعت گزاری کے لیے ایسا مستعد ہو رہتا ہے کہ اس کی جناب سے جو حکم بھی ملے اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑے۔ اس کے

دِل کی زمین جُت کر اور کھاد اور پانی پاکر اس طرح تیار ہو جاتی ہے کہ دینی ہدایات کا جو تخم بھی اس میں ڈالا جائے اسے فوراً قبول کرلے اور اسے نشو و نما دینے کے لیے اپنا عمل شروع کر دے۔ اسی بنا پر جو انھیں ''اسلام کے ستون'' یعنی دین کے باقی اجزاء کے لیے بھی مدارِ حیات قرار دیا گیا ہے۔ یقیناً یہ ایک بہترین تعبیر تھی جو ان اعمال کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی ہے۔

نظامِ حیات

اِسلام کی ان اعتقادی اور عملی بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد اب آئیے اس دین کے پورے وجود کو سمجھ لیں۔ جس طرح کسی درخت میں پتےّ، پھول اور پھل اس کے بیج کے طبعی تقاضے کے مطابق ہی نکلتے ہیں، اسی طرح کسی دین کی تعلیمات کی نوعیت بھی ٹھیک ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ اس کا بنیادی تصوّر چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کسی دین کی تعلیمات دراصل اس کے بنیادی تصوّر ہی کا پرتو ہوا کرتی ہیں۔ اس لیے یہ جاننے کے لیے کہ اسلامی تعلیمات کا مکمل خاکہ کیا ہے، پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ اسلام کا دینی تصور کیا ہے؟

دین کے مختلف تصورات

دنیا میں اس وقت عام طور سے تین تصور پائے جاتے ہیں:۔

(۱) ایک تو یہ کہ یہ دنیا انسان کے لیے حقیقتاً ایک قید خانہ ہے۔ اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کے اندر جو مادّی خواہشیں پائی جاتی ہیں وہ اس پنجرے کی تیلیاں ہیں۔ انسان نجات اسی وقت پا سکتا ہے جب وہ اس قید خانہ کی دیواروں کو خود اپنے ہاتھوں توڑ ڈالے، اور اس پنجرے سے اپنی رُوح کو آزاد کرالے۔ یعنی وہ دنیا چھوڑ دے، بستیوں سے دور نکل جائے اور کسی گوشے میں اپنے خدا سے لَو لگا کر بیٹھ جائے۔ اپنی جبلّی خواہشوں کو دبا دبا کر کچل ڈالے، اور فنا کر کے رکھ دے۔ صرف اسی شکل میں اس کی رُوح کے اُوپر سے وہ

پردہ ہٹ سکتا ہے۔ جو اُسے خدا کے جلووں کو دیکھ پانے اور اس کی جناب تک رسائی حاصل کر لینے سے روکے ہوئے ہے۔ اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ ریاضتیں کر کے مایا کے اس جال سے باہر نکل آئے۔

دین اور خدا پرستی کا یہی نظریہ ہے جسے "رہبانیت" یا "یوگ" کہا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا تصور یہ ہے کہ انسان کو دنیا سے مُنہ موڑ لینے اور اپنے نفس کو مار ڈالنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اسے دنیا کو برتتے ہوئے اور اپنی جبلّی خواہشوں کو معقول حدود کے اندر پورا کرتے ہوئے خدا کی عبادت کرنا چاہیے۔ رہے دنیوی معاملات اور مسائل، تو صرف انفرادی زندگی کی حد تک دین اسے متعینہ ہدایتیں دیتا ہے جن کی اسے پوری پوری پابندی کرنی چاہیے۔ باقی زندگی میں وہ آزاد ہے۔ کیوں کہ عبادت، فرد کا کام ہے، جماعت کا نہیں۔ اس لیے دین بھی انسان اور خدا کے درمیان کا ایک نجی معاملہ ہے، جو زندگی کے عام اجتماعی معاملات اور مسائل سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ نہ اسے کوئی تعرض کرنا چاہیے۔ ان مسائل میں انسان کو اختیار ہے، وہ جو راستہ چاہے اختیار کرے، اور زندگی کا جو نظام چاہے اپنائے۔ خدا اور مذہب کو اس سے کوئی بحث نہیں۔

(۳) تیسرا تصور یہ ہے کہ دنیا چھوڑ دینا اور نفس کو مار ڈالنا بھی غلط، اور بندگی کو صرف فرد کا کام، اور دین کو انسان کی صرف نجی زندگی کا معاملہ سمجھنا بھی غلط۔ صحیح بات یہ ہے کہ انسان کی عبادت گاہ ہو یا اس کا گھر، اس کے کھیت ہوں یا اس کے بازار، اس کے معاشی ادارے ہوں یا اس کے سیاسی دائرے، یہ ساری کی ساری جگہیں دین کے فرائض اور بندگی کی ذمّہ داریاں ادا کرنے کی جگہیں ہیں۔ اُن میں سے کسی ایک جگہ سے بھی انسان نہ تو بھاگ سکتا ہے نہ اس میں اپنی من مانی کر سکتا ہے۔ اسی طرح اسے جتنی قوتیں دی گئی ہیں، وہ سب اسی بندگی کے کام کی پوری پوری انجام دہی کی خاطر ہی دی گئی ہیں۔ اس لیے ان میں سے کوئی قوت نہ کچل ڈالنے کی ہے، نہ آزاد چھوڑ دینے کی۔ صحیح دین داری اور خدا پرستی یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی، انفرادی سے لے کر اجتماعی تک، احکامِ الٰہی کے تحت گزارے۔ وہ عبادت گاہ میں اگر اللہ ربّ العالمین کی پرستش کرتا ہے۔ تو اس سے باہر بھی وہی کچھ کرے جسے کرنے کا

اس نے حکم دیا ہے، اور اس طرح اس کی دنیوی زندگی کا نظام، پورا کا پورا، وہی ہو جو اس کے مالک کو پسند ہے۔

اِسلام میں رہبانیت نہیں

ان تینوں تصورات دین میں سے جہاں تک پہلے تصوّر کا تعلق ہے، اسلام یقینی طور پر اس طرح کا کوئی دین نہیں۔ اس کی ایک ایک بات سے اس تصور کی تردید ہوتی ہے، اور اس تردید میں اس کی وہ اعتقادی اور عملی بنیادیں سب سے آگے ہیں جن سے ہم ابھی تعارف حاصل کر چکے ہیں۔ چناں چہ ان سے واضح ہو چکا ہے کہ :۔

(الف) اسلام میں اللہ کا تصوّر صرف محبوب و مطلوبِ حقیقی کا تصوّر نہیں ہے، بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ وہ انسان کا حقیقی فرماں روا اور حقیقی قانون ساز بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ترکِ دنیا نفس کُشی اور گیان دھیان کے ذریعے خدا تک پہنچ جانے کا نظریہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب وہ انسان کا صرف مطلوب اور مقصود ہو، اور اس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ لیکن جب حقیقت یوں نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اس کا فرماں روا اور قانون ساز بھی ہے، تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کے لیے اس کے کچھ احکام اور قوانین بھی ہوں گے جن کی اسے اطاعت کرنی چاہیے۔ اس لیے انسان کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول رہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ زندگی کے میدان میں آئے اور ان احکام کی اطاعت کر کے فرماں بردار رعیت ہونے کا ثبوت دے۔

(ب) اسلام کی تعمیر جن پانچ "ستونوں" پر ہوئی ہے، ان میں سے اکثر کی، نماز، زکوٰۃ اور حج کی، ٹھیک ٹھیک ادائی کے لیے کسی نہ کسی قسم کی اجتماعیت بہرحال ضروری ہے۔ تنہائی کے گوشے میں اجتماعیت کا کوئی وجود نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے اس کے اندر سمٹے رہنے سے ان بنیادی عبادتوں کی صحیح ادائی بھی نہیں ہو سکتی۔ غور کیجیے جس گوشۂ تنہائی میں اسلام کی بنیادیں بھی ٹھیک طور سے نہ اٹھائی جا سکتی ہوں اس میں پورے اسلام کی تعمیر کس طرح ممکن ہو سکتی ہے؟

(ج) اسلام کے یہ ستون اصلاً پرستش ہونے کے باوجود دین کی بہت سی اجتماعی قدروں اور ملّی مصلحتوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس بنا پر انھیں الگ الگ ادا کر لینے کے بجائے اجتماعی شکل میں ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ عیاں ہوتا ہے کہ اسلام کی ان عملی بنیادوں سے دین اور خدا پرستی کے جس مزاج کا اظہار ہوتا ہے وہ گوشہ گیری اور نفس کُشی کے طریقے سے کسی طرح میل نہیں کھا سکتا۔ دوسری طرف یہ کہ اگر زندگی کی اجتماعی فضا سے ہٹ کر بطور خود نماز روزے ادا کر بھی لیے گئے تو اس سے وہ سب مصلحتیں اور فائدے ہرگز حاصل نہ ہو سکیں گے جنھیں ان عبادتوں کے ذریعے شریعت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ایسی حالت میں ان مخصوص اور بنیادی عبادتوں کی حد تک بھی اس خدا پرستی کا حق کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا جسے اسلام خدا پرستی کہتا ہے۔

(د) ان پانچ چیزوں کو 'اسلام کے ستون' کہا گیا ہے، نہ کہ 'کُل اسلام' — اس کے معنی بداہتہً یہ ہیں کہ اسلام صرف انھی پانچ چیزوں کا نام نہیں ہے، بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ کیوں کہ ستونوں کی غیر معمولی اہمیت اور اُن کا ممتاز مرتبہ اپنی جگہ پر، مگر کوئی عمارت صرف ستونوں یا دیواروں کا نام نہیں ہوا کرتی، اور نہ آج تک ستونوں کی کسی تعداد کو "عمارت" سمجھا گیا ہے۔ کسی تعمیر کو "عمارت" سمجھنے اور کہنے کا موقع تو اسی وقت آتا ہے جب دیواروں پر چھت ڈالی جا چکی ہو۔ یعنی دیواریں اور چھت دونوں مل کر عمارت کہلاتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسلام کی بھی کوئی 'چھت' ہو، جس کے لیے یہ پانچوں چیزیں 'ستون' بن سکیں، اور پھر یہ سب مل کر اسلام کی 'عمارت' کی شکل اختیار کر سکیں۔ واضح بات ہے کہ اسلام کی یہ "چھت" اس کی وہی تعلیمات ہوں گی جو ان پانچ چیزوں کے علاوہ ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان تعلیمات میں سے بے شمار ایسی بھی ہیں جن کا تعلق دُنیا کی مصروف زندگی سے ہے، اور تنہائی کے سنسان گوشوں میں ان پر عمل ہو سکنا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے خشکی میں تیرنا۔ اس لیے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اسلام کے بنیادی اعمال کی ٹھیک ٹھیک ادائی ریاضت کے گوشوں میں بھی ہو سکتی ہے، تب بھی یہ ادائی اسلام

کی پیروی کا حق ادا ہو جانے کے ہم معنیٰ کسی طرح نہیں ہو سکتی ۔ کیوں کہ صرف ان چار پانچ چیزوں کا حق ادا ہو جاتا اور بات ہے ، اور پورے اسلام کا حق ادا ہو جانا بالکل دوسری بات ہے ۔ صرف انہی احکام کی بجا آوری پورے اسلام کی بجا آوری اسی وقت ہو سکتی تھی جب اسلام ان پانچ چیزوں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا ۔ لیکن معلوم ہو چکا کہ ایسا سمجھنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ۔

یہ ساری حقیقتیں ، جو اسلام کی اعتقادی اور عملی بنیادوں کے اندر ہی موجود ہیں ، صاف صاف اعلان کرتی ہیں کہ اسلام کا رہبانیت سے ، اور رہبانیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ۔

اس بات کے ثبوت میں قرآن و حدیث کی بعض شہادتیں بھی سن لیجیے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ [1]

اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ۔

حضرت عثمان رضؓ بن مظعون نے جب خصّی ہو جانے کی اجازت مانگی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کرتے ہوئے فرمایا :-

إِنَّ اللّٰهَ أَبْدَلَنَا بِالرَّهْبَانِيَّةِ الْحَنِيفِيَّةَ السَّمْحَةَ ۔ [2]

ہمیں اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کے بجائے آسان اور خالص ابراہیمی دین عطا فرمایا ہے ۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں پر ، جنھوں نے رہبانیت کو دین اور خدا پرستی کا کمال سمجھ کر اپنا رکھا تھا ، تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :-

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ [3] ۔ الخ

---

[1] نیل الاوطار ، جلد ۶ ، کتاب النکاح ۔ [2] نیل الاوطار ، جلد ۶ ۔

[3] سورہ حدید ۔ ۲۷ ۔

اور رہبانیت جسے انھوں نے خود ایجاد کرلیا ہے، ہم نے انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔

معلوم ہوا کہ نہ صرف اسلام میں، بلکہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی شریعت میں بھی رہبانیت کی تعلیم نہیں دی گئی تھی۔ جنھوں نے بھی خدا پرستی کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا، کلیتہً اپنے جی سے گھڑ کر اختیار کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اللہ کے دین کا مزاج کبھی بھی رہبانیت کے فلسفے سے ہم آہنگ نہیں رہا۔

جس طرح دین کا مزاج رہبانیت کو برداشت نہیں کرتا، اور جس طرح اس کے بنیادی عقائد و اعمال سے اس کی مخالفت ٹپکی پڑتی ہے، جیسا کہ چاہیے، ٹھیک یہی حال اس کی تفصیلی تعلیمات کا بھی ہے۔ چناں چہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اُس طرزِ عمل کی ممانعت فرما رکھی ہے جو رہبانیت کا طرزِ عمل تھا یا اس کی طرف لے جانے والا بن سکتا تھا۔ مثلاً نکاح سے بچنا۔ خصّی ہونا، ہمیشہ مسلسل روزے رکھنا، روزے کے دوران رات کو بھی کچھ نہ کھانا پینا، قوتِ گویائی کو معطل رکھنا، اس طرح کی شب بیداریاں کرنا جن سے جسم ضروری آرام سے اور اہل و عیال اپنے حقوق سے محروم ہو جائیں — وغیرہ۔

اِسلام صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں

مذہب کا دوسرا تصوّر بھی اسلام سے کوئی ہم آہنگی نہیں رکھتا۔ یعنی وہ اس طرح کا بھی دین نہیں ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان کا بس ایک نجی معاملہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات لازماً انفرادی زندگی کے مسائل تک ہی محدود ہوتیں۔ وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا، نماز روزے کا حکم دیتا، چند اخلاقیات کی تلقین کر دیتا، کچھ معاشرتی ہدایتیں دے دیتا اور پھر خاموش ہو رہتا۔ مگر قرآن اور سُنّت کا صفحہ صفحہ گواہی دیتا ہے کہ صورتِ واقعہ یہ نہیں ہے۔ اسلام کی مسندِ ارشاد عبادت گاہوں اور زندگی کے محدود حلقوں ہی میں بچھی ہوئی دکھائی نہیں دیتی، بلکہ وہ بازاروں، کاروباری

اداروں، معاشی میدانوں، تمدن اور معاشرت کے دائروں، سیاست اور حکومت کے ایوانوں، غرض زندگی کے ہر دائرے میں ہدایتیں دیتا، کچھ باتوں سے روکتا اور کچھ باتوں کا امر کرتا نظر آتا ہے۔ اور ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو وہ "دین سے زائد" کہتا ہو۔ مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ زانی کو سَو کوڑے مارو۔ اس کا یہ حکم صریح طور پر ایک ایسا حکم ہے جس کا تعلق پولیس اور عدالت اور حکومت سے ہے، اور اس لیے وہ بداہتہً اجتماعی زندگی کا معاملہ ہے۔ اس حکم کی حیثیت اور اس کے نفاذ کے بارے میں کہتا ہے کہ "اللہ کے دین کے معاملے میں ان زانیوں کے لیے رحم کا جذبہ تمہارا دامن نہ پکڑنے پائے"۔ (وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ[1]) اس ارشاد کے لفظوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک کوڑے مارنے کا یہ حکم "اللہ کے دین" کا ایک جزو ہے، نہ کہ اس سے خارج یا زائد کوئی چیز۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ "سال کے چار مہینے حرمت والے ہیں (مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ[2])، ان میں جنگ کرنا جائز نہیں۔ یہ ہدایت واضح طور پر جنگی قوانین سے تعلق رکھتی ہے، اور ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ اجتماعی زندگی کے بالکل آخری مسائل میں سے ہے۔ لیکن قرآن اسے بھی "دین قیّم" قرار دیتا ہے (ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ[3]) یعنی یہ ہدایت، کہ ان چار مہینوں کی حرمت برقرار رکھی جائے اور ان میں جنگ چھیڑ کر اس کو پامال نہ کیا جائے "دین" ہی کی ایک شق ہے، اس سے الگ کوئی چیز نہیں۔

یہی نہیں کہ قرآن اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے صرف اپنے ہی قوانین کو دین کہتا ہے، بلکہ کسی بھی مذہب اور سوسائٹی کے قوانین کو اس کا "دین" قرار دیتا ہے، چناں چہ حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرے میں وہ ایک جگہ یہ الفاظ استعمال کرتا ہے:۔

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ۔[4]

---

[1] سورہ نور۔ ۲
[2] سورہ توبہ۔ ۳۶
[3] سورہ توبہ۔ ۳۶
[4] سورہ یوسف۔ ۷۶

اس کے لیے اس امر کی گنجائش نہ تھی کہ وہ اپنے بھائی کو شاہِ مصر کے "دین" کے تحت روک لیتا۔

کھلی بات ہے کہ یہاں جس چیز کو "شاہِ مصر کا دین" کہا گیا ہے، اس سے مراد اس کا قانونِ مملکت اور قانونِ فوج داری ہے۔

یہ چند مثالیں اس حقیقت کو کھول دینے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ اللہ کا ہر فرمان اور اس کے رسول کا ہر ارشاد اسلام کا حصہ اور دین کا جزو ہے، اور ان کے کسی بھی حکم کو دین سے زائد نہیں خیال کیا جا سکتا۔

یُوں بھی سوچیے تو اس طرح کے خیال میں کوئی معقولیت نہ مل سکے گی۔ "اسلام" کا مفہوم اگر اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت ہے تو اس کے کسی حکم کو آخر دائرۂ اطاعت سے باہر کس طرح رکھا جا سکتا ہے؟ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے کچھ احکام کو اس کے بھیجے ہوئے ہدایت نامے اور نازل کیے ہوئے دین کا جزو نہ مانا جائے، اور ان کی اطاعت اسلام کے مطالبے میں شامل نہ ہو؟

اب یہ دونوں حقیقتیں آپ کے سامنے ہیں:۔ یہ بھی[۱] کہ کتاب وسنت میں انسانی زندگی کے باطنی وظاہری، انفرادی اور اجتماعی، سارے ہی امور ومسائل کے متعلق احکام دیے گئے ہیں، اور[۲] یہ بھی کہ ان میں کا ہر حکم جزوِ دین اور داخلِ اسلام ہے۔ اِن حقائق کی موجودگی میں ایسا کہہ سکنے کی کوئی گنجائش نہیں پائی جا سکتی کہ اسلام کا دائرہ انسان کی صرف انفرادی زندگی تک محدود ہے؟ اور وہ بھی ایسا ہی ایک دین ہے جسے دنیا کے اجتماعی مسائل سے کوئی بحث نہیں ہوتی؟

اسلام ایک مکمل نظام

اگر یہ مسلّم ہو کہ اس وقت رات نہیں ہے، تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اس وقت لازماً دن ہی ہے۔ اس لیے جب یہ تحقیق ہو گئی کہ اسلام نہ تو رہبانیت کو صحیح سمجھتا ہے، نہ اس کا دائرہ انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہے تو اس کی

نوعیت آپ سے آپ متعین ہوگئی ۔ اور وہ یہ کہ انسانیت کا کوئی مسئلہ نہیں جو اس کے دائرے سے باہر ہو ۔ وہ ایک ایسا دین ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے ، اور وہ جو قدم بھی اٹھانا چاہتا ہے اس کی ہدایت کو اپنے سامنے موجود پاتا ہے ۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی ، فکری ، اخلاقی اور عملی ، تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے ، کچھ اسی طرح جس طرح کہ ہوا کا کرُہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے ۔ ذیل میں اس نظام کے اہم اجزاء کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے ۔ تاکہ ایک طرف تو اس دعوے کا مفصل ثبوت بھی سامنے آجائے ، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ نظام کیا ہے ؟ لیکن قبل اس کے کہ اسلامی نظام کے مختلف اجزاء کا تعارف کرایا جائے ، دو تین اصولی باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے :۔

(۱) ایک تو یہ کہ ان میں کا ہر جزو ایک ہی مرکز سے وابستہ ہے ، ایک ہی روح ہے جو ان سب کے اندر دوڑ رہی ہے ۔ یہ " مرکز " اور یہ " روح " ، وہی ایمانیات اور عقائد ہیں جن پر کتاب کے دوسرے باب میں گفتگو کی جا چکی ہے ، اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ ہمارا تنہا معبود ، اصلی حاکم اور حقیقی قانون دہندہ ہے ۔ دراصل یہی بنیادی عقیدہ وہ جڑ ہے جس سے بالکل فطری انداز میں اسلام کا یہ پورا نظام نکلا ہے ۔ اس لیے اس نظام کے جس حصے کی بھی قدر و اہمیت آپ سمجھنا چاہیں محض اس کے ظاہری ڈھانچے ہی کو نہ دیکھیں ، بلکہ ضروری ہے کہ اسے جڑ سمیت دیکھیں ۔

(۲) دوسری بات یہ کہ اس نظام کی کارگزاری ایک ایسے معاشرے کے وجود پر موقوف ہے جو " مسلم " ہو ، جسے اللہ اور اس کی صفات پر گہرا یقین ہو ، جو آخرت پر سچا ایمان رکھتا ہو ، اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دل سے اللہ کا نبی ، اور آخری نبی تسلیم کرتا ہو ۔ مختصر یہ کہ جو صحیح معنوں میں اسلام کا پیرو ہو ۔ اس لیے اس نظام کی قدر و اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک ایسے ہی معاشرے کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھا جائے ۔ ورنہ جس طرح ایک اچھے دست شمشیر زن

کے تصور کے بغیر کسی اچھی سے اچھی تلوار کی کاٹ کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اسی طرح ایک اچھے مسلم معاشرے کے تصوّر کے بغیر اسلامی نظام کی بھی عملی قدر و اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ اس نظام کے مختلف حصّے آپس میں مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں، جس طرح کہ ایک مشین کے مختلف پُرزے باہم جڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے نظری طور پر سمجھنے کے لیے تو انھیں الگ الگ خانوں میں ضرور تقسیم کیا جاتا ہے، مگر عملی طور پر ان کا علیحدہ علیحدہ وجود قریب قریب ناممکن ہے۔ اپنی کارکردگی کے اعتبار سے یہ سارے اجزاء دراصل ایک وحدت ہیں۔ ان میں کا کوئی بھی جزو اپنا عملی جوہر اسی وقت دکھا سکتا ہے جب یہ پورا نظام کُل کا کُل حرکت میں ہو۔ اسی طرح اس کے کسی بھی جزو کو ٹھیک ٹھیک سمجھا بھی اسی وقت جا سکتا ہے جب کہ دوسرے تمام اجزاء نظر کے سامنے ہوں۔

ان اصولی باتوں کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آئیے اس پورے نظام کا مطالعہ کریں۔

۱۔ رُوحانی نظام

اسلامی نظام کا سب سے اہم اور مرکزی جزو اس کا وہ حصّہ ہے جس کا راست تعلق انسان کے اندرون سے ہے، اور جسے عرف عام کے لحاظ سے 'اسلام کا روحانی نظام' کہہ سکتے ہیں۔ اس نظام کا مقصد یہ ہے کہ انسانی رُوح، نفس کی غلامی سے آزاد، اور دنیا پرستی کی آلودگیوں سے پاک ہو رہے، اور آزاد و پاک ہو کر اللہ کی اطاعت، اس کی محبت، اور اس کی رضا جوئی کے جذبات سے سرشار ہو جائے۔ اس پاکیزگی اور خدا طلبی کا معیارِ مطلوب یہ ہے کہ انسان وہی کچھ پسند کرنے لگے جو اس کے اللہ کو پسند ہے، اور ہر اُس چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے جو اس کے اللہ کو ناپسند ہے۔ اپنے حقیقی آقا کے حکموں پر اس طرح عمل کرنے لگے گویا وہ اُسے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

اس کی ناراضی سے اس طرح ڈرتا رہے گویا اس کے تختِ جلال کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کی رضا کے لیے اس طرح لپکتا رہے، جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی کی طرف لپکتا ہے، اور اس کے اشاروں پر اپنی جان و مال قربان کر دینے کے لیے اس طرح تیار رہے جیسے اُن چیزوں کی اس کی نگاہ میں کوئی قیمت ہی نہیں۔ روحانیت کے اس سب سے اُونچے معیاری مقام کا نام اسلام کی زبان میں "احسان" ہے۔

رُوح میں پاکیزگی اور خدا طلبی کی یہ کیفیت پیدا کرنے کے لیے اسلام نے جو بنیادی اور راست تدبیریں مقرر فرمائی ہیں وہ وہی ہیں جن کو "ارکانِ اسلام" کہا جاتا ہے۔ ان کا تذکرہ "بنیادی اعمال" کے عنوان سے اوپر تفصیل کے ساتھ آ چکا ہے۔ یہ پوری بحث آپ کے سامنے ہو گی، اس لیے یہاں اس وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں کہ نماز اور زکوٰۃ، روزہ اور حج انسانی روح میں یہ کیفیت کس طرح پیدا کرتے ہیں۔؟

۲۔ اخلاقی نظام

کسی شخص کی روح کی پاکیزگی یا گندگی کی سب سے عام اور سب سے نمایاں کسوٹی اس کے اخلاق ہوتے ہیں۔ باطن جس طرح کا ہوتا ہے اخلاق بھی ویسے ہی ظہور میں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے انسان کے اخلاق ہی اس کی انسانیت کے آئینہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے فطری ترتیب کے لحاظ سے روحانی نظام کے بعد اخلاقی نظام ہی کا نمبر آنا چاہیے۔ جہاں تک دین کا تعلق ہے، اس کا فیصلہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس نے حُسنِ اخلاق کو بڑی زبردست اہمیت دی ہے، اتنی کہ ایک پہلو سے گویا وہی حاصلِ دین ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ سُنیے، فرماتے ہیں:-

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ۔[1]

---

[1] موطا: ماجاء فی حسن الخلق۔

میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ حُسنِ اخلاق کی تکمیل کر دوں۔

اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ [1]

نیکی حُسنِ خلق کا نام ہے۔

یہ ہے اخلاق کی وہ غیر معمولی اہمیت جس کی بنا پر اس کے بارے میں اسلام نے بڑی تفصیل اور بڑی تاکید سے کام لیا ہے۔ ان وجوہ سے اسلامی نظام کے دوسرے اجزاء سے پہلے اسی جزو کا مطالعہ کیا جانا مناسب ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اسلامی اخلاقیات کی حیثیت جان لینی چاہیے۔ یعنی یہ کہ کیا اسلام میں اچھے اخلاق اور بُرے اخلاق متعین اور طے شدہ ہیں؟ اور اگر متعیّن اور طے شدہ ہیں تو کیا ہمیشہ کے لیے طے شدہ ہیں یا حالاتِ زمانہ کی بنا پر ان میں کوئی تغیر بھی ہو سکتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ اچھے اور بُرے اخلاق کا فیصلہ کرنے والی، اسلام میں، ایک متعیّن اتھارٹی ہے، اور وہ ہے اللہ ورسول کی اتھارٹی۔ اچھا اخلاق وہی چیز ہوتی ہے جسے اللہ ورسول نے اچھا اخلاق قرار دے رکھا ہو۔ اسی طرح بُرا اخلاق صرف وہ چیز ہوتی ہے جسے اللہ ورسول نے بُرا اخلاق فرمایا ہو۔ اس لیے اسلام میں اچھے اور بُرے اخلاق کا مسئلہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے۔ نہ کسی انسانی عقل کے فیصلے کا محتاج ہے نہ کسی تجربے کا منتظر ہے۔ ویسے تو جہاں تک عام جائزے کا تعلق ہے، نظر یہی آئے گا کہ معروف اخلاقیات ہمیشہ سے اور ہر معاشرے میں رائج رہی ہیں، اور وہ صرف اسلام ہی کی کوئی خاص چیز نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسلامی اخلاقیات اور عام ومعروف اخلاقیات، دونوں کو ایک سمجھ لینا بڑی بھاری غلطی ہوگی۔ کیوں کہ اسلام نے کسی طرزِ عمل کو اچھا اخلاق یا بُرا اخلاق اس لیے نہیں کہا ہے کہ لوگ اُسے ایسا ہی کہتے اور سمجھتے چلے آئے ہیں، یا عقل و تجربے سے اس کی یہی حیثیت متعیّن ہوتی ہے، بلکہ خود اپنے اصولوں کی بنا پر کہا ہے۔ چناں چہ جہاں بے شمار اسلامی اخلاقیات

---

[1] مسلم، جلد دوم، باب تفسیر البر والاثم۔

بعینہٖ وہی ہیں جو عام طور پر تسلیم شدہ چلی آرہی ہیں، وہیں بہت سی چیزیں اس کے یہاں ایسی بھی ملیں گی جو اس کے نزدیک تو خیر اور حُسنِ خلق ہیں، مگر دوسرے انھیں ایسا نہیں مانتے۔ اسی طرح کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن کو وہ شر اور بدخلقی کہتا ہے، مگر کتنے ہی لوگ اسے بھلائی کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ اخلاق کے بارے میں اسلام کا اپنا ایک مخصوص معیار بھی ہے اور اپنا ایک مستقل نظام بھی ہے۔ اور اچھے یا بُرے اخلاق کا تمام تر فیصلہ شریعت اپنے اصول اور مزاج کے مطابق خود کرتی ہے۔

چوں کہ امر واقعی یہ ہے کہ اسلامی اخلاقیات ایک مستقل بنیاد رکھتی ہیں اور اسلام کے بنیادی اصولوں کا راست ثمرہ ہیں، اس لیے مستقل اور ناقابل تغیر بھی ہیں۔ حالاتِ زمانہ کا کوئی تقاضا ایسا نہیں ہوسکتا جس کے لیے ان کا ایک گوشہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا دیا جاسکتا ہو۔ سچائی اور دیانت داری ہر حال میں بہترین انسانی صفات رہیں گی، انصاف اس وقت بھی ضروری ہوگا جب کہ اپنا نقصان ہو رہا ہو، وعدہ خلافی کسی دشمن سے بھی روا نہیں۔ غرض یہ اخلاقیات ہر حال میں اپنی جگہ قائم رہنے والی ہیں، اور اسلامی اخلاقی قدریں کسی حال میں بھی بدلنے والی شے نہیں ہیں۔

یہ ہے اسلامی اخلاقیات کی حیثیت۔ اسے ذہن میں رکھ کر اب اُن کے جائزے کی طرف آئیے، اور یہ دیکھیے کہ وہ ہیں کیا؟ پہلے ان اخلاقیات کو لیجیے جن کا تعلق انسان کی عام زندگی سے ہے، اور جو بنیادی نوعیت کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ [1]

لوگوں کے ساتھ بھلائی کر، جس طرح کہ اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے۔

.... وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ [2]

.. (ان متقیوں کے لیے) جو غصّے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کردیتے ہیں۔

---

[1] سورہ قصص، ۷۷ [2] سورہ آل عمران - ۱۳۴

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ۔[1]

بلاشبہ اللہ کسی دغاباز ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا۔[2]

اور فضول خرچی نہ کر۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔[3]

لوگوں سے (باتیں کرتے وقت) اپنے گالوں کو (غرور سے) ٹیڑھا نہ رکھ، نہ زمین پر اترا کر چل۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ کسی مغرور اور شیخی باز کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃٍ۔[4]

ہلاکت ہے ہر طعنہ دینے والے اور عیب لگانے والے کے لیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

"بلاشبہ سچائی نیکی کی طرف، اور نیکی جنّت کی طرف لے جاتی ہے..... اور جھوٹ بدی کی، اور بدی جہنّم کی راہ دکھاتی ہے۔"[5]

"تھوڑی سی ریا بھی شرک ہے۔"[6]

"ظلم کرنے سے بچو۔ کیوں کہ ظلم قیامت کے دن اندھیاروں کی شکل میں نمودار ہوگا۔"[7]

"چار خصلتیں جس کسی کے اندر ہوں گی وہ پکّا منافق ہوگا۔ اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک ہوگی اس کے اندر نفاق کی ایک صفت ہوگی یہاں تک کہ

---

[1] سورہ حج۔ ۳۸ [2] سورہ بنی اسرائیل۔ ۲۶ [3] سورہ لقمان۔ ۱۸ [4] سورہ ہمزہ۔ ۱
[5] مسلم، جلد دوم، باب قبح الکذب [6] ابنِ ماجہ، بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ، باب الریاء والسمعۃ
[7] مسلم، جلد دوم، باب تحریم الظلم۔

وہ اُسے چھوڑدے (وہ چار خصلتیں یہ ہیں) جب[1] کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرجائے، بات[2] کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ[3] کرے تو پورا نہ کرے، جھگڑے تو گالیوں پر اُتر آئے۔"[1]

"نرمی اختیار کرو، درشتی اور بدکلامی سے دُور رہو۔"[2]

"چغلی کھانے والا جنّت سے محروم رہے گا۔"[3]

"اللہ اس شخص پر رحم نہ کرے گا جو دوسرے لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔"[4]

"دغا باز اور بخیل اور احسان جتانے والے جنّت میں نہ جائیں گے۔"[5]

اسلام کی ان عام اور بنیادی قسم کی اخلاقی تعلیمات کے بعد اُن اخلاقیات کی طرف آیئے جن کی تلقین اس نے زندگی کے مخصوص دائروں کو سامنے رکھتے ہوئے کی ہے:۔

● — انسانی زندگی کا سب سے پہلا دائرہ اس کی گھریلو[1] زندگی ہے، جہاں اس کا اپنی بیوی اور اپنے بچوں سے ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ فطری طور پر بڑی گہری محبّت ہوتی ہے، اور اس لیے وہ عموماً اُن کے ساتھ ایثار اور قربانی کا سلوک بھی لازماً کرتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ یہ سلوک محض ایک تقاضائے فطرت ہی نہیں ہے، بلکہ ایک دینی فریضہ بھی ہے۔ حکم خداوندی ہے:۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔[6]

اپنی عورتوں کے ساتھ بھلے طریقے سے رہو سہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ[7]

تم میں سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے حق میں اچھے ہوں۔

---

[1] بخاری، جلد اول، باب علامۃ المنافق [2] بخاری، جلد دوم، باب لم یکن النبیؐ فاحشا [3] بخاری، جلد دوم، باب ما یکرہ من النمیمۃ [4] ترمذی، جلد دوم، باب ما جاء فی الریاء والسمعۃ [5] ترمذی، جلد دوم، باب ما جاء فی البخل [6] سورہ نساء ۔ ۱۹ [7] ترمذی، کتاب الرضاع، باب ما جاء فی حق المرأۃ علی زوجہا۔

اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا ۔[1]

عورتوں کے معاملے میں اچھے رویّے کی وصیت قبول کرو۔

● گھریلو زندگی کے آگے خاندانی زندگی کا دائرہ آتا ہے، جہاں انسان کا واسطہ ماں باپ اور بھائی بہن وغیرہ قریبی رشتے داروں سے ہوتا ہے۔ والدین کے ساتھ جس رویّے کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگالیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے کا حکم اپنی بندگی کے حکم کے ساتھ ساتھ اور معاً بعد ہی دیا ہے (وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا[2]) اور پھر وضاحت کے طور پر فرمایا ہے کہ:۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا ۔[3]

ان کے لیے فروتنی کے بازوؤں کو رحمت (و محبت کے جذبہ) سے جھکا دو، اور دعا کرو کہ پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح کہ انھوں نے (رحمت و شفقت کے ساتھ) مجھے بچپن میں پالا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے اس میں سے صرف دو ایک ارشادات کا سُن لینا کافی ہوگا:۔

"تمہارے والدین تمہاری جنّت اور دوزخ ہیں[4]"

"جو نیکو کار اولاد اپنے والدین پر محبت اور شفقت کی نظر ڈالتی ہے اللہ تعالیٰ اُس کی ایسی ہر نظر کے بدلے اسے ایک مقبول حج کا ثواب عطا فرماتا ہے"[5]

حد یہ ہے کہ اگر والدین خدا نخواستہ کافر ہوں، کافر ہی نہیں بلکہ سخت قسم کے دشمنِ اسلام کافر ہوں، تو بھی ان کی خدمت اور دل داری کے عام حقوق اپنی جگہ باقی

---

[1] مسلم، جلد اوّل، باب الوصیۃ للنساء۔ [2] سورہ نساء۔ ۳۶ [3] سورہ بنی اسرائیل۔ ۲۴
[4] ابن ماجہ، باب برّ الوالدین [5] بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب البر والصلۃ۔

ہی رہیں گے، اور ضروری ہے کہ ان حقوق کو پورا کیا جائے۔ (وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا)[1]

والدین کے بعد جہاں تک دوسرے رشتے داروں کا تعلق ہے، تو ان کے بارے میں بھی قرآن کریم نے عام اور ہمہ گیر حسنِ سلوک کی ہدایت فرما رکھی ہے۔ چناں چہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں "وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا" کے بعد ہی "وَبِذِي الْقُرْبَىٰ" کے الفاظ آئے ہیں، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس طرح والدین کے ساتھ ان کے مرتبے کے مطابق حسنِ سلوک کرنا چاہیے اسی طرح رشتہ داروں کے ساتھ بھی کرنا چاہیے۔ ان میں جو رشتے دار جتنا ہی زیادہ قریب کا رشتہ رکھتا ہوگا، اس کے حقوق بھی اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ ایک صاحب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مجھے حسنِ سلوک کس کے ساتھ کرنا ہے؟ ارشاد ہوا "اپنی ماں کے ساتھ۔ یہ بات آپ نے تین بار فرمائی۔ چوتھی بار جب پوچھنے والے نے اسی سوال کو پھر دہرایا تو آپؐ نے فرمایا "پھر باپ کے ساتھ اس کے بعد ترتیب وار زیادہ قریبی رشتے داروں کے ساتھ۔" (ثُمَّ أَبَاكَ ثُمَّ الْأَقْرَبَ فَالْأَقْرَبَ)[2]

رشتے داروں کے ساتھ اچھے سلوک کو اصطلاح میں "صلہ رحمی" کہا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں، خونی رشتوں کو جوڑے رکھنا، اور اُن کی پاس داری کرنا۔ قرآن حکیم نے صلہ رحمی کو انسانیت اور حق شناسی کا ایک بنیادی پتھر قرار دیا ہے، اور اس کی بار بار تلقین کی ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی ایمان کے لوازم میں سے ہے:۔

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ۔[3]

جو کوئی اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔

---

[1] سورہ لقمان۔ ۱۵ [2] ترمذی، جلد دوم، باب ما جاء فی برّ الوالدین۔
[3] بخاری، جلد دوم، باب اکرام الضیف۔

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ قَاطِعٌ۔[1]

رحمی رشتے کاٹنے والا جنّت میں داخل نہ ہو سکے گا۔

● ــــ اس کے بعد پڑوس[3] اور محلّے کا دائرہ آتا ہے۔ پڑوسیوں سے ایک مسلمان کو جس طرح پیش آنا چاہیے اس کی وضاحت کے لیے دو حدیثیں کافی ہیں: آپؐ فرماتے ہیں کہ:۔

مَازَالَ جِبْرِیْلُ یُوْصِیْنِیْ بِالْجَارِ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّہٗ سَیُوَرِّثُہٗ۔[2]

جبریلؑ مجھے پڑوسی کے حق میں برابر وصیت کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے خیال ہو چلا کہ وہ اسے وارث بنا دیں گے۔

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ لَّا یَاْمَنْ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ۔[3]

جس شخص کا پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو وہ جنّت میں نہ جائے گا۔

● ــ اب اور آگے پورے معاشرے کا بڑا اور پھیلا ہوا دائرہ ہوتا ہے، جس کے اندر انسان کو مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان سب کے ساتھ اس کا جو رویّہ ہونا چاہیے اصولی طور پر اس کا تعین قرآن مجید کے یہ الفاظ کرتے ہیں:۔

..... وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ۔[4]

.... اور اللہ نے حکم دیا ہے اچھا سلوک کرنے کا والدین کے ساتھ، اور رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتے دار پڑوسیوں، اجنبی ہمسایوں، ساتھ بیٹھنے والوں، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ۔

---

[1] بخاری، جلد دوم، باب اثم القاطع [2] بخاری، جلد دوم، باب الوصایا بالجار۔
[3] مسلم، جلد اول۔ باب تحریم ایذاء الجار [4] سورہ نساء۔ ۳۶

انسانی تعلقات کی رُو سے لوگوں کی جتنی قسمیں ہوسکتی تھیں، اس آیت نے ان میں سے ایک ایک کا نام لے کر گنا دیا ہے، اور سب کے بارے میں یہ جامع ہدایت کردی ہے کہ ان کے ساتھ ایک مسلمان کا رویّہ لازمًا "احسان" (حُسنِ سلوک) اور بھلائی کا ہونا چاہیے۔

● — عام معاشرتی کے بعد حکومتی دائرہ آتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی میں ہر فرد کی سیاسی اور انتظامی پہلو سے بھی، ایک متعیّن حیثیت ہوتی ہے۔ یا تو وہ صاحبِ امر ہوگا یا مامور ہوگا، حاکم کا مقام رکھتا ہوگا یا رعایا کا۔ اگر وہ صاحبِ امر ہے اور حاکم کا مقام رکھتا ہے، تو اپنی رعایا کے ساتھ اس کا جو طرزِ عمل ہونا چاہیے اس کی وضاحت اس ارشادِ نبوی سے ہوتی ہے:۔

مَا مِنْ اَمِيْرٍ يَلِيْ اُمُوْرَ الْمُسْلِمِيْنَ ثُمَّ لَا يَجْهَدُ لَهُمْ وَلَا يَنْصَحُ لَهُمْ اِلَّا لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الْجَنَّةَ۔[1]

جو کوئی امیر، مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار ہوتے ہوئے ان کے لیے جی جان سے کوشش نہیں کرتا اور نہ ان کی خیر خواہی کرتا ہے، وہ ان کے ساتھ جنّت میں نہ جائے گا۔

اور اگر وہ رعایا ہے تو اسے اپنے حاکم کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے اس کا تعیّن یہ حدیث کرتی ہے:

.... اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ قُلْنَا لِمَنْ؟ قَالَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ۔[2]

(آپؐ نے فرمایا) دین نُصح و خیر خواہی کا نام ہے۔ پوچھا گیا "کس کی نصح و خیر خواہی کا" فرمایا:۔ "اللہ کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے امراء کی اور سارے اہلِ اسلام کی۔"

---

[1] مسلم۔ جلد دوم، باب فضیلۃ الامیر العادل... الخ [2] مسلم، جلد اوّل، بیان ان الدین نصیحۃ۔

یعنی دین داری اور خدا پرستی کے تقاضوں میں یہ بات بھی لازماً شامل ہے کہ امراء کا رویّہ اپنی رعایا کے ساتھ اور رعایا کا رویّہ اپنے امراء کے ساتھ، وفاداری، خیر خواہی اور خلوص کا ہو۔

● — سب سے آخری دائرہ ایک مسلمان کی زندگی کا وہ ہے جو مسلم معاشرے سے باہر کا ہوتا ہے، اور جو غیر مسلموں کے ساتھ معاملات اور تعلقات کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ یہاں اسے جس اخلاقی روش کا پابند رہنا چاہیے اس کا بنیادی اصول اس آیت میں موجود ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ[1]

اے ایمان والو! اللہ کے (دین کے) لیے مستعد رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو اور کسی گروہ کی دشمنی (بھی) تمہیں انصاف سے ہرگز باز نہ رکھنے پائے۔ عدل کرو۔ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جن پر اسلام انسان کی اخلاقی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ انھیں دیکھ کر ہر شخص محسوس کرسکتا ہے کہ مسلمان کی زندگی کا بند بند، اخلاق کے مستحکم ضابطوں سے کسا ہوا ہے۔

۳ ۔ عائلی نظام

ان دو بنیادی اہمیت کے شعبوں کے بعد انسانی زندگی کے تمدّنی ڈھانچے کی طرف آئیے اور اس کے ایک ایک شعبے کے بارے میں اسلامی احکام و ہدایات کا مطالعہ کیجیے۔

---

[1] سورہ مائدہ — ۸

انسانی تمدّن کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے۔ انہی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی ادارہ انسان کی تمدّنی زندگی کی سب سے پہلی کڑی ہوتا ہے۔ اس اجتماعی ادارے کو انسان کی عائلی زندگی، اور اس کے لیے جو ضابطے ہوتے ہیں انھیں "عائلی نظام" کہتے ہیں۔ اسلام نے جو عائلی نظام مقرر فرمایا ہے اس کی موٹی موٹی باتیں یہ ہیں:-

مرد اور عورت کی یہ مستقل رفاقت ایک کھلے ہوئے معاہدے کے ذریعے وجود میں آتی ہے، جسے شریعت کی زبان میں "نکاح" کہتے ہیں۔ یہ نکاح ایک باحرمت رشتہ ہے، جو دونوں کی مرضی سے، اور پورے اعلان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ نکاح کے بغیر مرد و زن کا تعلق بدترین معصیت اور سخت ترین سزا کے قابل جرم ہے۔ یہ نکاح صرف ایک جبلّی ضرورت ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شرعی ضرورت بھی ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں "....میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو کوئی میری اس سنّت سے اعراض کرے گا وہ میرا نہ رہے گا۔" (....اَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)[1] اس ضرورت سے اپنے کو بالا رکھنا اسلامی طریقہ نہیں ہے۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون نے آختہ ہو رہنے کی اجازت مانگی تو آپؐ نے اجازت نہیں دی۔ (رَدَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی عُثْمَانَ ابْنِ مَظْعُوْنٍ التَّبَتُّلَ)[2]

معاہدۂ نکاح کو قرآن نے "پختہ عہد" (مِیْثَاقًا غَلِیْظًا[3]) قرار دیا ہے۔ اس معاہدے کے ذریعے دونوں اپنے اپنے اوپر بھاری ذمّہ داریاں اوڑھتے ہیں، اور ہمیشہ کے لیے اوڑھتے ہیں۔ اس رشتے سے جو ایک چھوٹی سی اجتماعی وحدت بنتی ہے مرد اس کا نگراں اور ناظمِ اعلیٰ ہوتا ہے، اور عورت اس کے زیرِ ہدایت گھر کا نظم و نسق چلاتی ہے۔ (اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ[4])۔

---

[1] بخاری، جلد دوم، الترغیب فی النکاح [2] بخاری، جلد دوم، باب مایکرہ من التبتل۔
[3] سورہ نساء۔ ۲۱ [4] سورہ نساء۔ ۳۴

اس اجتماعی وحدت میں مرد کی ذمہ داری یہ ہے کہ :۔

(۱) وہ عورت کے لیے، اور ہونے والی اولاد کے لیے کھانے کی، کپڑے کی، رہنے سہنے کی، غرض زندگی کی ہر ضرورت کی فراہمی کرے۔ ضروریاتِ زندگی کی یہ فراہمی اسے اپنی اقتصادی حالت کے مطابق کرنی ہوگی (لِيُنْفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ)[1] —— یہ ذمہ داری صرف اخلاقی نوعیت نہیں رکھتی، بلکہ قانونی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص اس میں کوتاہی دکھائے گا تو حکومت اسے ادائے فرض پر مجبور کرے گی۔

(۲) وہ بیوی بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کا خیال رکھے اور اس کا اہتمام کرے۔ اللہ تعالیٰ نے تاکید کے ساتھ فرمایا ہے کہ "ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ"۔ (يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔)[2]

غرض مرد کے اوپر یہ دوہری ذمے داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کی دنیوی ضرورتوں اور اُخروی فلاح، دونوں باتوں کا پورا پورا لحاظ رکھے۔ اس بارے میں وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ جواب دہ ہوگا :۔

اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ......

وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُمْ ۔[3]

سُن رکھو، تم میں سے ہر شخص راعی (ذمہ دار حاکم) ہے۔ اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی ..... مرد اپنے گھر والوں کا راعی ہے اور اسے ان کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔

عورت کی ذمہ داری یہ ہے کہ :۔

(۱) وہ گھر کے اندرونی نظم کو سنبھالے (وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ)[4] عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد پر راعی و

---

[1] سورہ طلاق ۔ ۷ [2] سورہ تحریم ۔ ۲ [3] مسلم، جلد دوم باب فضیلۃ الامیر العادل ۔ الخ
[4] مسلم، جلد دوم، باب فضیلۃ الامیر العادل ۔ الخ

نگراں ہے، اور اسے ان کے بارے میں جواب دینا ہوگا۔

(۳) شوہر کی اطاعت کرے اور اپنی عفت کو پوری طرح محفوظ رکھے:

فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ۔[1]

سونیک عورتیں اطاعت کرنے والی اور پوشیدہ چیزوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔

اسی طرح اولاد کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کی اطاعت اور خدمت کرے۔ ان کی نافرمانی ناقابلِ معافی گناہ ہے:

كُلُّ الذُّنُوبِ يَغْفِرُ اللّٰهُ مِنْهَا مَا شَاءَ إِلَّا عُقُوقَ الْوَالِدَيْنِ۔[2]

گناہوں میں سے جس کو چاہے گا اللہ معاف فرما دے گا۔ مگر والدین کی نافرمانی کو معاف نہ کرے گا۔

جس طرح نکاح کو ایک شرعی ضرورت کہا گیا ہے، اسی طرح اس نکاح کے نتیجے میں عائد ہونے والی ان تمام ذمہ داریوں کو "اللہ کی قائم کردہ حدود" کہا گیا ہے (تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ)[3] اور مرد و عورت، دونوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ ان حدود کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھیں (فَلَا تَعْتَدُوهَا)[4]۔

ہر شریف اور فرض شناس انسان سے توقع یہی رکھی جاتی ہے کہ وہ ان حدود کا برابر کاربند رہے گا۔ لیکن اگر خدانخواستہ صورتِ حال یہ باقی نہ رہ جائے، بلکہ زوجین میں اختلاف پیدا ہوجائے اور نباہ کی کوئی امید نظر نہ آئے، تو مجبوراً اس بات کی بھی اجازت ہے کہ شوہر طلاق کے ذریعہ، اور عورت خلع کے ذریعے اس رشتۂ نکاح کو ختم کر دے۔ (فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ[5]) حتیٰ کہ حکومت کو بھی اختیار ہے کہ اس شکل میں وہ آگے بڑھ کر اس رشتے کو بطورِ خود توڑ دے

---

[1] سورہ نساء ۔ ۵ [2] بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ، باب البر والصلۃ [3] سورہ بقرہ ۔ ۲۹۹
[4] سورہ بقرہ ۔ ۲۹۹ [5] سورہ بقرہ ۔ ۲۲۹

کیوں کہ اس کی حرمت اپنی جگہ بڑی اہم سہی، مگر "حدود اللہ" کی حرمت اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس لیے اس کی خاطر انہیں پامال کرنے کی چھوٹ نہیں ہوسکتی۔

۴۔ معاشرتی نظام

ایک گھر کی محدود ترین اجتماعیت سے باہر جو ایک وسیع اجتماعیت ہوتی ہے، اور جسے 'معاشرہ' کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں اسلام کے بعض بنیادی تصورات ہیں۔ پہلے ان تصورات کو معلوم کر لیجیے۔ اس کے بعد احکام کی تفصیل کا موقع آئے گا۔

معاشرے کے بارے میں اسلام کا کہنا یہ ہے کہ یہ جن بے شمار افراد سے مل کر بنا ہوتا ہے، وہ سب کے سب فی الواقع ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوتے ہیں۔ (خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ[1]) اس لیے پیدائشی طور پر وہ سب برابر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہوتی۔ کوئی پاک اور کوئی ناپاک نہیں ہوتا۔ کالے اور گورے، ہندی اور عربی، آرین اور سامی، ایشیائی اور یورپی، مشرقی اور مغربی، سب ایک سے، ایک درجے کے، اور ایک طرح کے حقوق رکھنے والے انسان ہوتے ہیں۔ نسل، یا وطن، یا رنگ، یا زبان کی بنا پر ان میں کوئی تفریق نہیں ہوسکتی۔ تفریق کی صرف ایک ہی بنیاد ہے، اور وہ ہیں خود ہوں۔ اس لیے پوری انسانی برادری دراصل صرف دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے:- ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو مجھ پر، یعنی اللہ کے دین پر ایمان رکھتے ہیں، دوسرا ان لوگوں کا ہے جو اسے اپنا دین نہیں مانتے۔ پہلا اسلامی معاشرہ کہلاتا ہے۔ دوسرا غیر مسلم معاشرہ۔ ان دونوں معاشروں کی بنیادیں واضح طور پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں اور جب بنیادیں مختلف ہوتی ہیں تو ان کے ڈھانچے بھی قدرتی طور پر باہم مختلف ہی ہوتے ہیں، اور زندگی کے اہم تر معاملات میں ان کے مابین کوئی مفاہمت نہیں ہوسکتی۔ مثلاً نکاح کا رشتہ، جو پورے نظام تمدن کی پہلی اینٹ ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں میں قائم نہیں ہوسکتا، نہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہوسکتے ہیں۔

جب دین اور عقیدے کی بنا پر اسلامی اور غیر اسلامی، دو الگ الگ معاشرے

---

[1] سورہ نساء ۱

بن جاتے ہیں، تو ان دونوں کے بارے میں اپنے پیروؤں کے لیے اسلام کے احکام بھی بہت کچھ مختلف ہی ہوں گے۔ جہاں تک غیر مسلم معاشرے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے افراد کے ساتھ سلوک، عام انسانی بنیادی اخلاقیات — مثلاً عدل و انصاف، دیانت و امانت، نرمی اور مروّت، مرحمت و مواساۃ، راست بازی اور ایفائے عہد وغیرہ — کے مطابق رکھا جائے، اور ہرگز ان کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ رہا مسلم معاشرے کا معاملہ، تو اس کے لیے اسلام نے بڑی مفصل اور واضح ہدایتیں دی ہیں، اور انہی کو "اسلام کا معاشرتی نظام" کہا جاتا ہے — ان ہدایتوں کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) افراد کے باہمی تعلقات کسی طرح کی گروہی یا طبقاتی یا نسلی کشمکش کے بجائے بھائی چارگی، ہم دردی، مساوات، تعاون اور ایثار پر قائم کیے جائیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔[۱]

مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

عملی طور پر یہ "بھائی چارگی" کیسی ہونی چاہیے؟ اس کی وضاحت اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ہوتی ہے:-

یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَ لَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ۔[۲]

یہ اہلِ ایمان اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیا کرتے ہیں چاہے خود فاقہ کی حالت میں کیوں نہ ہوں۔

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ .... وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ ..... وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ..... وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ..... اِجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ .... وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا۔[۳]

---

[۱] سورہ حجرات - ۱۰ [۲] سورہ حشر - ۹ [۳] سورہ حجرات - ۱۱-۱۲

لوگ دوسرے لوگوں کا مذاق نہ اُڑائیں ... اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں ..... ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ، نہ ایک دوسرے کا بُرا نام رکھو..... بہت زیادہ گمان آرائیاں کرنے سے بچو..... اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا کہو۔

"مومن ایک دوسرے کے لیے عمارت کی مانند ہوتے ہیں، جس کا ہر جزو دوسرے کا پُشتیبان ہوتا ہے۔"[1]

"آپس کی محبت، رحم دلی اور شفقت میں مسلمانوں کا حال ایک جسم کا سا ہے۔ جسم کے ایک عضو میں اگر تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"[2]

"آپس میں حسد نہ کرو، نہ نیلام میں محض دام چڑھا دینے کی خاطر بولی بولو۔ نہ ایک دوسرے سے کینہ رکھو، نہ ترکِ تعلق کرو۔ اور نہ دوسرے کی بیع کے معاملے میں مداخلت کر کے خود بیع کا معاملہ کر لینے کی کوشش کرو ــــ بلکہ اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو ــــ ایک مسلمان دوسرے کا بھائی ہوتا ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اُسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اس کو حقیر سمجھتا ہے .... مسلمان کے خون کا احترام، اس کے مال کا احترام اور اس کی آبرو کا احترام مسلمان پر فرض ہے۔"[3]

"ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں: جب[1] اس سے ملو تو سلام کرو۔ جب[2] مدد کے لیے پکارے تو لبیک کہو۔ جب[3] تم سے خیر خواہی کا طالب ہو تو اس کی خیر خواہی کرو، جب چھینکے[4] اور چھینکنے کے بعد الحمدللہ کہے تو یَرْحَمُکَ اللہ کہو۔ جب[5] بیمار پڑے تو اس کی مزاج پُرسی کرو، اور جب وفات پا جائے تو اس کے جنازے میں شرکت کرو۔"[4]

"کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی کو تین دن سے زیادہ مدت تک چھوڑے رہے۔"[5]

---

[1] مسلم، جلد دوم، باب تراحم المومنین .... الخ [2] مسلم، جلد دوم، باب تراحم المومنین وتعاطفہم وتعاضدہم۔
[3] مسلم، جلد دوم، باب تحریم ظلم المسلم [4] مسلم، جلد دوم، باب حق المسلم للمسلم ردّ السّلام۔
[5] مسلم، جلد دوم، باب تحریم التحاسد۔

"کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نہ دے، یہاں تک کہ وہ نکاح کرلے یا بات ختم کردے"۔[1]

"باہمی تعلقات کی خرابی سے پوری طرح بچتے رہو، کیوں کہ یہ چیز دین کا صفایا کردینے والی ہے"۔[2]

یہ ہے اسلامی معاشرے میں افراد کے باہمی تعلقات کی مطلوبہ نوعیت اور کیفیت بھائی چارگی اور باہمی محبت کی یہ کیفیت کسی غلط فہمی یا نفسانیت کے ہاتھوں جہاں کہیں ختم ہوتی نظر آئے دوسرے لوگوں کا فرض ہے کہ اصلاحِ حال کے لیے فوراً دوڑ پڑیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ۔[3]

مسلمان تو (سارے کے سارے) آپس میں بھائی بھائی ہیں، پس (اگر کہیں آپس میں رنجش پیدا ہو جائے تو) اپنے دونوں بھائیوں میں صلح صفائی کرادو۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا:-

اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ الصَّلٰوةِ وَالصَّدَقَةِ قَالُوْا بَلٰى قَالَ اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ۔[4]

کیا تمہیں ایک ایسا کام نہ بتاؤں جو روزے اور صدقے اور نماز سے بھی افضل ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا "ہاں (ضرور بتائیں)" ارشاد ہوا "آپس کے تعلقات کو ٹھیک کردینا۔"

(۲) معاشرے میں بھلائی اور خدا ترسی کے کاموں کی ہمت افزائی کی جائے۔ نہ صرف ہمت افزائی کی جائے، بلکہ ضروری ہے کہ لوگ ایسے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کریں:-

---

[1] بخاری، جلد دوم، باب لا یخطب علیٰ خطبۃ اخیہ [2] ابو داؤد، جلد دوم
[3] سورہ حجرات - ۱۰ [4] ابو داؤد، جلد دوم، باب فی اصلاح ذات البین۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى[1]

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ ایسے کاموں پر ایک دوسرے کو برابر اُبھارتے بھی رہنا چاہیے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ۔[2] الخ

مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، وہ باہم نیکی کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

(۳) معاشرے کے اندر برائیوں کو سر اُٹھانے کا موقع نہ دیا جائے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ ایک طرف تو کسی بُرے کام میں مدد نہ کی جائے (وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ)[3] دوسری طرف اپنی طاقت بھر ایسی حرکتوں سے لوگوں کو باز رکھنے کی پوری پوری کوشش بھی کی جائے۔ ہدایت ربانی ہے کہ "تم میں سے جو شخص بھی کوئی بُرائی دیکھے تو چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل کر درست کر دے"۔ (مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ۔ الخ[4]) یہ بُری حرکتوں سے لوگوں کو باز رکھنا صرف معاشرے ہی کی خدمت اور خیر خواہی نہیں ہے، بلکہ خود اس شخص کی بھی خدمت اور خیر خواہی ہے جسے بُرائی سے روکا گیا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ ہدایت فرمائی کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہو چاہے مظلوم"، تو صحابہؓ نے پوچھا کہ "اے اللہ کے رسول! مظلوم بھائی کی مدد کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، مگر یہ ظالم کی مدد کس طرح کی جائے گی؟" آپؐ نے فرمایا:۔

تَمْنَعُهٗ مِنَ الظُّلْمِ فَذَاكَ نَصْرُهٗ اِيَّاهُ۔ —— [5]

---

[1] سورہ مائدہ - ۲ [2] سورہ توبہ - ۱۷ [3] سورہ مائدہ - ۲

[4] مسلم، جلد اول، کتاب الایمان [5] بخاری، مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۴۲۲

تم اسے ظلم کرنے سے روک دو، سو یہی اس کی امداد ہے۔

(۴) اُن تمام سرچشموں کو بند رکھا جائے جن سے صنفی برائیاں اُبل اُبل کر معاشرے میں پھیل جایا کرتی ہیں۔ اس غرض کے لیے یہ ہمہ جہاتی تدبیریں اختیار کی گئی ہیں:۔

(الف) زنا کو بدترین برائیوں میں شمار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو، یہ کھلی ہوئی بے حیائی کا کام اور بُری روش ہے۔" (وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا[1]) اور اس کے خلاف یہ کہہ کر پوری سوسائٹی میں شدید ترین نفرت کے انتہائی جذبات پیدا کر دیے گئے ہیں۔ "زانی کسی زانیہ یا مشرکہ سے ہی نکاح کرتا ہے، اور کسی زانیہ کو زانی یا مشرک ہی اپنے نکاح میں لاتا ہے":

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ[2]

(ب) زنا کے مرتکب کے لیے پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر ڈالنے، یا سو دُرّے لگائے جانے کی عبرت ناک اور دل ہلا دینے والی سزا رکھی گئی ہے، اور اس سزا کے نفاذ کا طریقہ یہ مقرر کیا گیا ہے کہ وہ کھلے عام دی جائے، زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی موجودگی میں دی جائے اور مارنے میں کسی مروّت سے کام نہ لیا جائے (وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ ..... وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ[3])

(ج) عورتوں کا دائرۂ کار، عام حالات میں، گھر کی چہار دیواریوں تک محدود کر دیا گیا ہے، اور انھیں بلا ضرورت باہر نکلنے سے روک دیا گیا ہے۔ (وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ[4])

(د) مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول سخت ممنوع ہے۔ بہت ہی قریبی اعزہ کے سوا اور کسی کے سامنے عورتوں کو بے حجاب آنے کی اجازت نہیں (وَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ[5]) اسی طرح انھیں اس بات سے بھی روک دیا گیا ہے کہ وہ خوشبو

---

[1] سورہ بنی اسرائیل ۔ ۳۲ [2] سورہ نور ۔ ۳ [3] سورہ نور ۔ ۲
[4] سورہ احزاب ۔ ۳۳ [5] سورہ احزاب ۔ ۵۹

لگا کر یا چھن چھن کرنے والے زیور پہن کر باہر نکلیں، یا پردے کی آڑ سے بھی غیر محرم مردوں سے بلا ضرورت بات چیت کریں ——— یا اگر بات چیت کرنا پڑ جائے تو لب و لہجہ میں کوئی لوچ پیدا کریں (..... فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِىْ فِىْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ)[1]

(ہ) عورتوں کو ایسے لباس پہننے یا ایسے طور طریقے اختیار کرنے کی سخت ممانعت ہے جو غیروں کے سامنے اظہارِ حُسن کی تعریف میں آتے ہوں۔ ان عورتوں پر لعنت فرمائی گئی ہے جو اتنے باریک کپڑے پہنیں کہ جسم اندر سے جھلک رہا ہو، یا جو مٹکتی ہوئی چلیں۔ (نِسَآءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مَائِلَاتٌ مُمِيلَاتٌ رُءُوْسُهُنَّ كَاَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيْحَهَا)[2]

(و) شرم اور حیا کی سخت تاکید کی گئی ہے، اور اسے ایمان کا ایک ضروری جزو قرار دیا گیا ہے۔ (اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ)[3]

(ز) مردوں اور عورتوں دونوں کو حکم ہے کہ اگر ان کی نظر مقابل صنف پر پڑ جائے تو اسے دیکھتے نہ رہیں، بلکہ نظریں فوراً نیچی کرلیں (قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ...... وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا)[4]
اسی طرح کسی کے گھر میں بلا اطلاع و اجازت اچانک نہ چلے جایا کریں (يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا)[5]

(ح) بدکاری کے چرچے کرنا سخت ممنوع ہے۔ کیوں کہ اس سے معاشرے کی ذہنی پاکیزگی مجروح ہو جاتی ہے، اور اس برائی کے خلاف لوگوں کی فطری اور ایمانی

---

[1] سورہ احزاب - ۳۲ [2] مسلم، جلد دوم، باب النساء الکاسیات العاریات۔
[3] بخاری، جلد اول، باب امور الایمان [4] سورہ نور - ۳۰ - ۳۱ [5] سورہ نور - ۲۷

نفرت ہلکی پڑنے لگتی ہے۔ اس لیے ان لوگوں کو سخت وعید سنائی گئی ہے جو اس طرح کے تذکرے کیا کرتے ہیں (کُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافیً اِلَّا الْمُجَاھِرِیْنَ[1]) یا معاشرے کو فواحش پسند دیکھنا چاہتے ہیں (اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ[2])۔

(ط) نکاح کی ہدایت کی گئی ہے اور جوانوں کے مجرّد رہنے کو خاص طور پر سخت ناپسند کیا گیا ہے (مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْکُمُ الْبَاءَۃَ فَلْیَتَزَوَّجْ فَاِنَّہٗ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرْجِ[3]) حکم ہے کہ جیسے ہی کوئی لڑکی جوانی کی عمر کو پہنچے، مناسب رشتہ ملنے پر اس کا فوراً نکاح کر دو۔ (اِذَا خَطَبَ اِلَیْکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَہٗ وَخُلُقَہٗ فَزَوِّجُوْہُ اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِیْضٌ[4]) پھر اس نکاح کے معاملے کو بہت ہی سادہ اور آسان بھی رکھا گیا ہے۔ بہت ہی قریب کے چند رشتوں کو چھوڑ کر باقی تمام لوگوں سے نکاح جائز ہے۔ اسی طرح ذات پات کا فرق بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ "نکاح میں لوگ عورت کے حسب و نسب کو، اس کے حُسن کو، اور اس کی دولت مندی کو دیکھا کرتے ہیں، مگر تم مسلمانوں کو اس کا دین اور اخلاق دیکھنا چاہیے"۔ (..... فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّیْنِ[5]) مہر میں بھی اعتدال پسندی کی ہدایت کی گئی ہے اور جہاں تک رسم نکاح کے انجام پانے کا سوال ہے، وہ اتنی بے خرخشے کی ہے کہ اس میں کسی دشواری کا نام تک نہیں پایا جا سکتا۔ نہ کسی مذہبی پیشوا یا حاکم کی ضرورت، نہ کسی اور بات کی شرط۔ کم از کم دو گواہوں کے سامنے مرد اور عورت اپنی اپنی رضامندی کا اظہار کر کے خود ہی اس فریضے کو انجام دے سکتے ہیں۔

(ی) کسی اخلاقی ضرورت یا معاشرتی مصلحت کا اگر تقاضا ہو تو، عادلانہ برتاؤ کی

---

[1] بخاری، جلد دوم، ص۸۹۶ [2] سورہ نور — ۱۹ [3] مسلم، جلد اول، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح ... الخ [4] ترمذی، جلد اوّل، ابواب النکاح

[5] بخاری، جلد دوم، باب الاکفاء فی الدین۔

قید کے ساتھ، ایک کے بجائے چار نکاحوں تک کی بھی اجازت ہے۔ مثلاً کسی یتیم بچے کی ٹھیک پرورش اس کے بغیر نہ ہوسکتی ہو کہ اسے اپنا سوتیلا بچہ بنا لیا جائے، یا کسی شخص کو صرف ایک بیوی کے ذریعے اپنی عفت کی حفاظت دشوار نظر آتی ہو، (فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ [1])

(ک) بیوہ عورتوں اور رنڈووں کو پھر سے ازدواجی زندگی اختیار کر لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اسی طرح اگر لونڈی غلام موجود ہوں تو حکم ہے کہ اُن کا عقد کر دو (وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَائِکُمْ [2]) تاکہ معاشرے میں کوئی ایسا شخص، جو جنسی خواہش اور قوت رکھتا ہو، مجرد نہ رہ جائے ورنہ اندیشہ رہے گا کہ کہیں وہ کسی معصیت میں مبتلا نہ ہو جائے۔

(۵) ایسے تمام مشاغل سے احتراز کیا جائے جو انسان میں عموماً شہوت پرستی یا لذت پرستی کے رجحان کو اُکسا دیا کرتے ہیں، یا اس کی عقلی قوتوں کو معطل، اور اخلاقی حس کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناچ گانے، باجے، شراب اور دوسری نشیلی چیزوں کے استعمال کو حرام کر دیا گیا ہے۔

(۶) رہن سہن اور کھانے پینے میں اعتدال سے کام لیا جائے۔ چناں چہ مومن کی تعریف قرآن نے یہ کی ہے کہ وہ خرچ کرنے میں نہ اسراف سے کام لیتا ہے نہ بخل سے (وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا [3]) آں حضرتؐ کا ایک طرف تو یہ ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ اپنی دی ہوئی نعمت کا، اپنے بندے پر اثر ظاہر ہوتا دیکھنا چاہتا ہے"۔ (اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یَّرٰی اَثَرَ نِعْمَتِہٖ عَلٰی عَبْدِہٖ [4]) دوسری طرف آپؐ غرور یا فضول خرچی اور عیش پرستی کی روش اختیار کرنے سے بشدت منع فرماتے ہیں۔ مثلاً کوئی ایسی پوشاک نہیں پہنی جا سکتی جو بوجہ غرور

---

[1] سورہ نساء ـ ۳ [2] سورہ نور ـ ۳۲ [3] سورہ فرقان ـ ۶۷

[4] ترمذی ـ ابواب الاعیذان۔

ٹخنوں سے نیچے ہوکر زمین پر گھسٹتی رہتی ہو (اَلَّذِیْ جَرَّ ثَوْبَہٗ خُیَلَاءَ لَا یَنْظُرُ اللّٰہُ اِلَیْہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ [۱]) سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ مرد ریشم نہیں پہن سکتے ہیں (اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَہٰی عَنِ الشُّرْبِ فِیْ آنِیَۃِ الذَّہَبِ وَالْفِضَّۃِ وَلُبْسِ الْحَرِیْرِ وَالدِّیْبَاجِ ———— [۲]) رہنے سہنے کا ضرورت سے زیادہ سامان مہیّا نہ رکھنا چاہیے۔ (فِرَاشٌ لِلرَّجُلِ وَفِرَاشٌ لِامْرَأَتِہٖ وَثَالِثٌ لِلضَّیْفِ وَالرَّابِعُ لِلشَّیْطَانِ [۳]) اسی طرح اونچی اونچی کوٹھیاں اور محل بنا کر رہنا کوئی اچھی بات نہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "مومن کا ہر خرچ جو وہ اپنے اوپر کرتا ہے، دراصل اللہ کی راہ میں خرچ ہے، سوائے (ضرورت سے زائد) تعمیرات کے، کہ ان میں کوئی خیر نہیں۔" (اَلنَّفَقَۃُ کُلُّہَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِلَّا الْبِنَاءَ فَلَا خَیْرَ فِیْہِ [۴]) اور یہ کہ "عیش پرستی سے مسلمان کو بہت دور رہنا چاہیے۔" (اِیَّاکَ وَالتَّنَعُّمَ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰہِ لَیْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِیْنَ [۵])

(۷) مرد اور عورت کی پیدائشی قوتیں اور ان کے کام کے فطری دائرے جس طرح الگ الگ ہیں، اسی طرح ان کی وضع قطع بھی لازماً الگ الگ رہنی چاہیے۔ آن حضرتؐ فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے ان مردوں پر جو عورتوں کا رنگ ڈھنگ اختیار کرتے ہیں، اور ان عورتوں پر، جو مردوں کا رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہیں، لعنت فرمائی ہے۔ (لَعَنَ اللّٰہُ الْمُتَشَبِّہِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّہَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ [۶])

(۸) کبھی صبر و تحمّل اور وقار و متانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ کسی عزیز قریب کی موت انسان کے لیے بڑی صبر آزما گھڑی ہوتی ہے۔ مگر حکم ہے کہ ایسے

---

[۱] موطا، ما جاء فی اسبال الرجل ثوبہ۔ [۲] ترمذی، جلد اول، ابواب الاشربہ۔
[۳] مسلم، جلد دوم، باب کراہۃ ما زاد علی الحاجۃ من الفراش واللباس۔
[۴] ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الرقاق۔ [۵] احمد، بحوالہ مشکوٰۃ، باب فضل الفقراء۔
[۶] بخاری، بحوالہ مشکوٰۃ، باب الترجل۔

وقت بھی بے صبری اور جزع فزع کا مظاہرہ نہ ہونے پائے۔ (... وَاَنْ لَّا نَخْمُشَ وَجْهًا وَّ لَا نَدْعُوَ وَيْلًا وَّ لَا نَشُقَّ جَيْبًا وَّ لَا نَنْشُرَ شَعْرًا[1]) اسی طرح بڑی سے بڑی خوشی کے موقع پر بھی آپے سے باہر نہ ہونا چاہیے۔ (وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ[2])

پھر وقار اور متانت ہی نہیں، بلکہ ذوقِ سلیم تک کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ حکم ہے کہ "بائیں ہاتھ سے نہ کھاؤ"۔ (... لَا تَاْكُلُوْا بِالشِّمَالِ[3]) "دائیں ہاتھ سے استنجا نہ کرو، بلکہ اس سے شرم گاہ کو چھوؤ تک نہیں"۔ (... لَا يَسْتَنْجِيْ بِيَمِيْنِهٖ[4]) "ایک پاؤں میں جوتا پہن کر نہ چلو"۔ (لَا يَمْشِيْ اَحَدُكُمْ فِيْ نَعْلٍ وَّاحِدَةٍ[5]) "سر کا صرف کچھ حصہ نہ منڈاؤ"۔ (اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْقَزَعِ[6])

(۹) ایسے کام نہ کیے جائیں جن کا کوئی اُخروی یا دنیوی فائدہ نہ ہو۔ مومن کی بنیادی صفات میں سے قرآن مجید نے ایک صفت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ 'لغو' یعنی بے فائدہ کاموں سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا۔ (وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ[7]) اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "کسی کے اچھے مسلم ہونے کی علامت یہ ہے کہ آدمی لایعنی کاموں سے (بھی) دور رہے"۔ (مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ[8])

(۱۰) ایسے طور طریقے نہ اختیار کیے جائیں جن میں کسی غیر اسلامی معاشرے کی کوئی خاص رُوح کام کر رہی ہو، اور جن کو اپنا لینے کے بعد مسلمانوں کا تہذیبی تشخص یا دینی مزاج مجروح ہو جاتا ہو، مثلاً حکم ہے کہ:۔

(الف) کوئی مسلمان ایسی وضع نہ اختیار کرے جو غیر مسلموں یا فاسقوں کے لیے مخصوص ہو، ورنہ اس کا شمار ان ہی میں سے ہوگا۔ (مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ[9])

---

[1] ابوداؤد، جلد دوم، باب فی النوح [2] سورہ حدید-۲۳۔ [3] ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، باب الاکل بالیمین۔ [4] بخاری، جلد اول، باب لایمس ذکرہ بیمینہ۔ [5] مسلم، جلد دوم، باب استحباب لبس النعال۔ الخ [6] بخاری، جلد دوم، باب القزع [7] سورہ المومنون ۳۔ [8] موطا، باب ماجاء فی الخلق [9] ابوداؤد، جلد دوم، باب ماجاء فی الاقبیہ۔

(ب) داڑھی اور مونچھ کے معاملے میں مشرکوں سے مخالف رویّہ اختیار کرو، داڑھی بڑھاؤ اور مونچھ کترواؤ۔ (خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَفِّرُوا اللِّحٰى وَاَحْفُوا الشَّوَارِبَ[1])

(ج) یہودی اور عیسائی اپنے سفید بالوں کو یوں ہی رہنے دیتے ہیں، ان میں خضاب نہیں لگاتے، تم مسلمانوں کو ان کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ (اِنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى لَا يَصْبُغُوْنَ فَخَالِفُوْهُمْ[2])

غرض اسلامی معاشرے کا مزاج 'حنیفی' اور یک رنگ بنایا گیا ہے۔ مسلمانوں کا معاشرتی امتیاز ہر حال میں برقرار اور ہر پہلو سے نمایاں رہنا چاہیے۔ ان کے لیے ایسی رواداری، رواداری نہیں، بلکہ مداہنت ہے جس سے اسلام اور غیر اسلام میں کوئی ادنیٰ سی بھی جوہری ہم رشتگی ظاہر ہوتی ہو۔ اسلام صرف اس بات کا قائل ہے کہ سفیدی اور چیز ہے اور سیاہی دوسری چیز، اس بات کا بالکل قائل نہیں کہ سفیدی اور سیاہی دونوں ایک ہی جیسی چیزیں ہیں۔

۵۔ معاشی نظام

جو شخص اسلام کو جانتا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کی نگاہ میں انسان کا اصل مفاد اس کی آخرت کا مفاد ہے۔ اسے آخرت ہی کے لیے جینا اور مرنا چاہیے۔ اور مسلم کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دے، اور اسی کو اپنا اصل مرکزِ توجہ بنائے رکھے۔ یہ ایک روشن اور بدیہی حقیقت ہے، سورج سے بھی زیادہ روشن اور بدیہی حقیقت۔ لیکن غلط فہمی نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلام دنیا کی ان چیزوں کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا جو انسان کی مادّی زندگی کے لیے مطلوب ہوتی اور ہو سکتی ہیں۔ اس نے اس زمین پر انسان کی جو تخلیقی حیثیت قرار دی ہے، اس کی پیدائش کا جو مقصد بتایا ہے، روحانی بلندی اور تقرب الٰہی کا جو تصوّر پیش کیا ہے اور اس کے لیے جو شاہراہ مقرر کی ہے ــــ ان ساری چیزوں

---

[1] بخاری، جلد دوم، باب تقلیم الاظفار۔ [2] بخاری، جلد دوم، باب الخضاب۔

کو دیکھتے ہوئے ایسا خیال کرنا، کہ اسلام انسان کی مادّی ضرورتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، کھلی ہوئی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ 'مومن' اور 'مسلم' محض روح کا نام نہیں ہے، بلکہ رُوح اور جسم دونوں کے مجموعے کا نام ہے، اور ایک مسلمان کو اس دنیا میں اپنا فرض بجالانے، اپنا مشن پورا کر دینے، اور اپنے پروردگار کی رضا حاصل کر لینے کے لیے جو کچھ کرنا ہے اس کے لیے جسم اور جسمانی قوتیں بھی ضرورت کی چیز ہیں، اور ان کا استعمال ناگزیر ہے۔ ایسی حالت میں وہ سروسامان بھی کیوں ضروری نہ ہوگا جس پر اس جسم کی اور ان جسمانی قوتوں کی بقا موقوف ہے، اور جسے ہم انسان کی معاشی ضرورت کہتے ہیں؟ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:-

طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ۔[1]

فرض عبادتوں کے بعد حلال روزی کمانا بھی فرض ہے۔

اسی طرح قرآن مجید نے سامانِ زیست کو جگہ جگہ مَالُ اللهِ (اللہ کا مال) طَیِّبَات، (پاکیزہ چیزیں) نِعْمَةُ اللهِ، (اللہ کی نعمتیں) اور فَضْلُ اللهِ، (اللہ کا فضل) کہا ہے۔

غرض زندگی کی مادّی ضرورتوں کو بھی اسلام قرار واقعی اہمیت دیتا ہے، اور چاہتا ہے، چاہتا ہی نہیں، بلکہ اس کا اس نے پورا پورا اہتمام بھی کر رکھا ہے کہ کوئی شخص اس سامانِ زیست سے محروم نہ رہ جائے۔ یہ اہتمام ہمہ گیر قسم کا ہے، اور چار طرفی مؤثر تدبیروں پر مشتمل ہے:-

(۱) ہر شخص کو اپنی روزی خود کمانے کی ترغیب و ہدایت۔

(۲) کمانے اور خرچ کرنے کی ضروری آزادی، اور ان پر ضروری پابندیاں۔

(۳) حاجت مند افراد کی ضرورتیں پوری کرنے کے بارے میں دولت مندوں کو اخلاقی ہدایتیں۔

---

[1] بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ، باب الکسب۔

(۴) حاجت مندوں کے بارے میں دولت مندوں کی قانونی ذمہ داریاں۔

اِن چاروں تدبیروں کی مختصر تشریح یہ ہے :-

— ہر شخص کو اپنی روزی خود کمانے کی ترغیب و ہدایت :-

۱۔ ہر انسان کو اپنی روزی کمانے کی کوشش کو ایک شرعی ذمے داری سمجھنا چاہیے (طَلَبُ کَسْبِ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ) اور کسی پر بار بننے کے بجائے اپنا رزق خود اپنا پسینہ بہاکر حاصل کرنا چاہیے۔ (مَا اَکَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَیْرًا مِّنْ اَنْ یَّاْکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدَیْہِ[1])

۲۔ بھیک مانگ کر اپنی روزی چلانا سخت معیوب ہے، اور جو شخص بھی کسی واقعی مجبوری کے بغیر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے وہ حرام کماتا اور حرام کھاتا ہے (..... فَمَا سِوَاھُنَّ مِنَ الْمَسْئَلَۃِ یَا قبیصۃُ سُحْتٌ یَاْکُلُھَا صَاحِبُھَا سُحْتًا[2])

— کمانے اور خرچ کرنے کی ضروری آزادی، اور ان پر ضروری پابندیاں :-

۱۔ روزی کمانے کے سارے جائز ذرائع ہر شخص کے لیے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ معاشی میدان میں جدوجہد کا سب کو مساوی حق حاصل ہوگا۔ یہاں اجارہ داری نام کی کوئی چیز نہ ہوگی۔ زراعت، تجارت، صنعت، ملازمت، غرض روزی کمانے کا کوئی جائز ذریعہ کسی شخص کے لیے ممنوع نہ ہوگا۔ ہر شخص اپنی صلاحیت اور اپنی پسند کے مطابق ذریعۂ معاش اختیار کرنے میں بالکل آزاد ہوگا۔ کیوں کہ اس زمین پر روزی کے جتنے وسائل ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا اپنے سارے ہی بندوں کے لیے کیا ہے (خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔[3]) اس لیے اُن سے استفادہ کرنے کا اصولی طور پر سب کو یکساں حق حاصل ہے۔

---

[1] بخاری، جلد اوّل، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ [2] مسلم، جلد اول، باب من تحل لہ المسئلہ [3] سورہ بقرہ - ۲۹۔

(۲) زمین اور فضا کی ایسی تمام چیزوں سے، جن کے پیدا کرنے اور کار آمد بنانے میں کسی انسانی محنت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ سب لوگ اپنی ضرورت کے مطابق فائدہ اُٹھانے کا برابر کا حق رکھتے ہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے :۔

اَلْمُسْلِمُوْنَ شُرَكَاءُ فِيْ ثَلَاثٍ فِي الْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ۔[1]

تمام مسلمان تین چیزوں میں برابر کا حق رکھتے ہیں :۔ پانی، گھاس اور آگ۔

اِس حدیث میں نام اگرچہ صرف تین چیزوں کا لیا گیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک اصولی ہدایت ہے، اور اس سے مُراد یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں اصلاً سب کے لیے یکساں طور پر مباح ہیں جن کی پیدائش قدرتی طور پر آپ سے آپ ہوئی ہو، اور جن میں کسی شخص کی محنت نہ لگی ہو۔ چناں چہ آں حضرتؐ نے اس شخص کے بارے میں جو ایسی چیزوں کے استعمال سے لوگوں کو روکے، فرمایا ہے کہ :۔

.... فَيَقُوْلُ اللّٰهُ الْيَوْمَ اَمْنَعُكَ فَضْلِيْ كَمَا مَنَعْتَ فَضْلَ مَالَمْ تَعْمَلْ يَدَاكَ۔[2]

.... اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے کہے گا کہ آج میں تمہیں اپنے فضل سے محروم رکھوں گا جس طرح کہ تم نے لوگوں کو اُس چیز کے "فضل" (یعنی فاضل حصّے) سے محروم کر رکھا تھا جسے تیرے ہاتھوں نے بنایا اور تیار نہیں کیا تھا۔

غرض دریاؤں، تالابوں اور چشموں کا پانی، جنگل کی لکڑی اور گھاس اور خود رَو درختوں کے پھل، فضا کے پرندے، پانی کی مچھلیاں، صحرائی جانور، کھلی

---

[1] ابوداؤد، جلد ۲، باب فی فضل الماء۔

[2] ترمذی، جلد اول، باب ما ذکر فی احیاء الارض الموات۔

ہوئی کانیں، نمک کے ذخیرے وغیرہ — ساری چیزیں عام استعمال کے لیے وقف رہیں گی۔ اُفتادہ اراضی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جو چاہے اسے جوت کر اور تیار کر کے کاشت کر سکتا ہے۔ کوئی اُسے روک نہیں سکتا:۔

عَادِیُّ الْاَرْضِ لِلّٰہِ وَلِرَسُوْلِہٖ ثُمَّ ھِیَ لَکُمْ مِنِّیْ۔[1]

اُفتادہ زمینیں اللہ کی اور اس کے رسول کی ہیں۔ پھر یہ میری طرف سے تمہارے لیے عطیہ ہیں۔

(۳) عام استعمال کی اِن چیزوں میں سے جس قدر حصّے کو بھی کوئی شخص اپنی محنت اور قابلیت صرف کر کے اپنے قبضے میں لے لے گا، اس کا وہ مالک ہو جائے گا۔ اب اس سے وہ چیز چھینی نہیں جا سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

مَنْ اَحْیٰی اَرْضًا مَیْتَۃً فَھِیَ لَہٗ۔[2]

جس کسی نے کوئی بنجر زمین قابلِ کاشت بنالی وہ اس کا مالک ہے۔

(۴) کوئی شخص معاش کے قدرتی ذرائع کو اپنی ملکیت میں لا چکنے کے بعد اُسے بے کار چھوڑے نہیں رکھ سکتا۔ اگر تین برس تک اس نے کوئی زمین بے کار چھوڑے رکھی تو وہ پھر اپنی اصل حالت — مباحِ عام حالت — میں واپس لوٹ جائے گی اور اس وقت جو شخص بھی چاہے گا اسے اپنے تصرف میں لا کر آباد کر سکے گا۔ (لَیْسَ لِمُحْتَجِرٍ حَقٌّ بَعْدَ ثَلَاثِ سِنِیْنَ[3])

(۵) ہر شخص کو آزادی ہے کہ اپنی دولت کو مزید دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے۔ تجارت اور صنعت، دونوں چیزوں کی، جو دولت سے مزید دولت پیدا کرنے کی عملی شکلیں ہیں، شریعت نے بڑی ترغیب دی ہے، اور ان کی بڑی فضیلتیں بیان کی ہیں۔

---

[1] بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم ص۱۰۳۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم ص۱۰۳۔
[3] کتاب الخراج ص۶۵۔

(۶) دولت سے مزید دولت بلا روک ٹوک نہیں پیدا کی جا سکتی، بلکہ اس پر چند زبردست اخلاقی اور قانونی پابندیاں عائد ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:-

(الف) معاملہ کرنے میں بے لاگ صداقت اور دیانت ضروری ہے۔ گاہک کو دھوکا دینا اور اس سے اپنی چیز کا عیب چھپا رکھنا بڑا بھاری گناہ ہے۔ ارشادِ نبوی ہے کہ "جس نے دھوکا دیا وہ میرے لوگوں میں سے نہیں"۔ (مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا۔[۱])

(ب) اپنی بکری بڑھانے کے لیے جھوٹی قسمیں کھانا بڑی معصیت کی بات ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایسا شخص قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم سے محروم رہے گا۔ (ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ.... وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلْفِ الْكَاذِبِ[۲])

(ج) سودی کاروبار کی، خواہ وہ کسی شکل میں ہو قطعی ممانعت ہے۔ سود لینا اور دینا بالکل حرام ہے (اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔[۳]) نہ صرف حرام ہے، بلکہ ایسا فوجداری جرم ہے جس کی حیثیت اسلام سے بغاوت اور اسلامی اسٹیٹ کے خلاف اعلانِ جنگ کی سی ہے (... فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ[۴])

(د) کوئی ایسا مشترکہ کاروبار نہیں کیا جا سکتا جس میں ایک فریق کا نفع تو یقینی ہو، لیکن دوسرے کا غیر یقینی اور مشتبہ ہو۔ ایسے سارے معاملات سودی کاروبار ہی کی تعریف میں آتے ہیں۔

(ہ) جُوا حرام اور ایک ناپاک فعل ہے۔ اس سے دور رہنا چاہیے (اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ[۵]) نہ صرف یہ کہ معروف شکل کا جُوا نہیں کھیلا جا سکتا، بلکہ کوئی بھی ایسا کاروبار یا معاملہ نہیں کیا جا سکتا جس میں جُوئے کی رُوح پائی جاتی ہو، مثلاً سٹہ، لاٹری اور

---

[۱] ترمذی، جلد اوّل، باب ماجاء فی کراھیۃ الغش فی البیوع [۲] مسلم جلد اول، باب غلظ تحریم اسبال الازار۔ [۳] سورہ بقرہ۔ ۲۷۵۔ [۴] سورہ بقرہ۔ ۲۷۹۔ [۵] سورہ مائدہ۔ ۲

موجودہ انشورنس وغیرہ۔

(د) جن چیزوں کا کھانا پینا حرام ہے، مثلاً شراب، خون، سور اور مردار وغیرہ، ان کی تجارت بھی حرام ہے (اِنَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ حَرَّمَ بَیْعَ الْخَمْرِ وَالْمَیْتَۃِ وَالْخِنْزِیْرِ وَالْاَصْنَامِ[1]) (اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے شراب کی، مردار کی، سور کی اور بتوں کی تجارت کو حرام قرار دے دیا ہے) نہ صرف یہ کہ ان کی تجارت حرام ہے۔ بلکہ ان کی قیمت بھی حرام ہے (اِنَّ اللّٰہَ اِذَا حَرَّمَ عَلٰی قَوْمٍ اَکْلَ شَیْءٍ حَرَّمَ عَلَیْھِمْ ثَمَنَہٗ[2]) اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کے لیے کسی چیز کا کھانا حرام کرتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام فرما دیتا ہے۔

(ز) کاروبار میں کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کیا جا سکتا جس سے دوسرے افراد کو یا پورے سماج کو نقصان پہنچتا ہو۔ بھاؤ بڑھانے کے لیے ضروریاتِ زندگی کو روکے رکھنا سخت منع ہے، اور ایسے تاجروں پر لعنت کی گئی ہے (اَلْمُحْتَکِرُ مَلْعُوْنٌ[3]) اسی[4] طرح منڈی میں آنے والے سامانِ تجارت کو آگے بڑھ کر، راستے ہی میں خرید لینا جائز نہیں (لَا تَلَقَّوُا الْجَلَبَ[4]) نیز[5] کسی شہری کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ کسی دیہاتی کا، جو منڈی میں اپنا غلّہ بیچنے لایا ہو، وکیل اور ایجنٹ بن جائے اور اس کا غلّہ زیادہ داموں بیچنے کے لیے اپنے پاس رکھ لے (لَا یَبِیْعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ[5])

(ح) کوئی ایسا لین دین نہیں کیا جا سکتا جس میں بیچی جانے والی چیز بیچنے والے کے اپنے قبضے میں نہ ہو۔ کیوں کہ اس سے نزاع پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ نیز یہی چیز آگے بڑھ کر سٹّے کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس سے ضرورت کی چیزوں کا بھاؤ دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ جایا کرتا ہے (لَا تَبِعْ مَا لَیْسَ عِنْدَکَ[6])

---

[1] بخاری، جلد اول، باب بیع المیتۃ والاصنام۔ [2] ابو داؤد، جلد دوم، باب فی ثمن الخمر والمیتۃ۔
[3] ابن ماجہ، دارمی بحوالہ مشکوٰۃ، باب الاحتکار۔ [4] مسلم، جلد دوم، باب تحریم تلقی الجلب۔
[5] بخاری، جلد اول، باب النہی للبائع ان لا یحفل الابل۔ [6] ابو داؤد، کتاب البیوع۔

(ط) جس طرح روزی روزگار کے وہ سب طریقے ممنوع ہیں جو دوسروں کے لیے مادّی نقصان کا سبب بنتے ہوں، اسی طرح وہ ذرائع بھی ممنوع ہیں جن سے لوگوں کو اخلاقی یا دینی نقصان پہنچتا ہو۔ نشیلی چیزوں کو، تصویروں کو، رقص و سرود کو، فحش لٹریچر کی تیاری اور نشر واشاعت کو، موجودہ قسم کے سینما کو، اور اسی قماش کی دوسری چیزوں کو روزی کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔

(ی) لین دین کا کوئی ایسا معاملہ جو دھوکے کی نوعیت کا ہو اور اس وجہ سے فریقین میں نزاع اُٹھ کھڑا ہوسکتا ہو، نہیں کیا جاسکتا۔ (اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنْ بَیْعِ الْغَرَرِ[1])

(۷) مذکورہ بالا حدود کی پابندی کرتے ہوئے جو دولت بھی حاصل ہوگی، وہ اگرچہ فرد کی اپنی جائز ذاتی ملکیت ہوگی جس کو وہ بطور خود خرچ کرسکے گا، لیکن بطور خود خرچ کرسکنے کا یہ اختیار غیر مشروط اور غیر محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس پر بہت سی اخلاقی اور قانونی پابندیاں عائد ہیں۔ اگر اس نے ان پابندیوں کو توڑا تو حکومت اس کا ہاتھ پکڑ لے گی، اور اگر وہ حکومت کی گرفت میں آنے سے بچ بھی رہا تو آخرت کی گرفت میں آنے سے تو بہر حال نہ بچ سکے گا۔ ان پابندیوں میں سے کچھ کی تفصیل اس بحث کی اگلی شقوں میں آرہی ہے، اور کچھ 'معاشرتی نظام' کی بحث میں بیان کی جاچکی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ معقول انداز کی آرام دہ اور خوش حال زندگی تو ضرور گزاری جاسکتی ہے، لیکن عیش پرستی کی، بدمستی کی، فخر و غرور کی اور نمود و نمائش کی زندگی ہرگز نہیں گزاری جاسکتی۔

— حاجت مند افراد کی ضرورتیں پوری کرنے کے بارے میں دولت مندوں کو اخلاقی ہدایتیں:۔

روزی کمانے اور دولت پیدا کرنے کی آزادی اگرچہ سب لوگوں کو برابر کی حاصل ہے

---

[1] ابوداؤد، جلد دوم، باب فی بیع الغرر۔

لیکن چوں کہ پیدائشی طور پر سارے افراد کو ذہن اور جسم کی قوتیں برابر کی نہیں ملی ہیں، بلکہ ان میں بڑا بھاری تفاوت ہوتا ہے، پھر حالات اور اتفاقات بھی سب کا یکساں ساتھ نہیں دیا کرتے، اس لیے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ تمام لوگوں کی معاشی جدوجہد کے نتائج برابر کے اور بہتر ہی ہوں گے۔ اس کے بخلاف عین ممکن ہے، اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ صرف یہی ممکن ہے کہ معاشرے کے کچھ افراد لاکھوں کے مالک بن گئے ہوں تو کچھ دو وقت کی روٹی بھی نہ پیدا کر سکے ہوں۔ حالاں کہ ہر فرد کے لیے ضروریاتِ زندگی معاشی ضرورتوں کی فراہمی، جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا، اس کی صرف دنیوی ضرورت ہی نہیں دینی ضرورت بھی ہے۔ دوسری طرف نوعِ انسانی کی حیثیت اسلام یہ قرار دیتا ہے کہ وہ پوری کی پوری اللہ کی "عیال" ہے (اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ[1]) اگر ہم اپنی عیال کو ننگا بھوکا دیکھنا پسند نہیں کرتے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ رؤف و رحیم خدا اپنی "عیال" کو ننگا بھوکا دیکھنا پسند کرے گا۔ اِن وجوہ سے اسلام پورا زور دے کر کہتا ہے کہ معاشی جدوجہد میں ناکام رہ جانے والے افراد کی ضرورتیں وہ لوگ پوری کریں جو اس جدّ و جہد میں کام یاب ہوں۔ یہ ان کی، اور معاشرے کے اجتماعی نظام، یعنی حکومت کی ذمّہ داری ہے کہ انھیں بھوکا ننگا نہ رہنے دیا جائے۔ کیوں کہ اس دنیا میں رزق کا جو سامان اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے وہ اس کے سارے باشندوں کے لیے اُتارا ہے۔ اس لیے اگر اپنی معاشی دوڑ دھوپ کے نتیجے میں کسی وجہ سے کچھ لوگ اپنی واقعی ضرورت کے بقدر بھی نہیں کما پاتے، اور کچھ اپنی ضرورت سے زیادہ کما لیتے ہیں، تو ان کی یہ زائد کمائی دراصل ان کی اپنی ضرورت کی اور اپنے استحقاق کی چیز نہیں ہوتی، بلکہ یہ فی الواقع دوسروں کا حق ہوتا ہے جو مشیت کی حکمت اور مصلحت کے تحت ان کے پاس پہنچ گیا ہے۔ گویا اس کی حیثیت ایک امانت کی سی ہوتی ہے جس کے وہ امین ہوتے ہیں۔ ان امینوں کا فرض ہے کہ اصل حق داروں کو ان کا حق اور ان کی امانت پہنچا دیں۔

---

[1] بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ ص۴۲۵

اہلِ ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے قرآنِ حکیم نے صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ:۔

وَفِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔[1]

ان کے مالوں میں سائلوں اور ناداروں کا "حق" ہوتا ہے۔

معاشرے کے نادار اور محتاج افراد تک ان کا یہ "حق" پہنچا دینے کے بارے میں مال داروں کو جو اخلاقی ہدایتیں دی گئی ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ "لوگو! تم نیکی کا مقام ہرگز نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنے محبوب مالوں کا ایک حصہ راہِ خدا میں خرچ نہ کرو۔" (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔[2])

۲۔ "یہ بات ایمان کے منافی ہے کہ کوئی شخص اپنا پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوک سے کروٹیں بدل رہا ہو۔" (لَیْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِیْ یَشْبَعُ وَجَارُہٗ جَائِعٌ اِلٰی جَنْبِہٖ[3])

۳۔ دولت مندی ایک کڑی آزمائش، بلکہ ایک خطرناک فتنہ ہے، اور عام طور سے بدترین انجام ہی کا سبب بنتی رہتی ہے۔ اس بُرے انجام سے صرف وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو اپنی دولت کو اللہ کے محتاج بندوں پر، اور دوسرے دینی کاموں میں بے دریغ خرچ کرتے رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ "ربِّ کعبہ کی قسم، یہی لوگ سب سے زیادہ گھاٹے میں رہیں گے۔" پوچھا گیا "یہ کون لوگ ہیں؟" فرمایا "یہ دولت کے کھتّے رکھنے والے ہیں، ان میں سے صرف وہی لوگ اس مآلِ بد سے محفوظ رہیں گے جو اپنی دولت راہِ خدا میں برابر اور بے تکان دیتے رہتے ہیں۔ اور ایسے لوگ زیادہ نہیں ہوتے۔[4]"

—— حاجت مندوں کے بارے میں دولت مندوں کی قانونی ذمّہ داریاں:۔

---

[1] سورۂ ذاریات ۔ ۱۹۔ [2] سورہ آل عمران ۔ ۹۲ [3] بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔ [4] بخاری، کتاب الایمان۔ باب کیف کان یمین النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

حاجت مندوں کے اس "حق" کی اہمیت کے پیشِ نظر، دولت مندوں پر، اِن اخلاقی ہدایتوں کے ساتھ ساتھ، کچھ قانونی ذمہ داریاں بھی عائد کی گئی ہیں، اور وہ یہ ہیں :-

۱۔ ہر شخص کو جو نادار نہیں ہے، سال بہ سال اپنی دولت اور اپنی پیداوار کا ایک خاص حصّہ غریبوں کے قانونی حق کے طور پر لازماً دینا پڑے گا۔ معاشرے کا ایک اجتماعی نظم ایک ایک فرد سے زکوٰۃ اور عشر کی یہ مقدار وصول کرے گا اور اسے غریبوں تک پہنچانے کا انتظام کرے گا۔ کوئی شخص زکوٰۃ اور عشر دینے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اگر کرے گا تو نہ صرف یہ کہ اپنی آخرت بگاڑے گا، بلکہ دنیا میں بھی حکومت کے سخت ترین اقدام سے دوچار ہوگا۔

۲۔ اگر زکوٰۃ اور عشر کی یہ مقدار غریبوں کی ضرورتیں پوری کرنے اور دوسرے ملّی کاموں کے لیے کافی نہ ہو سکے تو حکومت دولت مندوں پر ٹیکس بھی عائد کرے گی۔

۳۔ جب کوئی شخص وفات پا جائے تو اس کی چھوڑی ہوئی دولت اس کے متعدد قریبی عزیزوں میں تقسیم کر دی جائے گی اور اگر قریب کے عزیز موجود نہ ہوں تو دُور کے رشتے داروں میں بانٹ دی جائے گی۔ (اس غرض کے لیے شریعت میں وراثت کا مفصل قانون موجود ہے) اس طرح دولت معاشرے میں چند جگہوں پر سمٹی رہنے کے بجائے مختلف سمتوں میں برابر پھیلتی رہتی ہے۔ جس سے ناداری کا حلقہ برابر سکڑتا رہتا ہے۔ کیوں کہ دولت کی گردش اور اس کی مناسب تقسیم کسی معاشرے میں معاشی اُونچ نیچ کم کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہوتی ہے۔

۶۔ سیاسی نظام

اسلامی نظامِ سیاست کی بنیاد دو سب سے زیادہ اساسی حقیقتوں پر مبنی ہے :-

(الف) اللہ تعالیٰ کی حیثیت، جو وہ اس کائنات کے، خصوصاً نوعِ انسانی کے

مقابلے میں رکھتا ہے، جس طرح خالق اور پروردگار ہونے کی ہے اسی طرح اس کے حاکم حقیقی ہونے کی بھی ہے۔

(ب) انسان کی حیثیت جس طرح اللہ رب العالمین کی مخلوق اور پروردہ ہونے کی ہے، اسی طرح اس کے غلام (عبد) اور اس زمین پر اس کے نائب (خلیفہ) ہونے کی بھی ہے۔

ان دونوں اساسی حقیقتوں کی بنیاد پر اسلام نے سیاست کا جو نظام مقرر کیا ہے اس کے نمایاں خطوط یہ ہیں:-

(۱) اقتدار اعلیٰ اور حقِ حاکمیت اصلاً اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں کوئی فرد یا کوئی خاندان، یا کوئی طبقہ، بلکہ پوری نوعِ انسانی بھی ذرّہ برابر اس کی شریک اور حصّہ دار نہیں۔ سب کے سب اس کی پیدائشی رعیت ہیں۔ (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔[۱])

(۲) اصل قانون دہندہ صرف اللہ ہے۔ اُسی کا دیا ہوا آئین انسانی زندگی کا آئین، اور اسی کا دیا ہوا قانون انسانی زندگی کا قانون ہے۔ کسی بھی فرد یا ادارے کو بطورِ خود یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے یا کسی اور کے لیے آئین و قانون بنائے۔

(۳) اللہ کا نبی اس دنیا میں اس کا نمائندہ اور اس کے احکام و مرضیات کا شارح ہوتا ہے اس لیے اس کی حیثیت بھی تحتی قانون ساز کی ہے، اور اس کے دیے ہوئے احکام بھی اسی طرح واجب الاطاعت ہوں گے جس طرح خود اصل قانون ساز یعنی اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں۔ (مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا[۲]) اور رسولؐ کی اطاعت عین اطاعتِ الٰہی ہوتی ہے (مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔[۳])

(۴) اللہ و رسول کے دیے ہوئے احکام و قوانین کی ٹھیک ٹھیک پیروی کے لیے، اور معاشرے میں ان کے نفاذ کے لیے ایک اجتماعی نظم اور ایک حکومتی ادارے کا قیام

---

[۱] سورہ یوسف۔ ۴۰۔ [۲] سورہ حشر۔ ۷ [۳] سورہ نساء۔ ۸۰۔

ضروری ہے۔ علماء شریعت نے صراحت سے لکھا ہے کہ:۔

الإجماع علی أن نصب الإمام واجب۔[1]

اس امر پر اُمت کا اجماع ہے کہ امام (امیر المومنین) کا تقرر واجب ہے۔

اصطلاحِ شریعت میں اس اجتماعی نظم اور حکومتی ادارے کو 'خلافت'، یا 'امامت'، یا 'امارت'، کہا گیا ہے، اور یہ بنیادی طور پر ایک فرد پر مشتمل ہوتا ہے، جسے خلیفہ یا امام یا امیر کہتے ہیں۔

(۵) اسلامی ریاست کا حقِ شہریت ہر اس شخص کو حاصل ہوگا جو اسلام پر ایمان رکھتا ہو۔ اس طرح صرف وہی مسلمان اس ریاست کے شہری نہ ہوں گے جو اس کی حدود میں پیدا ہوئے ہوں، بلکہ دنیا کے کسی بھی حصّے کا رہنے والا مسلمان جیسے ہی اس ریاست میں آئے گا آپ سے آپ اس کا شہری بن جائے گا۔ (وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ)[2]

(۶) اسلامی ریاست کے اندر رہنے والے جو لوگ اسلام کو اپنا دین نہ مانتے ہوں گے، وہ بھی اگرچہ ریاست کے شہری ہی ہوں گے، لیکن ان کی شہریت قدرے مختلف نوعیت کی ہوگی۔ اس طرح کے شہریوں کو اسلامی اصطلاح میں 'ذمی' کہا جاتا ہے۔ ذمّی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ریاست ازروئے معاہدہ ان کی جان ومال اور عزّت کی حفاظت کی ذمّہ دار ہوتی ہے۔ ذمیّوں کے حقوق خلیفہ اور ریاست کی مرضی پر موقوف نہیں ہوتے، کہ وہ جب چاہے ان میں کمی کر دے۔ بلکہ اللہ و رسول کی طرف سے طے شدہ ہوتے ہیں، اور اسلامی حکومت ہر حال میں انہیں پُورا کرنے کی پابند ہوتی ہے۔

(۷) خلیفہ کا کام یہ ہے کہ وہ حاکمِ حقیقی (اللہ تعالیٰ) کے احکام و مرضیات کے مطابق مملکت کا نظم چلائے۔ لوگوں میں عدل قائم کرے۔ ان کے حقوق کی حفاظت

---

[1] شرح عقائد نسفیہ۔ [2] سورہ توبہ ـ ۷۱

کرے۔ ملک و ملّت کا دفاع کرے۔ اور سب سے آخری بات یہ کہ اس منشا کو پُورا کرے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو نازل کیا، نبی آخر الزماں ؐ کو مبعوث فرمایا، اور امّتِ مسلمہ کو برپا کیا ہے۔ اس بارے میں وہ خدا اور خلق، دونوں کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

(۸) خلافت کی اس بھاری ذمّہ داری کا حق ادا کرنے میں خلیفہ کی مدد کرنے کے لیے ایک مجلس شوریٰ ہوگی، اور ضروری ہے کہ وہ مملکت کا نظم و نسق اس مجلس کے مشورے سے چلائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک کو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم تھا کہ وہ اہم معاملات میں اپنے اصحاب سے مشورہ کرلیا کریں۔ (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔)

(۹) خلیفہ وہ شخص بنتا ہے جسے اسلامی سوسائٹی اس بھاری ذمہ داری کا اہل سمجھتی اور اس کی خلافت پر راضی ہوتی ہے۔ وہ انتخاب کے ذریعہ برسرِ اقتدار آتا ہے، اور اگر اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہ ثابت ہو تو معزول بھی کردیا جاسکتا ہے۔ حتّیٰ کہ اگر یہ کوتاہی کبھی خلافت کے بنیادی مقصد سے روگردانی کی حد کو پہنچ جائے تو ایسی شکل میں ملّت کا یہ فرض ہوجائے گا کہ اس کے ہاتھ سے خلافت کی زمام فوراً چھین لے۔

(۱۰) خلیفہ کے انتخاب کی شکل کیا ہو، اس بارے میں شریعت نے کوئی لگا بندھا طریقہ اختیار کرنے کا حکم نہیں دیا ہے، بلکہ صرف یہ کیا ہے کہ ایک طرف تو انتخاب کا مدعا بتا دیا ہے، دوسری طرف اس کے طریقے کے بارے میں ایک اصولی ہدایت دے دی ہے۔ اب اس مدعا کو پورا کردینے والا اور اس اصولی ہدایت سے مطابقت رکھنے والا، انتخاب کا جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا وہ اسلامی طریقہ ہوگا۔ مدّعا تو یہ ہے کہ صرف ایسا شخص برسرِ اقتدار آئے جو اپنے علم، اپنے تقویٰ، اپنے تدبّر اور اپنی ذہنی صلاحیتوں اور عملی قوتوں کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی سب میں بہتر ہو، اور عام لوگوں کو اس کا اعتماد اور احترام حاصل ہو۔ اصولی ہدایت یہ ہے کہ انتخاب، بنیادی طور پر، معاشرے کے صرف وہ لوگ کریں۔ جو اپنی سوجھ بوجھ اپنی

دینی وابستگی اور اپنی قوتِ فیصلہ کے اعتبار سے ملّت کے "اولوالامر" یعنی اربابِ حل وعقد اور سربراہ ہوں، اور باقی افراد یعنی عوام اس کی توثیق کریں۔ یہ اصولی ہدایت بھی درحقیقت اسی لیے دی گئی ہے کہ انتخاب کا مدعا زیادہ اچھی طرح حاصل ہوسکے۔

(۱۱) خلافت کا منصب (اور اسی طرح حکومت کا کوئی بھی عہدہ) کسی ایسے شخص کو نہیں دیا جاسکتا جو اسے خود طلب کرے یا اس کا خواہش مند ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "بخدا ہم اس کام پر کسی ایسے شخص کا تقرر نہیں کرتے جو خود اس کا طلب گار ہو، اور نہ ایسے شخص کا جو اس کی خواہش رکھتا ہو۔" (اِنَّا وَاللّٰهِ لَا نُوَلِّیْ عَلٰی هٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَاَلَهٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْهِ[۱]) اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں حکومت 'حق' نہیں ہے، بلکہ "ذمّہ داری" اور "امانت" ہے۔ (اِنَّهَا اَمَانَةٌ[۲]) جس کی خدا کے سامنے بھاری جواب دہی کرنی ہوگی۔ (وَاِنَّهَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ خِزْیٌ وَّ نَدَامَةٌ اِلَّا مَنْ اَخَذَهَا بِحَقِّهَا وَاَدَّی الَّذِیْ عَلَیْهِ فِیْهَا[۳]) اس لیے کوئی صاحبِ احساس مومن اس کا طالب اور خواہش مند ہوکر اپنے آپ اس بات کی ہرگز جرأت نہیں کرسکتا کہ کل خدا کے سامنے جب حاضر ہو تو حساب دینے کے لیے اس کی ذمّہ داریوں میں ہزاروں اور لاکھوں بندگانِ خدا کے حقوق ادا کرنے کی عظیم ترین ذمّہ داری بھی شامل ہو، چناں چہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھی ہے کہ "تم سب سے بہتر شخص کو پاؤ گے کہ وہ اس کار امارت کو سب سے زیادہ ناپسند کرنے والا ہوتا ہے۔" (تَجِدُوْنَ مِنْ خَیْرِ النَّاسِ اَشَدَّهُمْ کَرَاهِیَةً لِهٰذَا الْاَمْرِ[۴]) پس اگر کوئی شخص کسی عہدے کی طرف از خود لپکتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ اسے اس فریضے کی نوعیت اور اس کی بھاری ذمّہ داریوں کا احساس ہی نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے جسے کسی کام کی نوعیت کا اور اس کی ذمّہ داریوں کا احساس ہی نہ ہو وہ اس کو صحیح طریقے سے انجام بھی نہیں

---

[۱] مسلم، جلد دوم، باب النھی عن طلب الامارۃ۔ [۲] [۳] مسلم، جلد دوم، باب کراہیۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ۔ [۴] بخاری، مسلم بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الامارۃ۔

دے سکتا۔

(۱۲) کسی فرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ منتخب ہو چکنے والے خلیفہ کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسلام کی شاہراہ سے ہٹ کر جاہلیت کی راہ پر جا پڑے گا۔ (مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)[۱] کیوں کہ یہ انکار دراصل ایک فرد کی خلافت کا انکار نہیں ہے، بلکہ پوری اسلامی ریاست کا انکار اور اس کے خلاف بغاوت کا اعلان ہے۔

(۱۳) ہر فرد پر شرعاً لازم ہے کہ خلیفۃ المسلمین کے احکام کی اطاعت کرے (اَطِيْعُوا اللهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ)[۲] اس کی اطاعت سے انکار دراصل خدا و رسول کی اطاعت سے انکار ہے (مَنْ يَّعْصِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِيْ)[۳] لیکن اگر وہ کسی معصیت کے کام کا حکم دے تو ایسی حالت میں اس کی اطاعت نہ کرنا لازم ہے۔ (فَاِنْ اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ)[۴]

خلیفۃ المسلمین کا صرف یہی حق نہیں ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، بلکہ یہ بھی ہے کہ دل سے اس کی خیر خواہی کی جائے۔ یہ اسلام اور دین داری کا عین تقاضا ہے (اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ قُلْنَا لِمَنْ قَالَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهِ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ)[۵]

(۱۴) عوام کا حق ہے، بلکہ ان کی ذمّہ داری ہے کہ وہ خلیفہ اور اس کے ماتحتوں پر احتساب کی کڑی نظر رکھیں۔ وہ جہاں بھی غلطی کرتے پائے جائیں فوراً ٹوک دیے جائیں۔ اگر ٹیڑھی راہ چلیں تو ہر طرح کی مناسب کوشش کر کے انھیں سیدھی راہ چلنے پر مجبور کر دیا جائے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے خلیفہ مقرر ہونے کے بعد لوگوں کو ان کی یہ ذمّہ داری یاد دلاتے ہوئے ان سے اس احتساب کا خود تقاضا کیا تھا۔

۱؎ مسلم، جلد دوم، باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین ۲؎ سورہ نساء — ۵۹۔
۳؎ مسلم، جلد دوم، باب وجوب طاعۃ الامراء ۴؎ مسلم جلد دوم، باب وجوب طاعۃ الامراء ۵؎ مسلم، جلد اول، بیان ان الدین نصیحۃ۔

اور فرمایا تھا کہ " اگر میں ٹیڑھ اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دینا۔" (اِنْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ۔)[1]

(۱۵) جن مسائل اور معاملات کے بارے میں اللہ اور رسول کے واضح احکام موجود نہ ہوں گے، ان کے لیے قوانین بنائے جائیں گے۔ یہ قوانین خلیفۃ المسلمین اور اس کی مجلسِ شوریٰ بنائے گی۔

(۱۶) اسلامی ریاست ہر شخص کی، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہوگی۔ ہر شخص کو عبادت اور ضمیر کی پوری پوری آزادی حاصل ہوگی۔ اظہارِ رائے پر صرف اتنی پابندی ہوگی کہ اسٹیٹ کے خلاف بغاوت کی تلقین نہ کی جاسکے گی، اور نہ اس طرح کی باتیں کہی جاسکیں گی جو ملک میں فتنہ و فساد پھیلانے والی یا اخلاقی گراوٹ پیدا کرنے والی ہوں۔ کسی شخص کا جرم ثابت کیے بغیر اس کی آزادی نہ چھینی جاسکے گی۔

(۱۷) اسلامی ریاست کے قیام کا منشا اور حکومت کا فریضہ بہت بلند اور بہت وسیع ہے۔ اس کے بنیادی نکات قرآن حکیم کی یہ آیتیں متعین کرتی ہیں:-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ۔[2]

ہم نے اپنے پیغمبروں کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا اُتارا۔

یٰدَاؤُدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔[3]

اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ سو لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کیا کرو۔

---

[1] تاریخ طبری، فارسی ترجمہ جلد چہارم۔ [2] سورہ حدید - ۲۵ - [3] سورہ ص - ۲۶ -

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَھَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ۔[1]

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف (نیکی) کا حکم دیں گے، اور منکر (برائی) سے روکیں گے۔

پہلی دو آیتیں اسلامی حکومت کے قیام کا عمومی اور تیسری اس کا خصوصی مقصد واضح کرتی ہے۔ پہلی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا کام معاشرے میں عدل و انصاف کا قائم کرنا ہے۔ اور یہ ایسا مقصد ہے جو بالکل عام نوعیت کا ہے۔ عدل کا قیام کچھ اسلامی حکومتوں ہی کا نصب العین نہیں ہوتا۔ دنیا کی ہر حکومت کم از کم اپنے ارادے اور دعوے کی حد تک، اسی مقصد سے قائم ہوا کرتی ہے۔ اور یہ ایسا مقصد ہے جو ایک حکومتی نظام کے وجود کو ہر معاشرے میں ناگزیر ٹھیراتا ہے۔ تیسری آیت اس عمومی مقصد پر ایک اضافہ کرتی ہوئی اسلامی حکومت کا منشا یہ بتاتی ہے کہ معاشرے کو نماز قائم کرنے والا، زکوٰۃ دینے والا، معروف سے خود محبت رکھنے اور دوسروں کو اس کا حکم دینے والا، اور منکر سے خود رکنے اور دوسروں کو اس سے روکنے والا بنایا جائے۔ اور یہ وہ مقصد ہے جو اسلامی حکومت کا مخصوص اور امتیازی مقصد ہوتا ہے، اور جو کسی اور جگہ لفظوں اور دعووں کی حد تک بھی نہیں پایا جا سکتا۔ یہ مقصد جن چار بنیادی نکات (اقامتِ نماز، ادائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) پر مشتمل ہے، ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ دراصل پورے دین کے قائم رکھنے، اس کی برکتوں کے دائرے کو بڑھاتے رہنے، اور معاشرے کو صحیح اسلامی معاشرہ بنائے رکھنے کی عظیم ترین ذمہ داری اور ان تھک کوشش ہی کا دوسرا نام ہیں۔

---

[1] سورۂ حج۔ ۴۱

۷۔ قانونی نظام

اِسلامی نظامِ قانون کی بنیادی باتیں یہ ہیں :۔

(۱) قانون کے اصل سرچشمے دو ہیں :۔ قرآن[۱] اور سنّت[۲]۔ ان کے اندر جس قدر قوانین واضح شکل میں موجود ہیں وہ قطعی اور اٹل ہیں، اور ہمیشہ کے لیے واجب التسلیم اور واجب الاطاعت ہیں۔ ان میں کبھی کوئی معمولی ردّ و بدل بھی نہیں ہوسکتا۔ نہ کوئی خلیفہ نظمِ حکومت چلانے میں ان سے بال برابر انحراف کرسکتا ہے، نہ کسی حاکم کے لیے جائز ہے کہ معاملات کا فیصلہ ان سے ہٹ کر کرے۔ ایسا کرنا اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔ (وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ)[۱]

(۲) جن مسائل اور معاملات کے بارے میں واضح احکام قرآن و سنّت میں موجود نہ ہوں اُن کے لیے حالاتِ زمانہ اور ضروریاتِ وقت کے مطابق قوانین وضع کیے جائیں گے۔ یہ قانون وہ لوگ وضع کریں گے جو اپنے علم و تقویٰ، اپنی دینی بصیرت، اپنی قانونی مہارت، اور مقتضیاتِ زمانہ سے اپنی گہری واقفیت کی بنا پر اس کے اہل ہوں گے۔ یہ قانون سازی جس طرح عام نہ ہوگی، بلکہ صرف اُن ہی اُمور میں ہوسکے گی جن کے بارے میں کتاب و سنّت کے واضح احکام موجود نہ ہوں، اسی طرح آزادانہ بھی نہ ہوگی، بلکہ دین کے مزاج اور شریعت کے متعینہ اصول و مقاصد کے تحت ہی ہوگی، اور انہیں کو سامنے رکھ کر ہی کی جائے گی۔

اس طرح قوانین بنائے جانے کو 'قیاس' کہتے ہیں۔ قیاسی احکام و قوانین کی حیثیت قطعی اور ناقابلِ تغیر و ناقابلِ اختلاف احکامِ شریعت کی نہیں ہوتی، بلکہ ان میں اختلاف بھی ہوسکتا ہے، اور تبدیلی کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ اختلاف اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ انسانی فہم و رائے کا معاملہ ہے، جس میں اختلاف کا ہونا

---

[۱] سورہ مائدہ ۔ ۴۴

فطری بات ہے۔ تبدیلی کی ضرورت اس لیے پیش آسکتی ہے کہ قیاس اور اجتہاد میں زمانے کے حالات اور اس کے تقاضوں کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے، اور یہ حالات اور تقاضے برابر بدلتے رہتے ہیں۔ البتہ ایسا قیاس جس پر پوری ملّت کے اصحابِ علم و اجتہاد متفق ہو گئے ہوں، ناقابلِ اختلاف ہوتا ہے، اور اس کی حیثیت بھی ابدی قانون کی سی ہو جاتی ہے۔ اس اتفاقِ رائے کو 'اجماع' کہتے ہیں۔

اس طرح اسلامی قانون کے سرچشمے چار ہو جاتے ہیں:۔ قرآن[۱]، سنت[۲]، قیاس[۳] اور اجماع[۴]۔

(۳) مقنّنہ، انتظامیہ سے قطعاً آزاد ہوگی۔ قانون سازی پر انتظامیہ کے کسی اثر اور اختیار کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قانون سازوں کے سامنے صرف اللہ و رسول کے منشا کی، اپنے بس بھر، ٹھیک ٹھیک ترجمانی ہوتی ہے۔ اسلام میں قانون سازی کا مطلب یہ جاننے اور بتانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ اگر اللہ کے رسول کے سامنے فلاں معاملہ یا مسئلہ پیش ہوتا تو اس کا فیصلہ یا جواب ہمارے اندازے کے مطابق یہ ہوتا۔

(۴) مقنّنہ کی طرح عدلیہ بھی انتظامیہ سے یکسر آزاد ہوگی۔ قاضیوں اور ججوں کا تقرر اگرچہ بلا واسطہ یا بالواسطہ، حکومت ہی کرے گی، لیکن جب ایک قاضی کا تقرر ہو گیا تو اب وہ عدالت کی کرسی پر حکومت کا نہیں بلکہ خدا و رسول کا نائب ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے احکامِ شریعت کے سوا اور کوئی چیز قابلِ لحاظ نہیں رہ جاتی۔

(۵) قانون کی طاقت ناقابلِ شکست ہے۔ کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتا۔ نہ امیر و غریب کا یا خواص و عوام کا یہاں کوئی امتیاز پایا جا سکتا ہے۔ اونچے سے اونچا شخص، حتّٰی کہ خلیفۂ وقت بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک بے کس فقیر ہوتا ہے۔ اگر کسی معاملے میں خلیفہ مدعی یا مدعا علیہ ہو تو عدالت میں اسے بھی اسی حیثیت سے حاضر ہونا ہوگا جس طرح اور جس حیثیت سے دوسرے لوگ حاضر ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر قانون کسی مقدمے میں اُسے مجرم قرار دے دیتا ہے تو اُسے بھی متعینہ

سزا لازماً بھگتنی پڑے گی۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ قانون کی بالادستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ "اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو خدا کی قسم میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ (وَ اَیْمُ اللّٰہِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعَ مُحَمَّدٌ یَدَھَا)[1]"

جن جرائم کی سزائیں کتاب و سنّت کے اندر قطعی انداز میں اور واضح طریقے پر مقرر کر دی گئی ہیں، ان کے نفاذ کو خلیفہ بھی نہیں روک سکتا۔ چوری کا جُرم ثابت ہو جانے کے بعد ہاتھ کٹ کر رہے گا، زانی کو سنگ ساری کی یا سو کوڑوں کی سزا مل کر رہے گی، زنا کی جھوٹی تہمت لگانے والے کو اَسّی دُرّے کھانے ہی پڑیں گے، یہاں "رحم کی درخواست" منظور کرنے کا کسی گورنر اور کسی سربراہِ مملکت کو اختیار نہیں۔

(۶) تعزیرات (یعنی فوجداری جرائم کی سزائیں) صرف اسی حال میں نافذ کی جائیں گی جب کہ معاشرہ اور ماحول فی الواقع اسلامی ہو اور حالات معمول پر ہوں۔ اگر معاشرہ عملاً اسلامی رنگ کا نہ ہو، یا حالات ایسے غیر معمولی ہو گئے ہوں جن میں ارتکابِ جرم کے مجبور کن محرکات اُبھر آئے ہوں، سزاؤں کا نفاذ رُکا رہے گا۔ چناں چہ قحط کے زمانے میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چوری کی سزا موقوف کر دی تھی۔

(۷) انصاف ہر شخص کو بالکل مفت ملے گا۔ یہاں کورٹ فیس نام کی کوئی چیز انصاف کے معاوضے کے طور پر وصول نہ کی جا سکے گی۔

---

[1] بخاری، جلد دوم، باب کراہیۃ الشفاعۃ فی الحد اذا رفع الی السلطان۔

دین وسیاست

وقت کا ایک اہم سوال

پچھلے صفحات میں اگرچہ یہ بات بالکل صاف ہو چکی ہے کہ اسلام زندگی کا ایک ایسا مکمل نظام رکھتا ہے جس کا سیاسی نظام بھی ایک جزو ہے، لیکن یہ بات ابھی واضح نہیں ہو سکی ہے کہ سیاست دین کا، اور سیاسی نظام اسلامی نظام کا کیسا جزو ہے؟ اس کی کیا اور کتنی اہمیت ہے، اور کیوں ہے؟ حالاں کہ ضرورت کہتی ہے اسے واضح ہونا چاہیے۔ کیوں کہ جس چیز کو ہم سیاست کہتے ہیں وہ انسانی زندگی کے لیے کوئی معمولی اہمیت کی چیز نہیں ہے۔ خصوصاً موجودہ زمانے میں تو اس کا عمل دخل اتنا بڑھ چکا ہے کہ زندگی کے نجی سے نجی معاملات اور مسائل بھی اس کے دائرۂ بحث سے پوری طرح باہر نہیں رہ گئے ہیں۔ اس لیے قدرتی طور پر زندگی کے بناؤ بگاڑ پر اس کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔ جس کسی کی پیشانی پر دو آنکھیں ہیں، وہ دیکھ سکتا ہے کہ سارے فلسفے، نظریے اور عقیدے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور سیاست و حکومت کا دھارا معاشرے کو اپنے رُخ پر بہائے لیے چلتا رہتا ہے۔ البتہ ساتھ ہی لطف کی بات یہ بھی ہے کہ وہ مذہب سے بے تعلقی کا اعلان بھی کرتی رہتی ہے۔ کہا کرتی ہے کہ میرا دین دھرم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اور پھر اپنی اس بات کے معقول، بلکہ ضروری ہونے پر بڑے خوب صورت اور نظر فریب "دلائل" بھی دیتی ہے۔ اور اس سلسلے میں اپنی کسی غرض کا نہیں، بلکہ خود دین ہی کے مفاد کا نام لیتی اور

اس ـــ تقدس کی دہائی دیتی ہے ۔ کہتی ہے کہ دین انسان کو خدا سے ملانے کا ذریعہ ہے، انتہائی بلند اور انتہائی مقدس چیز ہے ۔ اس لیے یہ اس کی عظمت اور اس کے تقدس کی توہین ہے کہ اُسے دنیا کے بکھیڑوں میں گھسیٹا جائے ۔ جو چیز مقدس ہے اسے مقدس جگہوں اور مقدس کاموں ہی کے لیے مخصوص رہنے دینا چاہیے ۔ سیاست اور اہل سیاست کا یہ نظریہ آج قریب قریب پوری دنیا کا مسلّمہ بنا ہوا ہے ۔ جس کے زیر اثر لوگ عام طور سے کسی مذہب کے بارے میں یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے کہ اس کا سیاست سے کوئی قابلِ لحاظ تعلق ہوگا، چہ جائے کہ وہ اس سے آگے کی کوئی بات سوچ اور مان سکیں ۔

اس بحث کو ہم یہاں نظر انداز بھی کر سکتے تھے اور اسے چھیڑے بغیر آگے بڑھ سکتے تھے اگر خود اسلام کے پیرووں کی حد تک بھی یہ بحث بحث نہ بن گئی ہوتی ۔ لیکن صورتِ واقعہ آج یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کے صرف نام لیوا نہیں، بلکہ واقعی پیرو ہیں، اور اسے غیروں کی نہیں، بلکہ خود اپنی نگاہ سے دیکھنے کے مدّعی ہیں، ان میں سے بھی بہتوں کا کہنا یہ ہے کہ اسلام سے سیاست اور حکومت کا رشتہ زیادہ سے زیادہ ثانوی درجے کا ہے، دین میں اُسے کوئی بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے ۔ نہ حکومت، اسلام کے لیے کوئی ناگزیر شے ہے، ناگزیر ہونا تو دور رہا، وہ اس کے لیے مطلوب بھی نہیں ہے، نہ اس کے قیام کے لیے کوشش کرنا اسلام کے پیرووں کی کوئی دینی ذمّہ داری ہے ۔ اس کی حیثیت تو صرف ایک انعام کی ہے جو دین کی مخلصانہ پیروی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کو عطا ہوتا ہے ۔ دو لفظوں میں یہ کہ حکومت اگر مطلوب ہے بھی پیروانِ اسلام کے لیے، نہ کہ خود اسلام کے لیے !

اِن وجوہ سے اسلام کے بارے میں بھی یہ سوال وقت کا ایک بڑا اہم سوال بن گیا ہے کہ اس کا سیاست سے کیا تعلق ؟ یعنی سیاست اگر اس کا ایک جزو ہے تو کس طرح کا اور کس اہمیت کا جزو ہے ؟ اس لیے بہت ضروری ہے کہ اس سوال کو ایک مستقل بحث کی حیثیت سے لیا جائے اور اس کا واضح اور مدلّل جواب معلوم کیا جائے ۔

ورنہ قوی اندیشہ ہے کہ اس کے بغیر اسلام کو اچھی طرح سمجھا نہ جا سکے گا، ذہن میں اس کی جو تصویر آئے گی وہ اگر غلط نہیں تو دھندلی ضرور ہو گی۔ مسئلے کی اہمیت چاہتی ہے کہ اس کے سبھی متعلقہ گوشوں پر نظر ڈالی جائے، اور ترتیب وار اُن تمام بنیادی امور نکات کا جائزہ لیا جائے جن سے دین وسیاست کے تعلق کی صحیح نوعیت متعین کرنے میں مدد یا رہنمائی ملتی ہو:۔

ایمان باللہ اور تصورِ سیاست

اس غرض کے لیے ہمیں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات کو دیکھنا چاہیے۔ کیوں کہ یہی صفات دراصل وہ سرچشمہ ہیں جس سے دین کے سارے تصورات اور شریعت کے تمام احکام نکلے ہیں۔ اس لیے اس بات کے فیصلے کا حق بھی کہ سیاست کا اسلام سے کیا تعلق ہے، سب سے زیادہ ان صفات ہی کو حاصل ہے۔

کتاب کے دوسرے باب (بنیادی عقائد) میں ہم اجمالاً یہ جان چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات میں سے ایک صفت حاکمیت بھی ہے۔ اس صفت کا ثبوت جن آیتوں سے ملتا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ۔[1]

کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی، انسانوں کے بادشاہ کی، انسانوں کے اِلٰہ کی۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔[2]

سُن رکھو! اسی کے لیے ہے پیدا کرنا بھی، اور حکم دینا بھی۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔[3]

حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے۔

---

[1] سورہ النّاس۔ ۱ تا ۳ [2] سورہ اعراف۔ ۵۴ [3] سورہ یوسف۔ ۴۰

یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کا صرف 'رب' اور 'الٰہ' ہی نہیں ہے، بلکہ 'مَلِک'، (بادشاہ) 'آمر'، (حکم دینے والا) اور 'حاکم'، (فیصلہ کرنے والا) بھی ہے۔ یعنی وہ ایسا رب اور الٰہ ہے جس کی ربوبیت اور الوہیت میں بادشاہت، فرماں دہی اور حکمرانی لازماً شامل ہے۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا حقیقی فرماں روا (حاکم ومقتدرِ اعلیٰ) اور قانون ساز (شارع) اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور یہ اس کی مسلّمہ اور اہم صفتوں میں سے ایک ہے۔ جب تک کسی کو اس صفت کا یقین نہ ہو وہ اللہ پر صحیح ایمان رکھنے والا مانا ہی نہیں جا سکتا۔

جب یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ نوعِ انسانی کا حاکم حقیقی اور مقتدرِ اعلیٰ اور قانون ساز اللہ کے سوا کوئی اور نہیں تو یہ دراصل اس بات کی تلقین بھی ہے کہ اس کی سیاسی زندگی کی تعمیر اللہ تعالیٰ کی لاشریک حاکمیت پر ہونی چاہیے۔ کیوں کہ سیاست کا سب سے پہلا مسئلہ اور اس کی سب سے بنیادی دفعہ یہی حاکمیت کا مسئلہ اور اقتدارِ اعلیٰ کی دفعہ ہے، اور اللہ کی صفتِ حاکمیت اسی مسئلہ کا راست جواب ہے۔

احکامِ شریعت اور شعبۂ سیاست

صفاتِ باری کے بعد اب شریعت کے مجموعۂ احکام کو دیکھیے۔ جن مسائل سے سیاست بحث کرتی ہے اور جو انسان کی سیاسی زندگی کے مسائل ہیں، ان میں کے نمایاں امور یہ ہیں:۔ ایک اجتماعی اور سیاسی نظم کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ معاشرے کا اقتدارِ اعلیٰ کسے حاصل ہے؟ انسان کی اصل تخلیقی پوزیشن کیا ہے؟ فرد کے بنیادی حقوق کیا ہیں؟ حکومت کے اختیارات کتنے اور کیسے ہیں؟ قانون سازی کا حق کسے ہے؟ خود قانون کی حیثیت کیا ہے؟ وغیرہ — دیکھنا چاہیے کہ کتاب وسنّت نے ان مسائل سے بحث کی ہے یا نہیں؟ اور ان امور کے بارے میں ضروری ہدایتیں دی ہیں یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اسلام کے "سیاسی نظام" کی بحث میں آپ ابھی ملاحظہ فرما چکے ہیں، جس سے پوری طرح معلوم ہو چکا ہے کہ سیاست جن جن بنیادی

مسائل سے بحث کرتی ہے اسلام نے ان میں سے ایک ایک کو لیا ہے اور ان سب کے بارے میں ہدایتیں دی ہیں۔

احکامِ دین کی تعمیل اور اقتدارِ حکومت

اسلامی شریعت جن احکام و ہدایات پر مشتمل ہے، ان میں سے بے شمار احکام ایسے ہیں جن کی تعمیل ایک سیاسی نظام اور ایک بااختیار حکومت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ مثال کے طور پر چند حکموں کو دیکھیے:-

(۱) اگر کوئی شخص کسی کو قتل کردے تو تمہارے لیے ضروری ہے کہ اس سے قصاص لو: (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی)[۱]

(۲) چور کا ہاتھ کاٹ دو: (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا)[۲]

(۳) زانی کو سو دُرّے لگاؤ: (اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ)[۳]

(۴) زنا کی جھوٹی تہمت لگانے والوں کو اسّی کوڑے مارو (وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَۃً)[۴]

(۵) دین کے دشمنوں سے لڑو، اور فتنۂ کفر کا سر کچل کر رکھ دو (وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ)[۵]

اسی طرح کتنے ہی احکام ایسے ہیں جن پر حکومت کے بغیر اگر عمل ہو بھی سکتا ہے تو محض جزوی طور پر یا ناقص شکل ہی میں ہو سکتا ہے۔ پوری طرح اور مطلوبہ شکل میں ان پر بھی عمل اسی وقت ممکن ہے جب سیاست اور حکومت کا ایک بااقتدار نظام قائم ہو، مثلاً یہ احکام:-

---

[۱] سورہ بقرہ - ۱۷۸ [۲] سورہ مائدہ - ۳۸ [۳] سورہ نور - ۲
[۴] سورہ نور - ۴ [۵] سورہ بقرہ - ۱۹۳

(۱) مُنکر کو ہاتھ سے مٹادو (مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ)[1]

(۲) عدل و انصاف کی راہ پر مضبوطی سے جمے رہو (کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ)[2]

(۳) غیر الٰہی عدالتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی سچا مسلمان وہاں اپنے مقدمات لے جائے (..... یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ)[3]

(۴) لوگوں کے معاملات کا فیصلہ اُن قوانین کے مطابق کرو جنھیں اللہ نے نازل کیا ہے: (فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ)[4]

(۵) مسلمان کا مقصدِ وجود تمام دنیا کے سامنے دینِ حق کی شہادت دینا ہے: (لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ)[5]۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے احکامِ دین کی پیروی بھی ٹھیک اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ دوسرے حکموں کی ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ بھی اُسی طرح شریعت کے اجزاء ہی ہیں جس طرح کہ دوسرے احکام ہیں، اور ان کی بجاآوری بھی اسی طرح تقاضائے ایمان و اسلام ہے جس طرح ان کی ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے احکام میں کسی انتخاب کی آزادی نہیں دی ہے کہ جن کی چاہیں تعمیل کریں اور جنھیں چاہیں چھوڑ دیں۔ اس کا مطالبہ تو یہ ہے کہ جو کچھ بھی میری جناب سے نازل کیا گیا ہے سب کی پیروی کرو (اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ —[6]) اور اگر تم نے ایسا نہ کیا، بلکہ میرے حکموں میں اپنے منشا کے مطابق تفریق کی، جن احکام پر چاہا عمل کر لیا، جن کو چاہا چھوڑ بیٹھے، تو یہ ایمان کی نہیں، کفر کی روش ہوگی۔ چناں چہ یہود کا معاملہ ہمارے سامنے ہے، ان پر اسی طرح کے طرزِ عمل کی بنا پر صاف لفظوں میں یہ جرم عائد کیا گیا تھا کہ کیا تم کتابِ الٰہی (تورات) کے ایک حصے پر ایمان رکھتے اور ایک حصے کا

---

[1] مسلم، کتاب الایمان [2] سورہ نساء - ۱۳۵ [3] سورہ نساء - ۶۰
[4] سورہ مائدہ - ۴۸ [5] سورہ بقرہ - ۱۴۳ [6] سورہ اعراف - ۳

کفر کرتے ہو، (اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ) — سورۂ بقرہ - ۸۵

سیاست دین کا ضروری جزو

اب اِن ساری باتوں کو ایک ساتھ نظر میں رکھ کر غور سے دیکھیے، اسلام اور سیاست کے تعلق کا سوال پوری طرح حل ہو جائے گا:-

اگر حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ایک بنیادی صفت ہے، اور اگر اس صفت کا واضح مطالبہ یہ ہے کہ انسان کی سیاسی زندگی کی تعمیر اللہ تعالیٰ کی لاشریک حاکمیت پر ہونی چاہیے —— تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی سیاسی زندگی بھی دین کے دائرے میں شامل ہے، اور اسے اس کی حدود سے کسی طرح باہر نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر باہر رکھا جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی صفتِ حاکمیت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ بے معنیٰ ہو کر رہ جائے گا۔

اگر شریعت کا ایک حصّہ سیاسی احکام پر بھی مشتمل ہے، اور اگر اسلام ایک مکمل سیاسی نظام بھی رکھتا ہے —— تو یہ اس امر کی ناطق شہادت ہے کہ اسلام کے پورے اور حقیقی وجود کا، اس کے سیاسی احکام کے بغیر تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح کہ کسی تندرست اور مکمل جسم کا اگر آپ تصوّر کرنا چاہیں تو اس کے کسی نمایاں عضو، مثلاً سر، یا ہاتھ، یا پاؤں کو الگ رکھ کر ہرگز نہ کر سکیں گے۔

اگر اقتدارِ حکومت کے بغیر دین کے بے شمار احکام معطّل ہو کر رہ جاتے ہیں اور اُن پر عمل کرنا ممکن نہیں رہ جاتا، دوسری طرف شریعت کا کوئی جزو بھی چھوڑ بیٹھنا کفر کی روش ہے، اسلام کی نہیں ۔ تو اس کے صاف اور صریح معنیٰ یہ ہیں کہ سیاست اسلام کا ایک انتہائی ضروری جزو ہے۔ کیوں کہ بذاتِ خود اس کی جو اہمیت ہے وہ تو ہے ہی، ساتھ ہی اس کی یہ اہمیت بھی ہے کہ اسی پر بہت سے دوسرے اجزاءِ دین کی انجام دہی کسی نہ کسی حد تک موقوف ہوتی ہے۔

ان سارے پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ایک بدیہی حقیقت کے ترجمان ہی کہے جاسکیں گے کہ :-

لا اسلام الا بجماعة ولا جماعة الا بامارة۔[1]
جماعت کے بغیر اسلام اسلام نہیں، اور امارت (نظمِ حکومت) کے بغیر
جماعت جماعت نہیں۔
اور مشہور تابعی حضرت کعب الاحبارؒ کے ان لفظوں کو امرِ واقعی کی بہترین تعبیر ہی
قرار دیا جا سکے گا کہ:-
مثل الاسلام والسلطان والنّاس مثل الفسطاط والعمود والاوتاد
فالفسطاط الاسلام والعمود السلطان والاوتاد الناس ولا یصلح
بعضها الا ببعض[2]
اسلام اور حکومت اور عوام النّاس، ان تینوں کی مثال شامیانے اور اس کے
کھمبے اور اس کے کھونٹوں جیسی ہے۔ شامیانہ اسلام ہے۔ کھمبا حکومت
ہے، اور کھونٹے عوام الناس ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی باقی دو کے بغیر
اپنی ٹھیک حالت میں نہیں رہ سکتا۔
غرض سیاست اور حکومت کے تصوّر سے اگر اسلام کو الگ کر دیا جائے تو پھر اسلام
وہ اسلام نہ رہ جائے گا جو اللہ کا بھیجا ہوا، قرآن کا بتایا ہوا، اور رسولِ خدا کا اپنایا ہوا
اسلام ہے۔ اسلام اپنی صحیح شکل میں اسی وقت دیکھا جا سکتا ہے جب اُسے کامل اقتدار
کے تخت پر رکھ کر دیکھا جائے۔
یہاں پہنچ کر حقیقتِ واقعی کا ایک اور انقلابی پہلو سامنے آجاتا ہے، اور وہ یہ کہ
اسلام سیاسی اقتدار کو متاعِ دنیا نہیں بلکہ متاعِ دین قرار دیتا ہے۔ ناپسندیدہ اور
نامطلوب نہیں، بلکہ مرغوب اور مطلوب ٹھہراتا ہے۔ وہ اس سے بے نیاز نہیں، بلکہ اس کا
طالب اور حریص ہے۔ اور یہ اس لیے کہ جب تک اس کے پاس یہ اقتدار نہ ہو وہ اپنے
وجود کا مقصد پورا ہی نہیں کر سکتا۔

---

[1] جامع بیان العلم۔ [2] العقد الفرید، حصّہ اول۔

اسلامی حکومت اور مسلم حکومت

اس موقع پر اُس نازک اور عظیم فرق کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے جو" اسلامی حکومت" اور" مسلم حکومت" کے درمیان ہوتا ہے۔

یہ تو ایک کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ اسلام کوئی جسم و جان رکھنے والی ہستی نہیں ہے کہ وہ اپنے اس مطلوبہ اقتدار کو خود اپنی کوششوں سے حاصل کر سکے گا اور حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے ہاتھوں میں رکھے گا۔ اس کے بخلاف یہ سب کچھ اس کے پیرووں کے ذریعے ہی ہو سکے گا۔ وہی اس اقتدار کے حاصل کرنے کی کوششیں بھی کریں گے، اور وہی اسے حاصل کر چکنے کے بعد اپنے ہاتھوں میں رکھ کر اس کا نفاذ بھی کریں گے۔ مگر بڑا فرق ہے اس اقتدار میں جو مسلمانوں کو اُن کے اپنے لیے مطلوب ہو، اور اُس اقتدار میں جو انھیں اصلاً اسلام کے لیے مطلوب ہو۔ پہلی قسم کا اقتدار حکومت" مسلم اقتدار" اور دوسری قسم کا اقتدار" اسلامی اقتدار" ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ اگر' دنیا' ہے تو یہ' دین' ہے، وہ اگر شر ہے تو یہ خیر ہے، وہ اگر دنیا کا بگاڑ ہے تو یہ دُنیا کا سنگار ہے۔ اسی بنا پر ایک طرف اہلِ ایمان کی تعریف اگر قرآن نے یہ کی ہے کہ" وہ زمین میں" علو" (اپنا بڑاپن) اور" فساد" (بگاڑ) نہیں چاہتے" (وَلَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا)[1] تو دوسری طرف انھیں خطاب کر کے یہ بھی فرمایا ہے کہ" تم ہی سربلند رہو گے اگر تمہارے اندر سچّا ایمان موجود ہوا" (وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ)[2] یہ دونوں ارشاداتِ ربانی مل کر جس حقیقت کو روشنی میں لاتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو" علو" اور بڑائی اپنے لیے ہوتی ہے وہ دراصل سرکشی اور جبّاریت ہوتی ہے، دنیا کو خرابیوں سے بھر دیتی ہے، اور صاحبِ ایمان اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن جو سربلندی اور برتری اسلام کے لیے ہوتی ہے، وہ سراپا خیر اور رحمت ہوتی ہے، اور مسلمان اس کا دل سے آرزو مند ہوتا ہے۔

---

[1] سورہ قصص - ۸۳ [2] سورہ آل عمران - ۱۳۹

واضح طور پر اقتدارِ حکومت کی یہ دونوں قسمیں جوہری حیثیت سے ایک دُوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اپنے بنیادی تصورات میں بھی مختلف ہیں اور اپنے نتائج و ثمرات کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں۔ اگرچہ دیکھنے میں دونوں ہی "اقتدار"، اور دونوں "اہلِ اسلام" ہی کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ مگر ایک کی حیثیت ایک مقدس امانت کی اور ایک بھاری ذمّہ داری کی ہے، جب کہ دوسرے کی حیثیت ذاتی یا گروہی ملکیت کی اور بے قید حقِ حکم رانی کی ہے۔ ظاہر بین نگاہیں سطح کو دیکھ کر دھوکا کھا سکتی ہیں، لیکن اہلِ نظر پر اتنا بڑا اور بنیادی فرق چھپا نہیں رہ سکتا۔ وہ صاف محسوس کریں گے کہ اگرچہ "شاہین"، اور "کرگس"، دونوں کی پرواز بظاہر ایک ہی "فضا"، میں ہوتی ہے لیکن دونوں کا "جہان" فی الواقع ایک نہیں ہوتا۔

انبیاءؑ کا مشن اور اقتدارِ حکومت

دین و سیاست کے باہمی رشتے کی جو نوعیت، جو اہمیت اور جو ضرورت اُوپر کی بحثوں سے واضح ہوتی ہے، وہ ایک عظیم حقیقت کا انکشاف کرتی ہے۔ اور وہ یہ کہ انبیاء علیہم السّلام جس مشن پر مامور ہوتے تھے، وہ اپنی آخری عملی شکل کے لحاظ سے ایک دینی اور اسلامی حکومت کا قیام ہی ہوا کرتا تھا۔ کیوں کہ اقتدارِ حکومت کے بغیر جس طرح آج، اسلام صحیح معنوں میں اسلام نہیں رہ جاتا، اور دینِ خدا پر پورا پورا عمل نہیں ہوسکتا، اسی طرح کسی بھی نبی کے زمانے میں نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے ہر دور کے "اسلام"، اور دینِ خداوندی کی نظر اس بات پر لازماً رہنی ہی چاہیے تھی کہ معاشرے کا اقتدار اس کے اپنے ہاتھ میں آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان انبیاء میں سے بہتوں کے ساتھ حالات نے سازگاری نہ کی ہو، اور اس لیے اُن کی دعوتی جدوجہد کے نتائج اس حدِ کمال تک نہ پہنچ پائے ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ کسی دعوتی جدّوجہد کا حدِ کمال تک نہ پہنچ پانا اور بات ہے، اور خود اس دعوت کا اپنی جگہ کمال ناآشنا ہونا دُوسری بات ہے۔ انبیائی دعوتوں کی جو تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے، اس میں اس بات کا تذکرہ تو ضرور ملتا ہے کہ ان میں سے اکثر اپنا سیاسی نظام قائم نہ کرپائی تھیں، مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ ایسا چاہتی

بھی نہ تھیں۔ بلاشبہ ہر نبی کی دعوت کا اساسی کلمہ " لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه " ہی تھا۔ " لَا حَاكِمَ اِلَّا اللّٰه " نہیں تھا۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ " لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه " کے مفہوم میں " لَا حَاكِمَ اِلَّا اللّٰه " کا مفہوم بھی شامل ہی ہے اور " الوہیت " کا ایک جزو " حاکمیت " بھی ہے۔ یعنی یہ بات کہ " اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں " یہ معنی بھی رکھتا ہے " اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں "۔ " الٰہ " کو صرف " حاکم " سمجھنا ضرور غلط ہے، مگر اس سے زیادہ غلط یہ بات ہے کہ " الٰہ " کے مفہوم کو " حاکمیت " کے تصور سے خالی سمجھا جائے۔ اسی طرح یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ کسی نبی نے اپنی دعوت ان لفظوں میں نہیں دی تھی کہ " لوگو! اللہ کی حکومت قائم کرو کیوں کہ اس کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں " بلکہ ہر نبی کے الفاظ یہی تھے کہ " اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ "[1] (اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں) مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان الفاظ کے مفہوم میں اُن لفظوں کا مفہوم بھی اپنی پوری اہمیت کے ساتھ شامل نہیں ہے؟ ایسا اگر کہا جاسکتا تھا تو اسی وقت کہا جاسکتا تھا جب " عبادت " کا مفہوم پرستش تک محدود ہوتا۔ لیکن جب حقیقت یہ نہیں ہے اور " عبادت " کے مفہوم میں پرستش اور اطاعت دونوں ہی شامل ہیں[2] تو اُن احکامِ دین کی پیروی کو " عبادت " کے مفہوم سے کسی طرح خارج قرار نہیں دیا جاسکتا جو زندگی کے مختلف معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن کی آخری کڑی سیاست اور حکومت کے احکام ہوتے ہیں۔ اور جب ان احکام کی پیروی بھی " عبادت " ہی ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی جو اصل دعوت تھی اس کے عین مفہوم ہی میں سیاسی احکام کی پیروی کا تصور بھی یقینی طور پر موجود رہا کرتا تھا۔

ہاں اس جگہ ایک سوال ضرور کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ کہ جن انبیائی دعوتوں کا قرآن کریم نے تعارف کرایا ہے ان میں سے اکثر کے اندر سیاسی احکام کا سرے سے کوئی

---

[1] سورہ اعراف - ۵۹

[2] اس بات کی دلیل اور اس پر مفصل بحث آگے ایک مستقل عنوان کے تحت آرہی ہے۔

تذکرہ ہی نہیں ملتا، اور وہ صرف ایمانیات، اخلاقیات اور اللہ واحد کی پرستش کی تعلیمات ہی پر مشتمل نظر آتی ہیں۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "اُعْبُدُوا" کا اصل حکم پرستش ہی تک محدود ہے۔ کیوں کہ جب یہ انبیاء "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی دعوت دے کر اور "اُعْبُدُوا اللّٰہَ" کی تلقین کر کے اس "توحید" اور اس "عبادت" کے مفہوم کی اپنے عمل سے اور اپنی دعوتی گفتگوؤں اور سرگرمیوں سے خود ایک شرح کر چکے ہیں تو اسی کو ان اصطلاحات کی واقعی شرح سمجھنا چاہیے۔ ان اصطلاحوں کے دائرۂ مفہوم میں اگر سیاست بھی لازماً داخل ہوتی تو ان انبیاء کی زبانوں سے اس کا کوئی نہ کوئی تذکرہ ضرور ہونا چاہیے تھا۔ انھوں نے اپنے پیرووں کو کسی وجہ سے سیاسی احکام نہ دیے تھے تو کم از کم ایک اسلامی حکومت کے قیام کا اپنی آخری منزل مقصود ہونا تو بتا ہی دیا ہوتا۔ اب اگر نہ ان کی تعلیمات میں سیاسی باتوں کا دور دور تک کہیں کوئی پتا نہیں۔ نہ انھوں نے کبھی اسلامی حکومت کو اپنی آخری منزل بتایا تو یہ اس بات کا ثبوت کیوں نہ ہوگا کہ اُن کی دعوت "اُعْبُدُوا اللّٰہَ" میں سیاست اور اسلامی حکومت کا تصور شامل نہ تھا۔؟

لیکن یہ سوال درحقیقت دو مسلّمہ حقیقتوں کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے:۔

ایک تو یہ کہ شریعت کا کوئی جزو اپنے فطری وقت اور عملی ضرورت سے پہلے نازل نہیں ہوا کرتا۔ اللہ تعالیٰ زندگی کے کسی معاملے میں اپنی ہدایتیں اس وقت بھیجتا ہے جب حالات اس کا تقاضا کرنے لگے ہوں، اور لوگ اس پر عمل کر سکنے کی پوزیشن میں آچکے ہوں۔ یہ تشریع کا ایک مستقل اصول ہے، جس کی ضرورت اور مصلحت بالکل واضح ہے۔

دوسری یہ کہ اس اصول کی بنا پر شریعت کے جو حصے بعد میں نازل ہوتے ہیں، اُن کا بعد میں نازل ہونا ہرگز یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ وہ کم مرتبہ ہوتے اور دین میں ثانوی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح اس اصول کے تحت اگر زندگی کے کچھ معاملات کے بارے میں دینی ہدایتیں نازل ہی نہ ہو سکی ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ فی الاصل بھی ان کی کوئی اہمیت نہ تھی، اور کسی حال میں بھی اُن کے جزوِ شریعت ہونے کا کوئی سوال نہ تھا۔

ان اُصولوں کو بعض مثالوں سے سمجھیے:۔

جہاد کو رسولِ خدا کی زبان سے "اسلام کی چوٹی" (ذِرْوَۃُ سَنَامِہٖ)[1] اور

---

[1] ترمذی جلد دوم۔ باب ماجاء فی حرمۃ الصلوٰۃ

"سب سے بڑا عمل" (اَفْضَلُ الْعَمَلِ[1]) فرمایا گیا ہے۔ مگر ۲ھ سے پہلے تک نہ صرف یہ کہ اس "افضل الاعمال" کا حکم نہیں دیا گیا تھا، بلکہ اس کی ممانعت تھی۔ ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لیے ہوا کہ جہاد کے لیے جن شرائط کا پورا ہونا ضروری تھا اس وقت تک وہ پورے نہیں ہو سکے تھے، اور نہ وہ حالات ظہور میں آپائے تھے جن کا ظہور میں آجانا ناگزیر تھا، دوسری مثال سود کے معاملہ کی لیجیے۔ سود خوری بدترین گناہوں میں سے ہے۔ اس فعل کو دنیا میں اللہ ورسول کے خلاف بغاوت (حَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ[2]) قرار دیا گیا اور آخرت میں کفّار کی سی سزا کا موجب فرمایا گیا ہے، مگر اس کے باوجود اسے بالکل آخر زمانے (یعنی ۹ھ) میں جاکر حرام کیا گیا۔ اس سے پہلے تک وہ قانوناً جائز ہی رہا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اس سے پہلے معاشرہ اس حکم پر صحیح طریقے سے عمل کرنے کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔ اور اگر اسی حال میں اسے نازل کر دیا جاتا تو ملک کا معاشی نظام یکسر درہم برہم ہوکر رہ جاتا۔ یہی معاملہ شراب[3] کا ہے، جو گناہوں کی "ماں" ہونے کے باوجود، اسی مصلحت کی بنا پر، سورۂ مائدہ کے نازل ہونے تک حرام نہ کی جاسکی تھی —— یہ چند مثالیں مذکورہ بالا دونوں اصولی حقیقتوں کو واضح کر دینے کے لیے بالکل کافی ہیں۔

اگر ان دونوں مسلّمہ اور اصولی حقیقتوں کو سامنے رکھ لیا جائے تو زیرِ بحث مسئلے کی ساری گرہیں آپ سے آپ کھل جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اگر کچھ انبیاءؑ پر سیاسی احکام نازل نہیں فرمائے تھے، اور انھیں اور ان کے پیروؤں کو نظامِ حکومت قائم کرنے کی ہدایت نہیں دی تھی تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہ تھی کہ ان حضرات کی حد تک اس نظام کی اصلاً بھی کوئی اہمیت نہ تھی، اور نہ اس طرح کے احکام ان کی شریعتوں کے ضروری حصّے ہو سکتے تھے بلکہ یہ تھی کہ ان کے زمانوں میں آخر تک وہ مواقع اور وہ حالات ظہور ہی میں نہیں آپائے تھے جن کے اندر سیاست اور حکومت کی باتیں کی جاتیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ حکومت

---

[1] بخاری، جلد اول، باب فضل الجہاد۔

[2] سورہ بقرہ - ۲۷۹۔

اور سیاسی نظام قائم کرنے کے لیے کچھ چیزیں بالکل ناگزیر ہوتی ہیں۔ مثلاً افراد کی ایک معقول تعداد، جماعتی نظم و اتحاد، اور ایک آزاد ماحول، اس لیے اگر کسی نبی کی دعوت ایسے مرحلے تک پہنچ ہی نہ پائی تھی جس میں یہ ساری چیزیں مہیا ہو چکی ہوتیں تو اسے اور اس کے پیروؤں کو سیاسی احکام آخر کیسے اور کس لیے دیے جاتے؟ شریعت کے ایوان میں ان احکام کی حیثیت تو چھت کے پلاستر کی سی ہے۔ جب تک بنیادیں بھر کر ان پر دیواریں نہ چُنی جا چکی ہوں، اور پھر ان دیواروں پر چھت تعمیر کرنے کے لیے کڑیاں ڈال کر ان پر اینٹیں یا سلاخیں نہ بچھائی جا چکی ہوں، پلاستر کرنے کے لیے کوئی عملی قدم کیسے اُٹھایا جا سکتا ہے؟ عملی قدم اُٹھانے کی بات تو دُور رہی، اس کے لیے وقت سے اتنے پہلے ہدایتیں دینا بھی موزوں و معقول نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن کیا مجوزہ عمارت کی بنیادیں بھرے جانے اور دیواریں اُٹھائے جانے سے پہلے چھت پر پلاستر کرنے کے لیے کسی ہدایت کا نہ دیا جانا یا کسی عملی قدم کا نہ اُٹھنا اس بات کا ثبوت ہوگا کہ بننے والی عمارت کا ذہنی خاکہ ہی بے پلاستر کی چھت کا ہے، اور اس کے مجوزہ نقشے میں چھت کا پلاستر شامل ہی نہیں ہے؟ ظاہر ہے، ایسا کوئی پاگل ہی گمان کر سکتا ہے۔ ورنہ ہر شخص یہی یقین رکھے گا کہ اس عمارت کے مجوزہ خاکہ میں چھت کا پلاستر بھی لازماً شامل ہے۔ لیکن چوں کہ وہ مرحلہ ابھی آیا ہی نہیں ہے جس میں اس کے لیے کچھ کہا یا کیا جا سکے اس لیے ابھی وہ چڑھایا بھی نہیں جا سکا ہے نہ اس کے لیے کوئی عملی قدم اُٹھایا جا سکا ہے۔ ورنہ یہ مرحلہ اگر آ گیا ہوتا تو وہ بھی لازماً چڑھایا جا چکا ہوتا یا چڑھایا جا رہا ہوتا ___ یہی حال انبیائی دعوتوں کا تھا۔ جو دعوتیں ناسازگار حالات کی بنا پر اُس مرحلے کے آنے سے پہلے ہی رُک گئیں جو سیاسی نظام کے قیام کے لیے ناگزیر تھا، اُن کی تعلیمات میں قدرتی طور پر سیاست اور حکومت کی باتیں شامل نہ ہو سکیں، اور اس لیے ان کے پیروؤں کی حد تک "اُعْبُدُوا اللّٰہَ" کے عملی مطالبے میں الٰہی حکومت کا قیام بھی شامل نہ ہو سکا۔ یعنی حقیقت ہرگز یہ نہ تھی کہ ان دعوتوں کی حد تک حکومت کا قیام اپنی اصل حیثیت ہی کے اعتبار سے مطلوب نہیں تھا اور نہ اس مطالبے میں شامل تھا۔ یقیناً تھا۔ مگر یہ حالات کی مجبوری تھی جس نے

اسے شامل نہ ہونے دیا چناں چہ جو دعوتیں اس مرحلے تک پہنچ گئیں، انھیں سیاسی احکام کے دیے جانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ ہوئی۔ اور جب ایسا ہوا تو نظمِ حکومت کا قیام اور سیاسی قوانین کا نفاذ بھی ٹھیک اسی طرح "اُعْبُدُوا اللّٰہَ" کے جامع حکم کے عملی مطالبوں میں شامل ہوگیا جس طرح کہ دین کے دوسرے اجزاء اس سے پہلے شامل ہو چکے تھے۔ اور اب الٰہی حکومت کا قائم کرنا اور سیاسی قوانین پر عمل کرنا بھی اللہ کا حقِ بندگی ادا کرنے کے لیے ویسا ہی ضروری ہوگیا جیسا ضروری کہ اور کسی حکم شریعت پر عمل کرنا ہو سکتا ہے۔

دعوتِ اسلام اور اقتدارِ حکومت

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، ساری دنیا جانتی ہے کہ اس کی دعوت انھی دعوتوں میں سے ایک ہے جنھیں اس مرحلے تک پہنچنے میں کام یابی حاصل ہوگئی تھی۔ اس لیے اس کی شریعت میں سیاسی قوانین اور امارت و حکومت کے احکام بھی تفصیل سے موجود ہیں۔ اور اس کے لانے والے رسولؐ نے نہ صرف یہ کہ سیاسی قوت حاصل کی اور ایک با ضابطہ نظامِ حکومت قائم کیا، بلکہ اپنی زندگی میں وہ خود ہی اس کا سربراہ بنا۔ اور اس کے بعد اس کے بہترین ساتھیوں نے بھی اسے دین کا ایک عظیم فریضہ سمجھتے ہوئے قائم رکھا اور اس کی سربراہ کاری کی۔ اس لیے کم از کم اسلام کی نسبت سے تو یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ حکومت کا قیام "اُعْبُدُوا اللّٰہَ" کے اصل حکم سے خارج ہے اور سیاست "دین" کا جزو نہیں ہے۔ چناں چہ یہ بھی ایک خاص اور اہم وجہ ہے جس کی بنا پر اسلام کو حقیقی معنوں میں اور ہر حیثیت سے "دینِ کامل" ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ شریعتوں کے درجے بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اعلم انّ اتمّ الشرائع واکمل النوامیس ھوالشرع الذی یؤمر فیہ بالجھاد۔[1]

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ، جلد دوم ص ۱۷۱

جان رکھو، سب سے مکمل شریعت اور سب سے کامل ہدایتِ الٰہی وہ شریعت ہوتی ہے جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو۔

"جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو" یعنی جو سیاست و حکومت والی شریعت ہو۔ کیوں کہ جہاد ایک باقاعدہ نظامِ حکومت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔

اِسلام نہ صرف یہ کہ ایک ایسی ہی شریعت ہے جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ ایسی شریعت ہے جس نے جہاد کو ایمان کی کسوٹی قرار دیا ہے۔ اور جس طرح وہ خود ہمیشہ کے لیے ہے اسی طرح جہاد کا رشتہ بھی اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے بندھا ہوا ہے۔ یہ اس بات کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ اسلام کے تصوّر سے سیاست اور حکومت کے تصوّر کو کسی طرح الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر الگ کر دیا گیا تو وہ ایک ایسا لنگڑا لولا "اسلام"، ہوگا جو اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ[1] کے طرّۂ امتیاز کا کسی طرح حق دار نہ رہ جائے گا۔

---

[1] سورۂ مائدہ ــ ۳

شریعت اور عبادت

عبادت کی اہمیت اور حیثیت

دین، اللہ تعالیٰ کی بندگی کے فکری و عملی یا ظاہری و باطنی نقشے کا دوسرا نام ہے۔ اس کی ضرورت اور غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی 'عبادت' کا ڈھنگ بتائے۔ کیوں کہ یہی "بندگی اور عبادت" وہ چیز ہے جو انسانی روح کو پاکیزگی اور بلندی عطا کرتی اور اسے رضائے الٰہی کا طالب بناتی ہے جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودیوں اور کرم بخشیوں کا سزاوار بن جاتا ہے۔ یہ وہ تصور ہے جو دین کے بارے میں رکھا جاتا ہے۔ اور بالکل ٹھیک رکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید اسے ایک واضح ترین حقیقت قرار دیتا ہے، اور پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ کسی بھی نبی کی دعوت اس کے سوا اور کچھ تھی ہی نہیں:-

.... اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ [1]

.... کہ اللہ کی 'عبادت' کرو اور طاغوت سے دُور رہو۔

اور بعینہٖ یہی دعوت تھی جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دی تھی۔ اللہ ربّ العٰلمین نے آپؐ سے جن لفظوں میں اسے پیش کرنے کو کہا تھا وہ بھی یہی تھے:

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ [2]

لوگو! اپنے رب کی "عبادت" کرو۔

---

[1] سورہ نحل - ۳۶ [2] سورہ بقرہ - ۲۱

پھر اتنا ہی نہیں، قرآن عزیز تو اس سے بھی زیادہ کی وضاحت کرتا ہے، کہتا ہے کہ انسان تو پیدا ہی اسی کام کے لیے کیا گیا ہے :-

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1]

(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری "عبادت" کریں۔

یعنی 'عبادت' ہی وہ کارِ خاص ہے جس کے لیے انسان کو پیدا بھی کیا گیا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کو مبعوث بھی فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ جس کام کے لیے انسانوں کو پیدا کیا گیا تھا، انبیاء کے آنے کا مقصد بھی عقلاً اسی کی یاد دہانی اور تعلیم و تلقین کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

عبادت کا مفہوم

"عبادت" کی اس حیثیت اور اہمیت کو سُنتے ہی ذہن میں فطری طور پر یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اس "عبادت" میں اور اُس 'اسلام' میں کس طرح کی نسبت ہے جس کا پچھلے صفحات تعارف کرا چکے ہیں؟ 'اسلام' اپنے پورے اور حقیقی مفہوم کے اعتبار سے تو بندگی اور زندگی کا ایک ہمہ گیر نظام ہے، جو عقائد سے لے کر پرستش تک، اور پرستش سے لے کر انسان کی دنیوی زندگی کے ایک ایک شعبے تک، ہر چیز کو اپنے دائرے میں لیے ہوئے ہے، اور سب کے بارے میں مفصل ہدایتیں دیتا ہے۔ تو کیا اس پورے مجموعۂ ہدایات کی، اور اس کے ایک ایک جزو کی پیروی کو 'عبادت' کہا جائے گا؟ یا اس کے صرف کسی خاص جزو یا کچھ خاص اجزاء ہی کی تعمیل پر عبادت کی اس قرآنی اصطلاح کا اطلاق ہو سکے گا؟ یہ صرف ایک نظری سوال نہیں ہے، بلکہ ایک زبردست عملی اہمیت اور ضرورت کا بھی سوال ہے کیوں کہ اس کا اسلامی احکامِ شریعت سے راست اور گہرا تعلق ہے، اور اس کا جو جواب ہوگا اس کا

---

[1] سورہ ذاریات - ۵۶

ان احکام کی پیروی پر بڑا غیر معمولی اثر مرتب ہوگا۔ اگر تحقیق سے واضح ہو کہ اسلام کے نزدیک "عبادت" کا کوئی محدود مفہوم ہے، تو اُس کے صرف اُنہی اجزاءِ شریعت کی پیروی جو اس محدود مفہوم کے دائرے میں داخل ہوں گے۔ تقدیس اور عقیدت کی اصل مستحق قرار پائے گی۔ اور اگر حقیقتِ حال دوسری نظر آئی تو پھر یہ تفریق نہ کی جا سکے گی اور سمجھا جائے گا کہ پوری اسلامی شریعت کی پیروی عبادت ہے، اور اس کے ہر جزو کا اتباع یکساں توجہ، ذوق اور جذبے کے ساتھ کیا جانا ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "عبادت" کے ٹھیک ٹھیک مفہوم کا جاننا خود اسلام کی ٹھیک ٹھیک پیروی کے لیے بھی بالکل ضروری ہے۔ کیونکہ اس واقفیت کے بغیر انسان افراط و تفریط کا شکار ہونے سے ہرگز نہیں بچ سکتا۔ جس چیز کو وہ "عبادت" سمجھے گا، نفسیاتی طور پر اس پر اپنی توجہ مرکوز کیے رہے گا، اور جسے عبادت کا کام نہ سمجھے گا اسے لازماً پیچھے ڈالے رہے گا۔

"عبادت" کا لفظ جب کتاب وسنت کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو اس کا مفہوم کیا ہوا کرتا ہے، اور اس کی حدیں کہاں تک پہنچتی ہیں؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں ہر اُس چیز پر نظر ڈالنی چاہیے جو اس بارے میں کوئی اہمیت رکھتی ہو، اور عبادت کا مفہوم متعین کرنے میں سند کا مقام رکھتی ہو۔ تاکہ اس اہم ترین دینی مسئلے کی تحقیق کا پورا پورا حق ادا ہو جائے اور جو نتیجہ نکلے وہ ہر پہلو سے قابلِ اطمینان ہو:۔

لغوی قیاس کی روشنی میں

العبادۃ غایۃ التذلل۔[1]

عبادت کے معنیٰ انتہائی حد تک پست ہونے اور بچھ جانے کے ہیں۔

العبادۃ الطاعۃ۔[2]

عبادت کے معنیٰ اطاعت کے ہیں۔

عَبَدَ اللهَ عِبَادَةً تَأَلَّهَ لَهُ۔[3]

"اُس نے اللہ کی عبادت کی" کے معنیٰ ہیں اُس نے پرستش یک سو ہو کر کی۔

---

[1] مفرداتِ امام راغب [2] لسان العرب [3] لسان العرب

اِسی طرح "عبد" غلام کو، اور "طریقِ مُعَبَّد" اُس راستے کو کہتے ہیں جو آمد و رفت کی کثرت سے رَوند کر بالکل ہموار اور آسان گزار ہو گیا ہو۔[۱]

بظاہر اہلِ لغت کے بتائے ہوئے "عبادت" کے یہ معانی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مگر فی الواقع مختلف نہیں ہیں، بلکہ ان میں بڑی گہری ہم آہنگی موجود ہے۔ "عبادت" کا بنیادی مفہوم تو وہی ہے جو سب سے پہلے درج کیا گیا ہے، یعنی کسی کے آگے پوری طرح جھک جانا، پست ہو رہنا، بچھ جانا، لیکن ظاہر ہے کہ انتہائی جُھکاؤ لازمی طور پر کامل اطاعت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس لیے "عبادت" کے معنیٰ بجا طور پر اطاعت کے بھی ہوئے۔ پھر اگر وہ ہستی جس کے آگے انسان اپنے کو پوری طرح ڈال دیتا اور آخری حد تک پست کر دیتا ہے اس کی نگاہ میں جود و کرم کی معبودانہ شان بھی رکھتی ہو، تو یہ جھکاؤ اعترافِ نعمت کی رُوح سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ جُھکاؤ جس کے اندر اعترافِ نعمت کی رُوح کام کر رہی ہو، لازماً پرستش کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر "عبادت" کے معنیٰ پرستش کے بھی ہوئے۔

ان لغوی وضاحتوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو "عبادت" کا دینی اور اسلامی مفہوم بہت کچھ ان ہی سے سمجھ میں آ جائے گا۔ ان سے بڑی آسانی کے ساتھ اندازہ لگا لیا جا سکتا ہے کہ "عبادتِ الٰہی" کا اصل جوہر کیا ہے؟ اور اللہ کی "عبادت" کرنے والا کون ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے؟ "عبادت" کا اصل اور بنیادی مفہوم اگر آخری درجے کا جھکاؤ ہے تو اس کے معنیٰ لازماً یہ ہوں گے کہ یہی جھکاؤ "عبادتِ الٰہی" کا بھی اصل جوہر ہے۔ پھر چوں کہ اللہ تعالیٰ انسان کا حقیقی فرماں روا بھی ہے اور اس کا حقیقی محسن بھی ہے، اسی لیے عقل مان نہیں سکتی کہ اس کا یہ جھکاؤ بس جھکاؤ بن کر رہ جائے گا، اطاعت کی اور پھر پرستش کی شکلیں نہ اختیار کرے گا۔ یہ بات کچھ ایسی ہی ناممکن ہے جیسے یہ بات ناممکن ہے کہ آگ تو بھڑک رہی ہو مگر اس سے گرمی نہ خارج ہوتی ہو۔ غرض اللہ تعالیٰ کے سامنے انسان کے جھکاؤ کی جو

---

[۱] لسان العرب۔

فطری نوعیت ہوسکتی ہے، اس کا قطعی تقاضا یہی ہے کہ عبادتِ الٰہی کے اندر تینوں چیزیں موجود ہوں :- انتہائی تذلّل[1] بھی، اطاعت[2] بھی، اور پرستش[3] بھی۔

دینی مسلّمات کی روشنی میں

یہ تو لغوی قیاس کا فیصلہ تھا۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اس بارے میں دینی قیاس کیا کہتا ہے؟ اور دین کی بنیادی اور مسلّمہ حقیقتوں کی روشنی میں عبادت کا مفہوم کیا دکھائی دیتا ہے؟

انبیاء علیہم السّلام نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے آئے تھے۔ ان حضرات نے آکر لوگوں کو جس بات کی تلقین کی وہ، جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا، واضح اور قطعی لفظوں میں صرف یہ تھی کہ "اللہ کی عبادت کرو" اور یقیناً یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ انسان تو پیدا ہی اللہ کی عبادت کے لیے کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی ہدایت کی غرض سے انبیاء علیہم السلام پر نازل کیا جانے والا پیغام خداوندی عقلاً تلقینِ عبادت کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

جب حقیقت واقعی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کا مشن صرف خدائے واحد کی "عبادت" کا پیام دینا اور انسانوں کو اس کا "عابد" بنانا تھا، تو اس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ ان حضرات نے بحیثیت نبی جو کچھ بھی بتایا اور سکھایا وہ سارے کا سارا "عبادت" کا کام تھا، اس کا کوئی ایک لفظ اور کوئی شوشہ بھی "عبادت" کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ کیوں کہ یہ بوالفضولی تو ایک عام انسان سے بھی خلاف توقع ہی سمجھی جائے گی کہ اسے مامور تو ایک متعیّن مشن پر کیا گیا ہو، لیکن وہ اپنی اس ڈیوٹی پر رہتے ہوئے کچھ غیر متعلق کام بھی انجام دینے لگے۔ پھر ایک پیغمبر کے بارے میں اس طرح کے کسی رویّے کا گمان کیسے کیا جا سکتا ہے؟ پیغمبر تو وہ ہوتا ہے جو سر سے پاؤں تک اطاعت ہی اطاعت ہوتا ہے۔ جس کی نگاہیں ہمیشہ اپنے فرضِ منصبی ہی پر جمی رہتی ہیں۔ جو اللہ کے بندوں کو وہی کچھ بتاتا اور سکھاتا ہے جس کا اس کے رب کی طرف سے حکم دیا گیا ہو، یا اذن حاصل ہو، اور اپنی طرف سے ایک لفظ

بھی نہیں بولتا۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ اپنی منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے وہ کچھ غیر متعلق اُمور سے بھی دل چسپی لینے لگے، اور لوگوں کو ایسی باتوں کی بھی تلقین کرتا رہے جو اس کے مشن سے کوئی لگاؤ نہ رکھتی ہوں؟ اس لیے ماننا پڑے گا کہ نبی دین کے بنیادی عقائد و اعمال سے لے کر تمدن و معاشرت کے تفصیلی مسائل و معاملات تک کے بارے میں جو کچھ بھی بتاتا اور سکھاتا ہے، وہ کسی تقسیم یا کسی استثنا کے بغیر سب کا سب "عبادت" ہی کا کام ہوتا ہے۔ اُن احکام کی پیروی بھی عبادت ہوتی ہے جن میں اللہ کی پرستش کی تلقین کی گئی ہو، اور اُن احکام کی پیروی بھی عبادت ہی ہوتی ہے جن میں انفرادی اور اجتماعی معاملات زندگی کے بارے میں ضابطے اور قانون بتائے گئے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پورے دین اور پوری شریعت کا اتباع ہی وہ "عبادت" ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا اور انبیاء کو بھیجا گیا ہے۔ اس پورے مجموعۂ احکام میں سے جتنے زیادہ حکموں کی انسان ٹھیک طرح سے پیروی کرے گا اس کی عبادت اتنی ہی کامل ہوگی، اور جتنی ہی یہ پیروی ادھوری ہوگی اس کی عبادت اتنی ہی ناقص قرار پائے گی۔

دین کی بنیادی حقیقتوں اور اس کے مسلّمہ اصولوں کی روشنی میں ایک اور پہلو سے بھی عبادت کا یہی مفہوم متعین ہوتا ہے:۔ قرآن نے جس طرح انسان کی پیدائش کا مقصد صرف اللہ کی عبادت بتایا ہے، قدرتی بات تھی کہ اسی طرح اس کی پیدائشی حیثیت بھی وہ صرف اللہ کے 'عبد' ہونے کی قرار دیتا۔ چناں چہ اس کے صفحے صفحے پر اس بات کو ایک مسلمہ اور بدیہی حقیقت کے طور پر دہرایا گیا ہے کہ انسان کی پہلی اور آخری حیثیت صرف 'عبد' ہونے کی ہے۔ اس کے سوا وہ کسی پہلو سے بھی کچھ اور نہیں ہے۔ غور کیجیے کہ "عبد" اور غلام کی عملی زندگی کیا ہوتی ہے۔؟ ایک شخص جب کوئی غلام خریدتا ہے تو وہ اس کا چوبیس گھنٹے کا غلام ہوتا ہے، اور وہ اپنے آقا کے اشاروں پر جو کچھ کرتا ہے وہ سب کا سب غلامی اور "عبدیت" کا کام کہلاتا ہے۔ حالاں کہ یہ شخص اس کا واقعی مالک اور حقیقی آقا نہیں ہوتا، اور نہ وہ اس کا مکمل عبد (غلام) ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ اس کی جس چیز کو خریدے ہوئے ہوتا ہے وہ اس کی صرف قوتِ کارکردگی ہوتی ہے۔ اس کا پورا وجود اس کا زرخرید نہیں ہوتا۔ لیکن انسان اللہ تعالیٰ کا

وہ "عبد" اور وہ غلام ہے جس کی ایک ایک چیز کا وہ حقیقی مالک ہے، اور وہ اس کی کامل ملکیت اور اس کا پیدائشی اور ابدی غلام ہے۔ اور جہاں تک ایک صاحبِ ایمان و اسلام انسان کا تعلق ہے وہ تو اس کا صرف پیدائشی غلام ہی نہیں ہے، بلکہ اقراری غلام بھی ہے۔ قرآن کریم صراحت سے کہتا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔[1]

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں، اس عوض میں کہ ان کو جنت ملے گی۔

اس لیے ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کا ایسا "عبد" ہے جس کی صرف قوتِ کارکردگی ہی نہیں بلکہ جس کا سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ وہ اس کا پیدا کیا ہوا بھی ہے اور اس کا "خریدا ہوا" بھی ہے۔ اور یہ "خرید و فروخت" کا معاملہ بھی اس غلام کی آزاد مرضی سے ہوا ہے۔ ایسا پیدائشی غلام، اور اپنے پورے وجود کو بیچ چکنے والا ایسا عبدِ کامل اپنے آقا کی تابع داری میں جو کچھ کرے گا، اس کا کوئی بھی جزو اس کی غلامانہ حیثیت سے الگ اور بے تعلق نہیں ہوسکتا۔ جب غلامی اور عبدیت کے سوا اس کی کوئی حیثیت سرے سے ہے ہی نہیں، تو لازماً اس کا ایک ایک فعل "عبدیت" اور "عبادت" ہی کا فعل ہوگا۔ حتّٰی کہ اگر وہ کھاتے اور پینے، سونے اور جاگنے کے کام بھی اپنے آقا کی مرضیات کو سامنے رکھتے ہوئے کرتا ہے، جیسا کہ اسے کرنا ہی چاہیے تو یہ سارے کام بھی قطعاً "عبادت" ہی کے کام ہوں گے۔

کہنے کو تو یہ استدلال صرف ایک قیاس اور استنباط ہے، ایک ایسا نتیجۂ فکر ہے جو کچھ مقدمات کو ترتیب دے کر اور دین کی کچھ بنیادی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر اخذ کیا گیا ہے۔ مگر امرِ حق یہ ہے کہ یہ استدلال قیاسی ہوتے ہوئے بھی منصوص دلائل سے بس ایک ہی درجہ کم ہے، اور اسے آسانی کے ساتھ برائے بحث بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] سورہ توبہ - ۱۱۱

قرآنی استعمالات کی روشنی میں

آخر میں اس لفظ "عبادت" کے قرآنی استعمالات کو لیجیے۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو جن معنوں استعمال کیا ہے، وہی اس کے حقیقی معنیٰ تسلیم کیے جائیں گے۔ اور پھر کسی شک یا تردد کی گنجائش بھی باقی نہ رہ جائے گی۔ ان استعمالات کا جائزہ ہمیں اس فیصلے تک پہنچا دے گا۔ یقینی طور پر وہی سب سے زیادہ مضبوط اور قابل اطمینان فیصلہ ہوگا۔

قرآن حکیم کے اندر اس لفظ کو، مختلف صیغوں کی شکل میں، بے شمار مواقع پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ منتخب آیتوں کا ترتیب وار مطالعہ کیجیے:۔

(الف) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ۔[1]

تم لوگ تو اللہ کو چھوڑ کر بس ایسے کچھ (بے حقیقت) ناموں کی، عبادت (پوجا) کر رہے ہو جن کو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے خود ہی رکھ لیا ہے۔

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ۔[2]

انہوں نے کہا ہم کچھ بتوں کی "عبادت" کیا کرتے ہیں، اور برابر اُن سے لگے بیٹھے رہتے ہیں۔

یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ کسی کی پوجا پاٹ کرنا اور اس سے دعائیں مانگنا اس کی "عبادت" کرنا ہے۔ کیوں کہ مشرکین اپنے بتوں کے ساتھ جو کچھ کیا کرتے تھے اُسے ان آیتوں میں "عبادت"، کہا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مشرکوں کا تعلق اپنے بتوں سے پوجا پاٹ اور دعا و التجا ہی کا ہوا کرتا تھا، اس سے زائد یا اس کے علاوہ کسی اور چیز کا نہیں ہوتا تھا۔

(ب) وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى۔[3]

---

[1] سورۂ یوسف ۔ ۴۰ [2] سورہ شعراء ۔ ۷۱ [3] سورہ زمر ۔ ۱۷

جو لوگ طاغوت کی "عبادت" سے دُور رہے اور اللہ کی طرف جھکے اُن کے لیے خوش خبری ہے۔

.... مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ۔ الخ[1]

.... وہ، جن پر اللہ کی لعنت ہوئی، اس کا غضب گرا، اور ان میں سے کتنوں ہی کو اُس نے بندر اور سُور بنا دیا، اور جنھوں نے کہ طاغوت کی "عبادت" کی۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ کسی کو مُطاع مان کر اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے اس کے احکام پر چلنا اس کی "عبادت" کرنا ہے ـ کیوں کہ ان آیتوں میں اُس طرزِ عمل کو عبادت فرمایا گیا ہے جو طاغوت کے ساتھ اس کے پیرو اختیار کرتے ہیں۔ "طاغوت" کے لفظی معنی حد سے نکل جانے والے اور بڑے سرکش کے ہیں۔ اور قرآن کی بولی میں طاغوت سے مراد ہر وہ مخلوق ہوتی ہے جو اللہ کی بندگی سے نکل گئی ہو، یا نکل جانے کا ذریعہ بنی ہو۔ اس طرح اگر شیطان اور بُت "طاغوت" ہیں تو وہ حکمراں اور سردار اور وہ قومی لیڈر اور مذہبی پیشوا بھی "طاغوت" ہی ہیں جو خوفِ خدا سے بے بہرہ اور ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہوتے ہیں، اور اپنی رائے اور مرضی ہی کو وقت کا قانون قرار دیتے ہیں۔ خدا کے ان باغیوں کے ساتھ اُن کے پیروؤں کا رویّہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو اپنا محترم سمجھتے ہیں، ان کو کسی قید و شرط کے بغیر قانون بنانے، حکم چلانے اور فیصلے کرنے کا مستحق مانتے ہیں، اور دل کی آمادگی کے ساتھ اُن کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان کے اس عملی رویّہ کو قرآن نے اگر "طاغوت" کی "عبادت" فرمایا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے نزدیک وہ اطاعت بھی "عبادت" ہی ہوتی ہے جس کے پیچھے ارادے کی آزادی اور دل کی رضامندی موجود ہو، اور جو کسی کو بے قید اطاعت کا مستحق سمجھ کر کی جائے۔

(ج) ... فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ۔[2]

---

[1] سورہ مائدہ ـ ۶۰ [2] سورہ مومنون ـ ۴۷

.... تو (فرعونیوں نے) کہا کہ کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں (اور وہ بھی) اس حال میں کہ ان کی قوم ہماری "عابد" (تابعِ فرمان) ہے؟

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ ۔[1]

(حضرت موسیٰؑ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرعون سے کہا) اور یہ ہے تیرا وہ احسان جو تو مجھ پر دھر رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا "عبد" بنا رکھا ہے۔

یہ آیتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ صرف وہی اطاعت 'عبادت' نہیں ہوتی جس کے پیچھے اراده، دل کی آمادگی اور بے قید و شرط اطاعت کا مستحق ہونے کا خیال تینوں ہی چیزیں موجود ہوں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اطاعت بھی "عبادت" ہی ہوتی ہے جو اگرچہ اپنی مرضی کے خلاف کرنی پڑ رہی ہو مگر شعور اور ارادے کے ساتھ اور بلا چون وچرا کی جا رہی ہو، اور جس کی اطاعت کی جا رہی ہو وہ خود کو کسی بالاتر قانون کا پابند نہ سمجھتا ہو۔ کیوں کہ ان آیتوں میں بنی اسرائیل کی غلامی کو قبطیوں کی "عبادت" کرنا کہا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ بنی اسرائیل اگرچہ اپنی غلامی کی اس دردناک حالت کے خلاف دم نہیں مارتے تھے لیکن اسے برداشت بھی خوشی کے ساتھ نہیں کر رہے تھے، بلکہ یہ صرف حکمراں طاقت کی ہیبت اور اپنی بے بسی تھی جس کے باعث وہ چپ چاپ فرعونی احکام کے جوئے تلے اپنی گردن دیے ہوئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی آزاد فرماں روائی کی مدعی طاقت کی وہ بے چون وچرا اطاعت بھی اس کی "عبادت" ہوتی ہے جس میں اگرچہ دل کی رضامندی نہ ہو، مگر شعور وارادہ موجود ہو۔

(د) اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔[2]

اے اولادِ آدم! کیا ہم نے تمہیں اس بات کی تاکید نہ کی تھی کہ شیطان کی "عبادت"

---

[1] سورہ شعراء ـ ۲۲ [2] سورہ یٰس ـ ۶۰

نہ کرنا؟ یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

یَآ اَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ [1]

(ابراہیمؑ نے کہا تھا) بابا جان! شیطان کی "عبادت" نہ کیجیے۔

ان آیتوں سے 'عبادت' کا ایک اور مفہوم یا اس کی ایک اور شکل بھی معلوم ہوئی۔ اور وہ یہ کہ کسی کی مرضیات کی غیر شعوری پیروی اور تکمیل بھی 'عبادت' ہی ہے۔ کیوں کہ ان آیتوں میں 'شیطان کی عبادت' کرنے کی بات فرمائی گئی ہے۔ حالاں کہ وہ لوگ، جن کے بارے میں ایسا فرمایا گیا ہے، انہوں نے شیطان کو کبھی اپنا معبود نہیں بنایا تھا۔ بات صرف اتنی ہوگی کہ ان کے عقائد اور اعمال ویسے ہی کچھ تھے جیسے شیطان چاہتا تھا۔ ورنہ جہاں تک ظاہر کی صورتِ واقعی کا تعلق ہے، ان میں سے کوئی بھی شیطان کو سجدہ نہ کرتا تھا۔ کوئی اس سے دعائیں نہیں مانگتا تھا۔ کوئی اس کو اپنا آقا یا رہنما تسلیم نہیں کرتا تھا۔ کوئی اس سے محبّت اور عقیدت نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ ساری دنیا کی طرح وہ بھی اسے مجسّم برائی ہی یقین کرتے تھے، اور اُن کے پاس بھی اس کے لیے نفرت اور لعنت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ شیطان کی "عبادت" کرتے تھے؛ تو یہ اس حقیقت کا کھُلا ہوا اظہار ہے کہ چاہے اتّباع اور اطاعت کا مطلق ارادہ نہ ہو، حتیٰ کہ اپنے عقائد و اعمال کے بارے میں یہ شعور کیا، گمان بھی نہ ہو کہ یہ فلاں کے احکام اور مرضیات کے مطابق ہوں، لیکن اگر صورتِ واقعہ یہی ہو تو یہ غیر شعوری اطاعت بھی قرآن کے نزدیک "عبادت" ہی ہے۔

قرآنِ حکیم کے ان چاروں استعمالات میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس میں مجاز کا اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک ایسا دعویٰ ہوگا جس کے حق میں کوئی دلیل نہیں دی جاسکتی، نہ تو لغت سے، نہ قرآن سے، نہ صحیح احادیث سے۔ ایسا دعویٰ اگر کیا جاسکتا تھا تو اُسی وقت کیا جاسکتا تھا جب قرآن مجید کی ان بے شمار آیتوں میں سے، جن کے اندر "عبادت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، کسی ایک سے بھی یہ

---

[1] سورہ مریم - ۴۴

مفہوم نکلتا ہوتا کہ "عبادت" صرف پرستش کا نام ہے، پرستش کے کاموں کے علاوہ اور کوئی کام عبادت نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن کے اندر کسی ایسی آیت کا پایا جانا محال ہے۔ ہاں اس میں ایسی آیتیں بہت ملیں گی جن میں "عبادت" کا لفظ بول کر صرف پرستش کے معنی مُراد لیے گئے ہیں (جس کی چند مثالیں بھی اوپر آچکی ہیں) لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ عبادت کے معنی صرف پرستش کے ہیں، اور اس بات میں کہ عبادت کے معنیٰ پرستش کے بھی ہیں۔

لفظ عبادت کی جو لغوی تحقیق اُوپر گزر چکی ہے، اس کو اگر سامنے رکھیے تو محسوس ہوگا کہ عبادت کی یہ چاروں شکلیں، جو قرآن کے مطالعے سے ابھی معلوم ہوئیں، عبادت کے چار مستقل اور باہم بے تعلق معانی نہیں ہیں، بلکہ دراصل ایک ہی جامع معنی و مفہوم کے چار مختلف رُخ یا مختلف اجزاء ہیں۔ پرستش بھی عبادت ہے اور شعوری یا غیر شعوری اطاعت بھی عبادت ہے۔ عبادت کے سوا کچھ اور نہ یہ ہے نہ وہ ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی بجائے خود کامل عبادت نہیں ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تنہا کامل عبادت ہوتی تو پھر دوسری کو عبادت کہنے کی کوئی گنجائش اور وجہِ جواز باقی نہ رہ جاتی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن مجید نے اگر پرستش کو عبادت کہا ہے، تو ساتھ ہی اطاعت کی مذکورہ بالا تینوں شکلوں کو بھی "عبادت"، ہی فرمایا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کے نزدیک عبادت کا مفہوم مکمل اسی وقت ہوتا ہے جب پرستش اور اطاعت، دونوں چیزیں اکٹھی ہو جائیں۔

بحث و تحقیق کے تینوں پہلو ہمارے سامنے آچکے :۔ لغوی قیاس کا بھی، دینی مسلّمات کے تقاضوں کا بھی، اور قرآنی استعمالات کا بھی۔ تینوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "عبادت" ایک جامع اصطلاح ہے، جو پرستش اور اطاعت، دونوں کو پوری طرح محیط ہے۔ اس کی وسعتیں وہاں سے پہلے ختم نہیں ہوتیں جہاں پہنچ کر شریعت کے مطالبات اور احکام ختم ہوتے ہیں۔

قرآن کی مطلوبہ عبادت

اللہ تعالیٰ نے اپنی جس عبادت کو انسان کا مقصدِ وجود بتایا ہے اور جس کی تلقین و ہدایت کے لیے اس کے رسول آتے رہے ہیں، وہ کوئی ادھوری اور آدھی تہائی قسم کی عبادت،

نہیں ہے نہ ہو سکتی تھی۔ وہ نہ صرف پرستش تک محدود ہے اور نہ صرف اطاعت تک محدود ہے۔ یہی عقل کا بھی صریح تقاضا ہے اور یہی قرآن کا بھی واضح فیصلہ ہے۔ عقلؔ کا صریح تقاضا یہ اس لیے ہے کہ جو خدا انسان کا خالق اور مالک، رازق اور محسن، حاکم اور معبود، سبھی کچھ ہے، اسے سبھی طرح کی "عبادتوں" کا حق دار بھی ہونا چاہیے۔ قرآنی فیصلہ یہ اس طرح ہے کہ اس کی آیتیں اسلام کے پیروؤں سے اللہ جلّ مجدہٗ کی پرستش اور اس کی اطاعت دونوں ہی باتوں کا یکساں طور پر مطالبہ کرتی دیکھی جا رہی ہیں۔ وہ جہاں یہ کہتی ہیں کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو، اسی کے نام کی پاکی بیان کرو، اسی سے دعائیں مانگو، اسی کی بڑائی کا اعلان کرو، اسی کو مدد کے لیے پکارو اور اسی کے حضور اعترافِ نعمت کرو۔ وہیں یہ بھی کہتی ہیں، اور بار بار کہتی ہیں، کہ اللہ ہی کو بے قید و شرط اطاعت کا مستحق اور حقیقی فرماں روا مانو، اسی کو مستقل بالذات قانون ساز تسلیم کرو، اسی کے احکام کی اطاعت کرو، اسی کے دیے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلے کرو، اسی کے ضابطوں کو زندگی کے ضابطے بناؤ، اور اسی کے حلال کو حلال اور اسی کے حرام کو حرام سمجھو۔ اس لیے اُس "عبادت" کا مفہوم، جسے انسان کی پیدائش کا مقصد و مُدعا فرمایا گیا ہے، جو ہر نبی کی دعوت کا سرِ عنوان رہتی رہی ہے، اور جس کا قرآن نے ہمیں حکم دیا ہے، لازماً وہی جامع اور کامل مفہوم ہوگا جس میں پرستش اور اطاعت دونوں چیزیں شامل ہوں۔

اِس سلسلے میں مزید اطمینان کے لیے ایک اور پہلو سے غور کر لیجیے۔ قرآن مجید انسان کے پیدا کیے جانے کا مقصد ایک جگہ ان لفظوں میں بھی بیان کرتا ہے:۔

> خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔[1]
>
> اللہ نے موت اور حیات کا سلسلہ اس لیے جاری کیا ہے تاکہ تمہیں آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون لوگ بہتر عمل والے ہیں۔

ایک اور جگہ یوں فرماتا ہے:۔

---

[1] سورۂ ملک ۔ ۲

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔[۱]

اور یاد کرو اُس وقت کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں۔

اِن دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ انسان کے خالق نے اس کی پیدائش کی غرض و غایت بتانے کے لیے جہاں "عبادت" کی تعبیر اختیار کی ہے، وہیں "بہتر عمل" اور "نیابت" کی تعبیریں بھی اختیار فرمائی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گو یہ الگ الگ الفاظ ہیں، لیکن ان کا منشا الگ الگ نہیں ہے، بلکہ ایک ہی چیز ہے جس کے اظہار و بیان کے لیے مواقع کی مناسبت سے تین مختلف الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کے نزدیک اللہ کی عبادت[۱]، عمل[۲] کی بہتری اور خلافت[۳] و نیابت، دراصل ایک ہی مدّعا کی مختلف تعبیریں ہیں۔ اِس لیے "عبادت" کا کوئی ایسا مفہوم نہیں لیا جا سکتا جس سے بہتر عمل، اور "خلافت و نیابت" کے تصورات پُوری طرح میل نہ کھاتے ہوں، بلکہ اس کا وہی مفہوم لیا جانا ضروری ہے جس کے اندر ان دونوں تصوّرات کی رُوح بھی لازماً موجود ہو۔ ظاہر بات ہے کہ "اچھا اور بہتر عمل" صرف پرستش کو، یا صرف اطاعت کو نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہی حال "خلافت و نیابت" کا بھی ہے۔ اگرچہ اس کا ظاہری مفہوم پرستش کے مقابلے میں اطاعت سے زیادہ قریب ہے، لیکن پرستش بھی اس کے مفہوم سے خارج بہرحال نہیں ہے۔ اس طرح ان دونوں تعبیروں سے یہ حقیقت اور زیادہ روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عبادتِ الٰہی کا جو مفہوم ہے وہ پرستش اور اطاعت دونوں پر حاوی ہے، اور شریعت کا کوئی نقطہ بھی ایسا نہیں جو اس کے دائرے سے باہر ہو۔

صاحبِ نظر علماء پر یہ حقیقت چھپی نہ تھی، اور نہ چھپی رہ سکتی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے جب پوچھا گیا کہ آیت "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الخ" میں جس "عبادت" کا

---

[۱] سورہ بقرہ ـ ۳۰

حکم دیا گیا ہے، اس کا مفہوم و مدّعا کیا ہے؟ تو آپ نے اس مسئلے پر ایک مفصل تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ :-

" عبادت ایک جامع لفظ ہے۔ اس کے اندر وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال اور اقوال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، راست گوئی، امانت داری، صلہ رحمی، دیانت، اطاعتِ والدین، وفائے عہد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ، پڑوسیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مملوکوں کے ساتھ۔ چاہے یہ مملوک انسان ہوں چاہے جانور — اچھا سلوک، دعا، ذکر الٰہی، تلاوتِ قرآن، اور اسی قسم کے تمام اعمالِ صالحہ " عبادت " کے اجزاء ہیں۔ اسی طرح اللہ کی اور اس کے رسول کی محبّت، رحمتِ خداوندی کی اُمید اور عذابِ الٰہی کا خوف، خشیت، امانت، اخلاص، صبر، شکر، توکل اور تسلیم و رضا وغیرہ ساری اچھی صفات عبادت کے اندر شامل ہیں۔"[1]

آگے چل کر ایک جگہ پھر فرماتے ہیں :-

" ان نصوص سے جہاں ایک طرف یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ عبدیت کسی مخلوق کے شرف و مجد اور اس کی سعادت کی معراجِ کمال ہے، وہاں دوسری طرف یہ امر بھی بے نقاب ہو جاتا ہے کہ دین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ عبادت میں داخل ہے۔ سارے انبیاء اللہ کا دین سکھانے آئے تھے، جیسا کہ قرآن میں کئی جگہ اس کی صراحت موجود ہے، اور پھر ہر نبیؑ نے اپنے مخاطب لوگوں کو " فَاعْبُدُوْہُ " (اس کی عبادت کرو) کی تلقین کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ " دین " اور " عبادت " ایک ہی مدّعا کی دو مختلف تعبیریں ہیں۔"[2]

یہ تفصیلات اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتیں کہ عبادت پورے دین

---

[1] العبودیۃ - ص ۲

[2] العبودیۃ

کی پیروی کا نام ہے ۔ دین کے کسی جزو کے بارے میں، خواہ وہ پرستش کی قسم کا ہو خواہ اطاعت کی قسم کا، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عبادت کا کام نہیں ہے ۔ امر حق یہ ہے کہ عبادت کا فریضہ ایک ایک حکم شریعت کی تعمیل کے بعد ہی ادا ہو سکتا ہے ۔ یہ ایک ایسی اکائی ہے جسے ہم تقسیم نہیں کر سکتے ۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ انسانی وجود ایک مکمل وحدت ہے، جسے مختلف وجودوں میں بانٹا نہیں جاسکتا۔

ارکانِ اسلام کی مخصوص اہمیّت

جس طرح جسمِ انسانی ایک مکمل وحدت ہوتے ہوئے بھی دل اور دماغ، ہاتھ اور پاؤں، ناک اور کان وغیرہ مختلف اعضاء پر مشتمل ہے اور ان تمام اعضاء کی اہمیت ہر پہلو سے یکساں نہیں ہے، اسی طرح عبادت بھی بے شمار اجزاء پر مشتمل ہے، اور ان سب کی اہمیت اور قدر و قیمت ہر پہلو سے یکساں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو باقی تمام اجزاء کے مقابلے میں مخصوص اور امتیازی اہمیت رکھتے ہیں، کچھ ویسی ہی مخصوص اور امتیازی اہمیت، جیسی کہ دل اور دماغ وغیرہ اعضائے رئیسہ کو جسم کے باقی حصّوں کے مقابلے میں حاصل ہے ۔ عبادت کے یہ خاص اجزاء وہی ہیں جن کو اسلام کے عملی ارکان کہا جاتا ہے ۔ یعنی نماز، روزہ، حج، اور زکوٰۃ ۔ ان اعمال کو جن وجوہ سے یہ امتیازی اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) یہ سراپا تعلق باللہ ہوتے ہیں ۔ ان میں سے اکثر کا تعلق ظاہر میں بھی تمام تر صرف معبودِ برحق سے رہتا ہے ۔ اس تعلق میں کسی اور کے ذکر یا خیال کی کسی جہت سے بھی کوئی شمولیت نہیں ہوتی ۔ ان اعمال کے انجام پاتے وقت ایک طرف انسان ہوتا ہے، دوسری طرف اس کا اللہ ہوتا ہے جب کہ دوسرے دینی اعمال کا حال اس نوع کی یکسوئی کا نہیں ہوتا ۔ اگرچہ وہ بھی اللہ ہی کے حکم کی پیروی میں اور اُسی کی رضا کے لیے ہوتے ہیں، لیکن ان کی انجام دہی کے وقت مخلوق کا ذکر اور خیال بھی ضرور موجود ہوتا ہے، اور اس کے بغیر وہ انجام پا ہی نہیں سکتے ۔ جب انسان نماز پڑھتا ہے تو اُس کا تعلق براہِ راست اپنے خدا سے ہوتا ہے ۔ لیکن جب وہ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر قانونِ شریعت کے مطابق فیصلے کر رہا ہوتا ہے تو صورتِ واقعہ یہ نہیں ہوتی ۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے رب کے ساتھ براہِ راست

اور پوری یکسوئی کے ساتھ مشغول ہو، درمیان میں کسی اور کا ذکر و خیال بالکل موجود نہ ہو۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اس کا ذہن اگر ایک طرف حکم شریعت کی تعمیل اور رضائے الٰہی کی طلب پر جما ہوتا ہے تو دوسری طرف مقدمہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ساتھ بھی مصروف رہتا ہے۔ اور جہاں تک اس کی زبان، اس کے کان اور اس کی آنکھوں کا تعلق ہے، ان کی مشغولیت تو صرف انہی سے رہتی ہے۔

(۲) ان اعمال کی ہیئت بھی عبادت ہی کے تصوّر کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ جس صورت میں انجام دیے جاتے ہیں اس پر عبادت کی حقیقت کی گہری چھاپ پڑی ہوتی ہے۔ ان کے دیکھتے ہی ذہن آپ سے آپ اس یقین کی طرف دوڑ پڑتا ہے کہ یہ عبادت کا کام ہے، یہ گمان بالکل نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اور کام ہے۔ لیکن دوسرے اعمال کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اُن کے ظاہر پر تصورِ عبادت کی کوئی چھاپ نہیں ہوتی۔ اور اُنھیں دیکھنے کے بعد فوری طور پہ ذہن آپ سے آپ اس طرف شاید ہی منتقل ہو پاتا ہو کہ یہ عبادت کا کام ہے۔

(۳) انسان کے اندر عبدیت کی رُوح اور بندگی کا ذوق پیدا کرنے میں اِن اعمال کا ایک خاص مقام ہے، جو دوسرے دینی اعمال کو حاصل نہیں۔ اگرچہ یہ ہر نیکی اور ہر فعلِ عبادت کا وصف ہوتا ہے کہ اُس سے نفسِ انسانی میں پاکیزگی آتی ہے، بندگی کا جذبہ تازہ ہو جاتا ہے اور اللہ سے تعلق بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک عام حالات کا تعلق ہے، جتنی مقدار میں، جتنی آسانی کے ساتھ اور جس براہِ راست طریقے پر یہ دولتِ دل ان خاص اعمال سے ملا کرتی ہے کسی اور عمل سے نہیں ملتی، بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان اعمال کے، یعنی ان مخصوص عبادتوں کے بغیر انسان میں وہ اندرونی قوت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو کُلّی عبادت کے پُورے فریضے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں فرضِ عین قرار دیا گیا ہے، اور آداب و ضوابط کی پُوری وضاحت کے ساتھ قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ کوئی بھی شخص روحانی طاقت کے ان سرچشموں سے کبھی غافل پڑ جانے کے خطرے کی زد میں نہ رہے جن سے توانائی حاصل کیے بغیر وہ کلی عبادت کے کسی جزو کی بھی تعمیل نہیں کرسکتا۔ غرض یہ مخصوص اعمال بھی اگرچہ "عبادت" ہی کے اجزاء ہیں، مگر ایسے غیر معمولی اجزاء

ہیں جو بجائے خود اہم ہونے کے ساتھ ساتھ دُوسرے سبھی اجزاء کی بجا آوری کے لیے بھی ناگزیر ہیں۔

ان امتیازات کو اگر نگاہ میں رکھ کر غور کیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ ان چاروں احکامِ شریعت یا ارکانِ اسلام کو "عبادت" کی اصطلاح کے ساتھ ایک خصوصی مناسبت حاصل ہے، اور یہ خصوصی مناسبت انھیں اس بات کا خصوصی استحقاق عطا کرتی ہے کہ ان پر اس اصطلاح کا اولین اطلاق ہو۔ جب یہ لفظ کانوں میں پڑے تو ذہن سب سے پہلے انہی کی طرف منتقل ہو۔ حتیٰ کہ جب ان چاروں اعمال کی امتیازی اہمیت ظاہر کرنی ہو تو انہی کو مطلق عبادت کا نام بھی دے دیا جائے، اور عبادت کا لفظ بول کر صرف یہی اعمال مُراد لیے جائیں چناں چہ ایسا فی الواقع کیا بھی گیا ہے۔ اور یہ کوئی غلط اور غیر علمی اندازِ تعبیر نہیں۔ بلکہ نام اور عرف کے معروف طریقے کے عین مطابق ہے۔ یہی طریقہ ہے جس کے مطابق سارے آسمانی مذاہب کے حقیقتاً 'اسلام' ہی ہونے کے باوجود "اسلام" نام صرف آخری دین کا رکھا گیا ہے۔ اسی طریقے سے یہاں بھی کام لیتے ہوئے صرف ان ہی چار اعمال کو عبادت کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ یعنی اگرچہ ہر حکم شریعت کی پیروی فی الواقع عبادت ہی کا کام ہے، لیکن نماز روزے اور حج وزکوٰۃ کے مرتبے ومقام کی غیر معمولی بلندی کے باعث "عبادت" کا لفظ صرف انہی چار اعمال کے لیے مخصوص کر کے بھی بولا گیا ہے۔ جس کا منشا صرف یہ ہے، اور یہی ہونا چاہیے، کہ اس طرح "عبادت" کے مجموعی نظام میں ان اعمال کی امتیازی شان اور خصوصی اہمیت کو نمایاں رکھا جائے۔ یہ منشا ہرگز نہیں ہے، اور نہ ہو سکتا ہے، کہ عبادت کے کام صرف یہی ہیں، اور باقی سارا دین عبادت کے تصوّر سے خارج ہے۔

غلط فہمی اور اس کے وجوہ

"عبادت" کے حقیقی معنی اور جامع مفہوم کے بارے میں عقل کا واضح تقاضا، کلامِ الٰہی کی بیّن شہادت اور صاحبِ نظر علماء کی تحقیق تو یہ ہے جو اوپر کی بحثوں میں آپ

کے سامنے آئی۔ مگر دوسری طرف عام طور سے خیال یہ پھیلا ہوا ہے کہ "عبادت" صرف پرستش کا نام ہے۔ نماز روزہ وغیرہ چند معروف عبادات کے سوا دین میں اور جو کچھ ہے وہ عبادت نہیں ہے۔ احکامِ شریعت کے بہت سے شعبے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک شعبہ عبادت کا ہے۔ پوری شریعت اور اس کے تمام شعبے عبادت نہیں ہیں۔ یہ خیال عوام ہی کے نہیں، کتنے ہی خواص تک کے ذہنوں میں بھی گھر کیے ہوئے ہے، اور اس کے بعض بڑے دُور رس نتائج بھی مرتب ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے نظر انداز کرکے آگے بڑھ جانا صحیح نہ ہوگا۔ ضروری ہے کہ اس کے اسباب و وجوہ معلوم کیے جائیں۔ پتا چلایا جائے کہ ایسے واضح دلائل کے ہوتے ہوئے آخر یہ غلط خیال کہاں سے پیدا ہوا اور روزِ روشن میں اتنی بڑی ٹھوکر کیسے لگی؟ تاکہ اس کی "اصلیت" کا صحیح اندازہ ہو جائے، اور ذہن اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو سکیں کہ یہ بہرحال ایک قابلِ رد خیال ہے۔

جہاں تک اندازہ کام کرتا ہے، اس غلط فہمی کی وجہیں فکری سے زیادہ نفسیاتی ہیں، اور وہ دُو ہیں:۔

(۱) ایک تو یہ کہ اسلام سے باہر کی تقریباً پوری مذہبی دنیا میں عبادت کا یہی محدود تصوّر رائج ہے۔ وہاں عبادت اور پوجا پاٹ دونوں کو بالکل ہم معنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ اور کتنے ہی مذاہب تو ایسے ہیں جو پرستش گاہوں سے باہر جھانکنا بھی عبادت اور دین داری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ جو تصوّر مشرق و مغرب ہر طرف پھیلا ہوا اور دور و قریب کی ساری فضا میں چھایا ہوا ہو، قدرتی طور پر اس میں تسخیر کی غیر معمولی قوت آ جاتی ہے، اور اس سے اُن ذہنوں کا بھی محفوظ رہنا کچھ آسان نہیں رہ جاتا جنھیں اُسے لازماً غلط سمجھنا چاہیے۔ خصوصاً ایسے وقت تو یہ خطرہ اور زیادہ ہو جاتا ہے جب یہ ذہن فکری زوال کی زد میں آچکے ہوں۔ کیوں کہ اس وقت ان کے اپنے افکار و تصورات میں اتنی قوّت باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ دُوسرے افکار کا کوئی اثر قبول نہ کریں۔ خود اسلام کی تاریخ اس بات کی ایک دو نہیں بیسیوں مثالیں پیش کر سکتی ہے۔ اسلام جب تک فکر و عمل کے میدانوں میں ایک غالب نظام کی حیثیت سے چھایا ہوا تھا، اور اس کے اندر اقدام کی رُوح دوڑ

رہی تھی، اس وقت تک غیر اسلامی نظریات پر خود اپنے گھروں کی زمین تنگ تھی، وہ اسلامی تصورات سے کیا آنکھیں ملاتے۔ لیکن جب یہ صورتِ حال باقی نہ رہ گئی تو مسلمانوں کے ذہن بھی آہستہ آہستہ شانِ خودآگاہی کھو بیٹھے اور بیرونی افکار کے لیے انھوں نے اپنے دروازے کھول دیے۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بے شمار غیر اسلامی نظریات عین اسلام بنے ہوئے ہیں، اور دین کی اہم ترین اصطلاحوں تک کی بھی معنوی حُرمت بے داغ نہیں رہ گئی ہے۔ الفاظ بے شک وہی ہیں جو اللہ اور رسول سے ملے تھے، لیکن ان کے معنی ٹھیک وہی نہیں رہ گئے جو بتائے گئے تھے۔ ایسی حالت میں گمانِ غالب یہی ہے کہ "عبادت" کی اسلامی اصطلاح پر بھی فکری زوال کا یہی عمل جاری ہوگیا، اور اس کا وہی محدود مفہوم، جو دوسرے لوگوں میں رائج تھا، آہستہ آہستہ مسلمانوں نے بھی قبول کرلیا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ نماز روزہ وغیرہ عبادات کی خصوصی شان دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ ان اعمال کی جو امتیازی صفتیں اُوپر بیان کی جاچکی ہیں، ماننا پڑے گا کہ ان کے اندر ایسی دل آویزی ہے جو ذہنوں کو اعتدالِ فکر سے بآسانی ہٹالے سکتی ہے۔ عبادت کے کچھ اعمال اگر ایسے ہوں کہ ان کا ظاہر اور باطن دونوں ہی بعض مخصوص امتیازی اوصاف سے آراستہ ہوں، اگر وہ عبد اور معبود کا براہِ راست تعلق ظاہر کررہے ہوں، اگر بندگی کا ذوق اور ایمان کی رُوح بیدار کرنے میں وہ اپنی نظیر نہ رکھتے ہوں اور اگر ان کی صورت بھی سرتا سر عبادت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو—— تو نفسیاتی طور پر بالکل ممکن ہے کہ کچھ لوگ صرف انھی کو عبادت خیال کر بیٹھیں، حتیٰ کہ اگر اسلام کا جامع تصورِ عبادت ذہنوں میں اچھی طرح بیٹھا ہوا نہ ہو تو محض انھی چند اعمال کو کُل عملِ عبادت سمجھ لینا اور دُوسرے تمام اعمالِ شریعت کو عبادت کی حدود سے باہر خیال کر بیٹھنا نہ صرف ممکن ہے، بلکہ عملی طور پر شاید صرف یہی ممکن ہے۔

بظاہر یہی دو خاص وجوہ ہیں جنھوں نے اس غلط فہمی کو جنم دیا ہے۔ ورنہ فی الواقع کوئی عقلی یا نقلی دلیل ایسی نہیں جو اس نظریے کے حق میں پیش کی جاسکتی ہو۔

اسلام اور دیگر مذاہب

وحدتِ ادیان کا نظریہ

اِس وقت مذہبی دنیا میں ایک نظریہ بڑی شہرت اور اہمیت پاتا جارہا ہے جسے "وحدتِ ادیان" کا نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریے کا مفہوم یہ ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں، سبھی خُدا تک پہنچانے والے ہیں، اور سب کے سب آخرت کی فلاح و نجات کا یکساں کام یاب ذریعہ ہیں۔ اس نظریے کی "دلیل" یہ بیان کی جاتی ہے کہ پرستش کا طریقہ چاہے جو بھی ہو، لیکن جب ہر پرستش خدا کو پالینے ہی کے لیے ہوتی ہے تو سب کی قدر و اہمیت بھی برابر ہی ہونی چاہیے۔ اصل قیمت رُوح کی ہوتی ہے نہ کہ جسم کی۔ اس لیے اس امر کی کوئی اہمیت نہیں کہ عبادت کرنے والا عبادت کا طریقہ کیا اختیار کرتا ہے۔ اہمیت جو کچھ ہے وہ صرف اس بات کی ہے کہ وہ عبادت کس کی کر رہا ہے؟ کس کی یاد میں محو ہے؟ کس کے جلووں کو دیکھ لینے کی کوشش میں ہے؟ اور کس کو پالینا چاہتا ہے؟ اگر ہندو اور مسلمان، عیسائی اور یہودی، پارسی اور بدھسٹ، سب اپنے اپنے طور پر خدا ہی کو پُوجتے ہیں، اور سب کا مقصود و مطلوب وہی ہوتا ہے تو ان کی پرستش کے ظاہری آداب اور طور طریقے ایک دُوسرے سے چاہے جتنے بھی مختلف ہوں، سب کی پرستش خدا ہی کی پرستش ہوگی، سب برابر کے طالبِ خُدا ہوں گے۔ اس لیے سب حق پر ہوں گے۔

یہ نظریہ واضح طور پر سارے مذاہب کی حیثیتیں متعیّن کر دینے والا نظریہ ہے۔ اور اس کی رو سے اسلام کی یہ حیثیت قرار پاتی ہے کہ وہ ایک سچّا مذہب ضرور ہے، مگر صرف وہی

سچّا مذہب نہیں ہے، بلکہ دُوسرے مذاہب بھی اسی کے برابر سچّے اور برحق ہیں۔ کیا اسلام کو اپنی یہ حیثیت تسلیم ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ملنا بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ کوئی معمولی سوال نہیں ہے، بلکہ اسلام کی "حیثیت" کا سوال ہے۔ اور اس کا جو جواب ہوگا اس کے نتائج بہت دور تک پہنچنے والے ہوں گے۔ اس جواب کے معلوم کرنے کی ضرورت اس وقت اور شدید ہو جاتی ہے جب کہنے والے یہ بھی کہتے ہوں کہ خود قرآن نے دین کی جو غایت اور رسالت کی جو تاریخ بیان کی ہے وہ نظریۂ مذکور کے خلاف نہیں جاتی، بلکہ اس سے بھی ایک گونہ اس کی تائید ہی نکلتی ہے۔ کیوں کہ وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے ہیں، وہ خود مانتا ہے کہ سارے انبیاء اور ان کے لائے ہوئے دین اللہ ہی کے بھیجے ہوئے تھے، وہ خود کہتا ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے سارے دین "اسلام" ہی تھے۔ ایسی حالت میں اسے اس بات سے انکار نہ کرنا چاہیے کہ جس نبی اور جس دین کی بھی پیروی کرلی جائے وہ خُدا ہی کی بندگی ٹھیرے گی اور اس لیے آخرت کی نجات کے لیے بھی کافی ہوگی۔ یہ ضروری نہ ہوگا کہ ہر شخص قرآن اور اسلام ہی کو اختیار کرے۔

رسالتِ محمدیؐ کی امتیازی حیثیت

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ دراصل رسالت کے بنیادی مسئلے ہی کا ایک پہلو یا حصّہ ہے۔ اِس لیے اسلام اس نظریے کے سلسلے میں اپنے متعلق جو فیصلہ دے گا وہ قطعی طور پر رسالت محمدیؐ کی حیثیت ہی پر مبنی ہوگا۔ اگر اس کے نزدیک اس رسالت کی حیثیت بھی ٹھیک ٹھیک وہی ہے جو پچھلی رسالتوں کی رہی ہے، تو وحدتِ ادیان کے اس نظریے کے بارے میں اس کا فیصلہ موافقانہ ہوگا۔ اور اگر بات یوں نہیں ہے تو یہ فیصلہ بھی کچھ دُوسرا ہی ہوگا۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ رسالتِ محمدی کی حیثیت اس کی نگاہ میں کیا ہے؟ وہی ہے جو دُوسری رسالتوں کی تھی، یا کچھ اور ہے؟ قرآن اور حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتِ واقعی پہلی نہیں، بلکہ دوسری ہی ہے

کیوں کہ رسالتِ محمدیؐ دُوسری رسالتوں کے مقابلے میں کئی مخصوص امتیازات کی مالک ہے :۔

(۱) پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ آپؐ کی نبوت عالم گیر ہے۔ آپؐ زمین کے کسی خاص خطّے یا کسی ایک قوم کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں، بلکہ ساری دنیا کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے بھیجے گئے ہیں جس مالک نے اپنے دوسرے تمام رسولوں کو بھیجا تھا اور جس نے آپؐ کو بھی اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے، یہ اسی کا اعلان ہے کہ :۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ [۱]

ہم نے تمہیں (اے محمدؐ) جو بھیجا ہے تو سارے ہی لوگوں کے لیے خوش خبری سُنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔

قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ [۲]

(اے نبی) کہہ دو کہ لوگو! یقیناً میں تم سب لوگوں کی طرف (بھیجا ہوا) اللہ کا رسول ہوں۔

اور یہ ایک ایسی بات ہے جو آپؐ ہی کے لیے خاص ہے۔ آپؐ سے پہلے جو انبیاء بھی آئے تھے ان میں کسی کی حیثیت یہ نہ تھی۔ کوئی بھی پوری دنیا اور سارے انسانوں کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا، بلکہ ہر ایک کا دائرہ محدود تھا۔ وہ کسی ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم کو اللہ کا پیغام پہنچانے پر مامور ہوتے تھے۔ اور اگر بعض انبیاء کی دعوتی سرگرمیاں کچھ آگے بڑھیں بھی تو زیادہ سے زیادہ قرب وجوار کی حد تک، یا صرف ضمنی طور پر ہی بڑھیں۔ ورنہ ان کا اصل تقرر صرف اپنی قوم ہی کے لیے ہوا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت سے فرمایا ہے کہ :۔

---

[۱] سورۂ سبا ۔ ۲۸

[۲] سورۂ اعراف ۔ ۱۵۸

كُلُّ نَبِيٍّ كَانَ يُبْعَثُ إِلَىٰ قَوْمِهِ خَاصَّةً وَّ بُعِثْتُ إِلَىٰ كُلِّ أَحْمَرَ وَّأَسْوَدَ۔[1]

مجھ سے پہلے کا ہر نبی مخصوص طور پر اپنی ہی قوم کے پاس نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا۔ لیکن میں تمام لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

(۲) دُوسرا امتیاز یہ ہے کہ آپؐ کی نبوت جس طرح عالم گیر ہے اسی طرح ہمیشہ کے لیے بھی ہے۔ آپؐ کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری حد کو پہنچ گیا۔ اب قیامت تک کوئی نیا رسول نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔[2]

بلکہ وہ اللہ کے رسول اور سارے نبیوں کے "خاتم" ہیں۔

"خاتم" مُہر کو کہتے ہیں۔ جب کسی لفافے یا دستاویز پر مہر لگا دی جاتی ہے تو اس کے بعد اس میں اور کوئی چیز نہیں ڈالی جاسکتی، یا کسی اور بات کا اضافہ نہیں کیا جاسکتا، بلکہ یوں کہیے کہ اس طرح کی کسی بات کا عملی امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے سارے انبیاء کا "خاتم" فرمایا جانا اس حقیقت کا نہایت بلیغ انداز میں اعلان ہے کہ اب رسالت کا سلسلہ ختم کیا جاتا ہے، اور یہ آخری رسول قیامت تک کے لیے ہمارا پیام لے کر بھیج دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کوئی اور نبی نہ جائے گا۔ اس فیصلہ خداوندی کی خبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لفظوں میں بھی دی ہے، بے شمار مواقع پر دی ہے اور واضح ترین انداز میں دی ہے۔ مثلاً:۔

.... خُتِمَ بِيَ الْبُنْيَانُ وَخُتِمَ بِيَ الرُّسُلُ۔[3]

.... مجھ سے نبوت کی عمارت مکمل ہو گئی اور میرے ذریعے رسولوں کا سلسلہ اختتام کو پہنچ گیا۔

---

[1] مسلم جلد اوّل، کتاب المساجد [2] سورہ احزاب۔ ۴۰

[3] بخاری، مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلینؐ۔

... لَا نَبِیَّ بَعْدِی۔[1]

... میرے بعد اور کوئی نبی نہ آئے گا۔

آپؐ کے مقابلے میں دوسرے پیغمبروں کا جو حال تھا وہ سبھی کو معلوم ہے۔ ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے بعد کوئی اور پیغمبر نہ آیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نبوتیں جس طرح محدود علاقے کے لیے تھیں، اسی طرح محدود زمانے کے لیے بھی تھیں۔

(۳) رسالتِ محمدیؐ کا تیسرا امتیاز یہ ہے کہ آپؐ جو دین اور شریعت لے کر آئے ہیں وہ ہر پہلو سے کامل ہے۔ جب کہ پچھلے تمام دینوں اور شریعتوں میں سے کسی کی شان یہ نہ تھی۔ بلاشبہ ہر دین اللہ ہی کا نازل کیا ہوا ہوتا تھا، لیکن جب تک یہ دین نہیں آیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان بھی نہیں ہوا کہ :-

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔[2]

(لوگو!) آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

اس طرح یہ شرف اللہ تعالیٰ نے صرف اسلام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا کہ وہ "دینِ کامل" ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے تمام دینوں کو ناقص کہا جائے، اور یہ سمجھا جائے کہ وہ جن لوگوں کی ہدایت کے لیے آئے تھے، اُن کی ہدایت کا اُن کے اندر پورا پورا سامان نہیں تھا۔ ایسا سمجھنا بالکل غلط ہوگا۔ کیوں کہ امر واقعی ایسا ہرگز نہیں تھا، بلکہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دین بھی آیا تھا وہ اُس قوم، اُس زمانے اور اُس علاقے کی اصلاح و ہدایت کے لیے بالکل کافی تھا جس کے لیے اسے نازل کرنے والے نے نازل کیا تھا۔ لیکن چوں کہ ان میں کا ہر دین صرف ایک قوم کے لیے تھا، تمام انسانوں کے لیے نہ تھا، صرف ایک محدود علاقے کے لیے تھا، پوری دنیا کے لیے نہ تھا، صرف ایک خاص زمانے اور محدود مدت کے لیے تھا، ہمیشہ کے لیے نہ تھا ــــ اس لیے قدرتی طور پر اس میں نہ عالمی معاملات و مسائل کے بارے میں ہدایتیں ہوتی تھیں نہ اُس کی ساری تعلیمات کا مزاج بین الانسانی ہوتا تھا اور نہ وہ مستقبلِ بعید تک

---

[1] ترمذی جلد دوم ابواب الفتن۔ [2] سورۂ مائدہ۔ ۳۰

کے مسائل کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتا تھا۔ یعنی جس طرح اس کی مُخاطَبَت کا دائرہ محدود تھا، اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی مختصر اور محدود تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب ایسا نبی بھیجا جائے جو سب کے لیے ہو اور ہمیشہ کے لیے ہو، تو اس فیصلے کا فطری تقاضا یہ ہوا کہ نبی پر نازل ہونے والے دین کا مزاج بھی لازماً بین الانسانی ہو، اور اس کی تعلیمات ہر زمانے، ہر ملک اور ہر طرح کے انسانی مسائل پر حاوی ہوں۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت اسی فطری تقاضے کی تکمیل کا اعلان کر رہی ہے اور کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو ہدایت آدم علیہ السلام کے زمانے سے اُترنی شروع ہوئی تھی اور جو نوعِ انسانی کے ذہنی اور تمدّنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ تفصیل اور وسعت کا رنگ اختیار کرتی چلی آرہی تھی، وہ آج ہر پہلو سے کمال کے درجہ کو پہنچ گئی۔

(۴) اس رسالت کا چوتھا امتیاز یہ ہے کہ آپؐ پر جو کتاب اُتری ہے وہ جُوں کی توں محفوظ ہے، اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ اس میں ایک لفظ کیا، ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ :-

> اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔[1]
>
> اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ قرآن ہم نے نازل کیا ہے اور یقیناً ہم خود اسے محفوظ رکھنے والے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا اعلان شدہ وعدہ ہے، اور اللہ کا وعدہ پُورا نہ ہو اس کا تو کوئی امکان ہی نہیں۔ چناں چہ تاریخ مسلسل گواہی دیتی چلی آرہی ہے کہ قرآن برابر محفوظ چلا آرہا ہے، پھر حفظ و تلاوت کا غیر معمولی رواج اور اہتمام ہی نہیں کتابت و طباعت کی آسانیاں بھی کہتی ہیں کہ اب مستقبل کے آخری لمحہ تک عقلاً بھی اس کتابِ الٰہی کی محفوظیت میں داغ لگنے کا کوئی اندیشہ یا امکان نہیں۔

علاوہ ازیں قرآن عزیز کی زبان بھی ایک زندہ زبان ہے۔ کروڑوں آدمی اسے

---

[1] سورۂ حجر۔ ۹

بولتے ہیں، اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے جاننے، سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے والے بے شمار انسان موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسری کوئی ایک بھی آسمانی کتاب ایسی نہیں جو ان صفتوں کی مالک ہو، اور جو ٹھیک ٹھیک اُن ہی الفاظ و عبارات میں موجود ہو جن میں کہ وہ اپنے لانے والے رسول پر اُتری تھی، اور جس کی زبان آج دنیا کی زندہ زبان ہو۔ اکثر کتابوں کا حال تو یہ ہے کہ اب ان کا کوئی ایک حصّہ بھی موجود نہیں رہ گیا ہے اور جو کتابیں موجود رہ بھی گئی ہیں وہ بھی بہت کچھ بدلی ہوئی حالت میں ہیں۔ کچھ باتیں ان میں بڑھا دی گئی ہیں، کچھ گھٹا دی گئی ہیں۔ بہت پرانے زمانوں کی، اور زمانۂ تاریخ سے پہلے کی تو بات ہی چھوڑیے، جو کتابیں تاریخ کے زمانے کی ہیں، ان تک کا حال قرآن یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں رہ گئی ہیں۔ ان کے پیروؤں نے ان کی عبارتوں کو بدل کر رکھ دیا ہے، اور جو ہدایتیں انھیں دی گئی تھیں ان کا بڑا حصّہ وہ بھلا بیٹھے ہیں (يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ [1] (وہ اس کے کلمات کو ان کے اصلی موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں اور جس چیز سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصّہ وہ بھلا بیٹھے ہیں)۔

امتیازی حیثیت کے لازمی تقاضے

دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالتِ محمدی کی اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں رکھیے اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ اس حیثیت کے لازمی تقاضے کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا یہ کہ ان امتیازات کے باوجود اس نبوت کا بھی مرتبہ و مقام ہر پہلو سے ٹھیک وہی رہے گا جو دوسری نبوتوں کا رہا ہے؟ اور کیا بندگانِ خدا پر اسلام کا حق بھی ویسا ہی ہوگا جیسا کہ دُوسرے دینوں کا ہے؟ اس سوال کے جواب میں عقل و انصاف اور قرآن و حدیث، ہر ایک کا فیصلہ صاف صاف نفی میں ہے۔ ان کے نزدیک ان حقائق کے منطقی تقاضے

---

[1] سورہ مائدہ۔ ۱۳

لازماً بالکل دوسرے ہی ہوں گے، اور وہ یہ ہوں گے:۔

۱۔اسلام کی پیروی ضروری ہے

رسالتِ محمدیؐ کی اس امتیازی حیثیت کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا تو یہ ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور منظور شدہ دین صرف اسلام ہے۔ ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانہ کا انسان اسی کی پیروی کرے۔ کیوں کہ جب یہ دین ساری دنیا کا دین، اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوعِ انسانی کا پیغمبر ہے تو اب کسی اور دین اور کسی پیغمبر کا زمانۂ اتباع باقی نہیں رہ سکتا۔ رسول تو آتا ہی اس لیے ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجا گیا ہو وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط پیروی کریں۔ اللہ تعالیٰ کا صاف صاف فرمانا ہے کہ "ہم نے جو رسول بھیجا اسے اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے اذن کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے"۔ (وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ[1]) پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہ ارشادِ حق بے معنی الفاظ بن کر نہ رہ جائے گا۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی اس اصولی ارشاد کا اسی طرح اطلاق نہ ہو جس طرح کہ دوسرے تمام انبیاء کے سلسلے میں ہوتا آیا ہے۔ اس لیے آپؐ کا سارے انسانوں کی طرف مبعوث ہونا اور پھر آخری رسول ہونا اس بات کا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپؐ پر ایمان لائے، اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر لازماً اسی کی پیروی کرے۔ اگر کوئی شخص آپؐ کی نبوت کو نہیں مانتا اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کا حلقہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا، تو یہ آپؐ کے نہیں، بلکہ اس فرماں روائے کائنات کے خلاف بغاوت ہے جس نے آپؐ کو پوری دنیا کا ہادی اور آخری نبی بنا کر بھیجا ہے۔

اس کے علاوہ جب قرآن کریم کے سوا اب دوسری کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی اصل زبان دنیا کی مُردہ زبانوں میں شامل نہ ہو چکی ہو، تو دوسری کتابوں اور شریعتوں کی ٹھیک ٹھیک پیروی ممکن بھی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ صورتِ حال تو گویا خود اِن کتابوں اور شریعتوں کا اقراری بیان ہے کہ اب ہمارا زمانہ ختم ہو چکا ہے،

---

[1] سورہ نساء۔ ۶۴

اور ہمیں منسوخ قرار دیا جا چکا ہے۔

یہ تو قیاس اور عقل کا فیصلہ تھا۔ اب آئیے قرآن اور اسلام کا اپنا با ضابطہ فیصلہ سُنیے :-

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔[1]

کوئی شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک (مقبول) دین، اسلام ہے۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔[2]

اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

ان دونوں آیتوں کے الفاظ سورج کی طرح روشن ہیں، اور ان سے امرِ واقعی پوری طرح بے نقاب ہو جاتا ہے۔ پہلی آیت کا یہ کہنا کہ "اللہ کے نزدیک مقبول دین اسلام ہے۔" بات کو واضح کر دینے کے لیے بالکل کافی تھا، لیکن دوسری آیت نے تو یہ کہہ کر اسے وضاحت اور بداہت کے آخری درجے تک پہنچا دیا ہے کہ "اب اللہ کے نزدیک کوئی دوسرا دین تسلیم شدہ اور قابلِ قبول نہ ہوگا، اور اسلام کو چھوڑ کر اگر کسی دوسری شریعت کی پیروی کی گئی تو وہ خدا کی بندگی نہ قرار پائے گی۔

یہاں ایسا گمان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ ان آیتوں میں "اسلام" سے مُراد عام مفہوم کا اسلام ہے، نہ کہ مخصوص اصطلاحی اسلام، اس لیے اس سے مراد ہر آسمانی مذہب کی پیروی ہونی چاہیے۔ اس گمان کی یہاں اس لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ان آیتوں میں اسلام کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے، بلکہ "الف لام" کے اضافے کے ساتھ "الاسلام کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور جیسا کہ عربی زبان کے اصول کا تقاضا ہے، قرآن جب "اَلْاِسْلَامُ" کا لفظ بولتا ہے تو اس وقت اس کے سامنے اسلام کا محض لغوی یا عام مفہوم نہیں ہوتا، بلکہ خاص

---

[1] سورۂ آل عمران - ۱۹ [2] سورۂ آل عمران - ۸۵

اصطلاحی مفہوم ہی ہوا کرتا ہے۔

اگر اس بات سے اتفاق نہ کیا جائے اور الاسلام سے مراد عام مفہوم ہی کا اسلام سمجھا جائے، تب بھی ہمارے اس استدلال پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ امرِ حق پھر بھی وہی رہے گا جو عرض کیا گیا ہے۔ کیوں کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے بعد عملِ اسلام کی صورت عام اور غیر متعین نہیں رہ گئی ہے، کہ جس دین و شریعت کی بھی پیروی کر لی جائے عند اللہ مقبول ہی ٹھیرے گی، بلکہ خاص اور متعین ہو چکی ہے۔ اور وہ یہ کہ آپؐ پر ایمان لایا جائے اور لازماً آپؐ ہی کی پیروی کی جائے۔ اس لیے کہ قرآن کے اندر اللہ تعالیٰ صراحت کے ساتھ یہ منادی کر چکا ہے کہ یہ رسالت ساری دنیا کے لیے ہے، اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس رسالت پر ایمان نہیں لاتا، یا آپؐ کو سچّا رسول تسلیم کرنے کے باوجود آپؐ ہی کی پیروی کا راستہ اختیار نہیں کرتا اور کسی اور پیغمبر کی پیروی پر اصرار کیے جاتا ہے تو یہ اللہ کی کامل اطاعت نہیں، بلکہ اپنے نفس کی کامل اطاعت ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تو کھلی ہوئی نافرمانی ہی ٹھیرے گی۔

اس بات کا ثبوت، کہ اسلام کی پیروی ضروری ہے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل میں بھی موجود ہے۔ اور یہ ایسا ثبوت ہے جس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے سے صرف ہٹ دھرمی اور خود پرستی ہی روک سکتی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ سارے دین سچے ہیں اور ہر رسول کی پیروی یکساں طور پر برحق ہے، تو اس کا کھُلا ہوا منطقی تقاضا یہ تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہود اور نصاریٰ کو اسلام لانے کی دعوت نہ دیتے۔ کیوں کہ وہ خود صاحبِ کتاب و شریعت تھے، اور اگر دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبے پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے۔ اس کے بخلاف آپؐ ان سے صرف یہ کہتے کہ تورات اور انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو۔ بس تم سے صرف یہی چاہتا ہوں۔ اپنی نبوت کے تسلیم کرنے اور قرآن کی پیروی کا تم سے کوئی لازمی مطالبہ نہیں رکھتا ــــ لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپؐ نے انھیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی، اور ان کے لیے بھی اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا تھا جیسا کہ ان کے لیے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰى اَدْبَارِهَا اَوْ نَلْعَنَهُمْ.... الخ [1]

اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی تھی، ایمان لاؤ اس کتاب پر جسے ہم نے (اب) اُتارا ہے جب کہ یہ اس کتاب (کی پیشین گوئیوں) کے عین مطابق بھی ہے جو تمہارے پاس ہے، قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور انھیں پیٹھوں کی طرف پھیر دیں یا ان پر لعنت کر دیں۔ الخ

نہ صرف یہ کہ آپؐ نے انھیں اسلام لانے کی دعوت دی، بلکہ ان میں سے جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا انھیں صاف لفظوں میں "کفر" کا مرتکب اور "دوزخی" فرمایا گیا۔ حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکارِ اسلام کو صرف کفر ہی نہیں، بلکہ "بدترین کفر" اور انھیں صرف کافر ہی نہیں، بلکہ "پکّا کافر" کہا گیا ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَّاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ [2]

جو لوگ اللہ کے اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ بعض پیغمبروں کو ہم مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے، اور اس طرح کفر اور ایمان کے درمیان کی راہ اختیار کر لینا چاہتے ہیں، وہ پکّے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں اہلِ کتاب کو ان کے جس طرزِ عمل کی بنا پر "اَلْکَافِرُوْنَ حَقًّا" کہا گیا ہے،

---

[1] سورۂ نساء - ۴۷

[2] سورۂ نساء - ۱۵۰ - ۱۵۱

وہ صرف یہ تھا کہ وہ جہاں دوسرے انبیاء کو اللہ کے رسول مانتے تھے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے، حالاں کہ جس طرح اللہ کے رسول وہ حضرات تھے اسی طرح آپؐ بھی تھے۔ پھر ان کی یہی روش تھی جس کو "ایمان اور کفر کے درمیان کی راہ نکالنا" فرمایا گیا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ دُوسرے انبیاءؑ کو مان کر اگر وہ ایمان باللہ کا مظاہرہ کرتے نظر آرہے تھے تو رسالتِ محمدیؐ کا انکار کر کے اللہ کی معبودیت اور حاکمیت کو ٹھکرا بھی رہے تھے۔ پھر یہی رویّہ تھا جس کو "اللہ کا اور اس کے رسولوں کا کفر کرنا" بھی کہا گیا ہے۔ کیوں کہ خدا کے کسی رسُول کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا دراصل نہ خدا کو ماننا ہے نہ کسی رسول کو ماننا ہے، بلکہ محض اپنی خواہشِ نفس کا ماننا ہے۔

قرآنِ مجید نے ایک اور جگہ اہلِ کتاب کے انکارِ اسلام کا تذکرہ، اور پھر اس پر اپنا تبصرہ ان لفظوں میں کیا ہے:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ۔[1]

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے اللہ نے اُتارا ہے، تو کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اُتاری گئی تھی۔ اور اس طرح وہ اس کے ماسوا ہدایاتِ الٰہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر جاتے ہیں۔

دعوتِ اسلام کے جواب میں وہ یہ جو کچھ کہتے تھے اور جس انداز سے کہتے تھے، اسے غور سے دیکھیے۔ یہ ٹھیک وہی "فلسفہ" تھا جو آج وحدتِ ادیان کے نظریے کی بنیاد ہے۔ یعنی یہ کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے؟ آخر اس کے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کو اپنانا ہمارے لیے ضروری کیوں ہو؟ وہ اپنی جگہ حق، یہ اپنی جگہ حق۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اس "فلسفے" کو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہتا، بلکہ اسے صاف طور سے "کفر" کا فلسفہ قرار دیتا ہے، اور انھیں "یہ بھی حق

---

[1] سُورۂ بقرہ – ۹۱

وہ بھی حق" کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر (کافر) ٹھیراتا ہے۔

غرض قرآنِ حکیم نے اہلِ کتاب کے انکارِ اسلام کو بھی ٹھیک وہی حیثیت دی ہے جو مشرکوں کے انکار کو دی تھی اور انجام بھی دونوں کے ایک ہی بتاتے ہیں۔ اس نے اہلِ کتاب کے لیے اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں ... ی تھی کہ وہ اسلام کے بجائے اپنے ہی دین پر قائم رہ سکتے ہیں، خدا اسے بھی قبول فرمائے گا۔

پھر بات اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس سے بھی آگے، کہیں آگے، تک جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَّا وَسِعَہٗ اِلَّا اِتِّبَاعِیْ۔[1]

اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو اُن کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ میری پیروی کریں۔

یہ ارشادِ نبویؐ مسئلے کو اس حد تک واضح کر دیتا ہے جس کے بعد وضاحت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اللہ کے جس نبی کی حیثیت یہ ہو کہ دوسرے انبیاءؑ اگر اس کے زمانے میں موجود ہوتے تو وہ بھی اسی کے اُمتی اور پیرو بنتے، اور ان کی لائی ہوئی شریعتوں کی پیروی کی گنجائش خود ان کے اپنے لیے بھی باقی نہ رہتی، اس کی پیروی کی ذمہ داری اور ضرورت سے بھلا کوئی عام انسان کیسے مستثنیٰ رہ سکتا ہے؟ اور اس کے لائے ہوئے دین کی موجودگی میں کوئی اور دین کسی کے لیے کس طرح قابلِ اتباع ہو سکتا ہے۔؟

۲۔ اِسلام کی پیروی شرطِ نجات ہے

رسالتِ محمدیؐ کے مخصوص امتیازات کا دُوسرا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آخرت کی نجات اسلام ہی پر موقوف ہے۔ کیوں کہ جب ہر شخص کے لیے اسلام کی پیروی ضروری ہے، اور اب کوئی اور دین اللہ کے نزدیک مقبول اور مستحقِ اتباع و لائقِ نفاذ نہیں رہ گیا ہے، تو اس کے معنی لازماً یہ ہوں گے

---

[1] احمد، بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ، باب الاعتصام۔

کہ اسلام کی پیروی شرطِ نجات ہے۔ واضح بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جن شریعتوں کو اب خود ناقابلِ قبول یعنی منسوخ ٹھیرا چکا ہے، ان کی پیروی پر وہ کوئی اجر کیسے دے گا۔ چناں چہ "وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ" فرمانے کے ساتھ وہ اپنے اس فیصلے کا بھی اعلان کر چکا ہے کہ:-

وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ [1]

اور ایسا شخص آخرت میں قطعاً نامراد رہے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلۂ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ بِيْ اَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَّلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِيْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ [2]

قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے، اس اُمّت میں سے جس کسی بھی شخص تک، مثلاً کسی یہودی یا نصرانی تک، میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مرگیا۔ تو وہ دوزخی ہوگا۔

اس حدیث میں اگرچہ نام صرف یہود اور نصاریٰ کے، لیے گئے ہیں، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نام صرف مثال کے طور پر لیے گئے ہیں۔ ورنہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل عام ہے، اور ایک کلیہ اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کا کوئی گروہ، کوئی قوم اور کوئی ملّت ایسی نہیں ہے جس پر اس کا اطلاق نہ ہوتا ہو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو کھینچ تان کر نکالی جا رہی ہو، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس حدیث کے الفاظ "اَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ" سے نکلتی ہے کیوں کہ "هٰذِهِ الْاُمَّةِ" (اس امت) سے مُراد واضح طور پر "اُمّتِ دعوت" یعنی وہ پورا گروہِ انسانی ہے جس کی طرف آپؐ نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، پوری نوعِ انسانی پر

---

[1] سورہ آلِ عمران۔ ۸۵۔ [2] مسلم جلد اول، باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

مشتمل ہے۔ اس لیے یہ حدیث اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں رہنے دیتی کہ آپؐ پر ایمان لانا ہر اُس شخص کے لیے ضروری اور شرطِ نجات ہے جو آپؐ کے زمانے میں موجود تھا، یا اس کے بعد کبھی پیدا ہوا۔ اس فیصلۂ خداوندی کے تحت جس طرح یہود اور نصاریٰ آتے ہیں، اسی طرح دوسری قومیں اور ملّتیں بھی آتی ہیں، بلکہ ایک حیثیت سے تو دُوسری قوموں اور ملّتوں پر اس کا اطلاق اور زیادہ شدّت اور اہمیت سے ہوتا ہے۔ دنیا کی ساری قوموں اور ملّتوں میں سے صرف یہود اور نصاریٰ ہی دو ایسے گروہ ہیں جن کو قرآن نے صاف اور صریح الفاظ میں "اہلِ کتاب" کہا ہے اور ان کا نام لے کر کسی نبیؐ کا اُمتی اور کسی آسمانی شریعت کا حامل قرار دیا ہے۔ اگر ایسی ملّتوں کے افراد کے لیے بھی رسالتِ محمدیؐ کی پیروی شرطِ نجات ہے، تو عقل کہتی ہے کہ اُن قوموں اور ملّتوں کے لیے اس کا شرطِ نجات ہونا اور زیادہ ضروری ہوگا جن کو قرآن نے صاحبِ کتاب و شریعت نہیں کہا ہے۔

اس تفصیل سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں تک اسلام کے اپنے فیصلے کا تعلق ہے، وہ بالکل دو ٹوک انداز میں اپنی پیروی کو سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرطِ نجات قرار دیتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جسے اس کا پیغام پہنچا ہی نہ ہو، جیسا کہ "لَا یَسْمَعُ بِیْ" کی قید لگا کر آپؐ نے واضح بھی فرمادیا ہے۔ کیوں کہ اس شکل میں وہ فی الواقع معذور ہوگا، اور جب تک کوئی شخص فی الواقع معذور ہو اور اس کے پاس امرِ حق پہنچا ہی نہ ہو اس وقت تک اس پر اس کی پیروی کی ذمہ داری ڈالنا اور اسے اس بارے میں جواب دہ ٹھہرانا یقیناً بے انصافی ہی کی بات ہوگی لیکن جو لوگ اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد بھی اسے نہ مانیں، ان کا پکڑا جانا کسی طرح ناانصافی نہیں ہے۔ ناانصافی اگر ہے تو یہ کہ انھیں نہ پکڑا جائے، کیونکہ اُن کا یہ نہ ماننا کسی چھوٹی بات اور کسی معمولی حق کا نہ ماننا نہیں ہے، بلکہ دنیا کی سب سے بڑی بات اور سب سے بڑے حق کا نہ ماننا ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے حقِ فرماں روائی کا ٹھکرانا ہے۔ اس لیے یہ انتہائی غلط اور احمقانہ اندازِ فکر ہوگا کہ ایسے لوگوں کے پکڑے جانے کو انصاف اور معقولیت کے خلاف سمجھا جائے۔ دنیا کسی ایسے حکمراں کا تصوّر تک نہیں کرسکتی جس نے اپنی رعایا کو اس بات کی کھُلی چھٹی دے رکھی ہو کہ وہ اس کے

فرمانوں کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق سلوک کرے ۔ چاہے تو اس کے موجودہ گورنروں اور رائج الوقت قانونوں کو تسلیم کرلے اور چاہے تو نہ کرے ۔ اور ان کے بجائے اس کے رٹائر ہوچکنے والے گورنروں اور منسوخ شدہ قانونوں ہی کو مانتی رہے ۔ پھر کیا یہ کوئی معقول بات ہوگی کہ ایسے لغو تصوّر کو اس حکمراں کی طرف منسوب کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کیا جائے جو سارے حکمرانوں کا حکمراں اور پوری کائنات کا حقیقی فرماں روا ہے ؟ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے اپنے جن پیغمبروں کا دورِ پیغمبری ختم کردیا اور اپنی جن شریعتوں کو منسوخ قرار دے دیا ہے ، بدستور ان کی پیروی پر اصرار کرنے والوں کو وہ اپنا وفادار اور فرماں بردار بندہ تسلیم کرتا رہے ؟ اور اپنے اس پیغمبر کی اطاعت اور اپنی اُس شریعت کی پیروی سے انکار کے باوجود انھیں بغاوت کی سزا نہ دے جسے وہ اِس دَور کے لیے اپنا جہانی اور ابدی پیغمبر، اور اپنی عالم گیر شریعت قرار دیے جانے کا اعلان کرچکا ہے ؟ یہ عجیب ''بندگی'' اور ''فرماں برداری'' ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی پرستش اور اطاعت اور رضا طلبی کے لیے '' زید'' کو اپنا ہادی بنانے کا حکم دے ، مگر اُسے جواب دیا جائے کہ نہیں ، ہم تو اِس غرض کے لیے ہر حال میں ''بکر'' ہی کا دامن پکڑے رہیں گے ! ہاں جسے یہی نہ معلوم ہو کہ اس وقت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاکمِ مجاز اور ہادیِ برحق کون ہے ، اس کی بات دوسری ہے ۔ مگر جسے یہ معلوم ہو اور جسے یہ بتایا جاچکا ہو ، وہ بھی اگر یہ روش اختیار کرتا ہے تو اس کی یہ روش کسی طرح حق بجانب نہیں قرار دی جا سکتی ۔

---- ❊ ----

اُمّتِ مسلمہ کی ذمّہ داریاں

اِسلام کی مخصُوص حیثیت کا مخصُوص تقاضا

اسلام کے عام اور ضروری تعارف کی بحث اب بظاہر پوری ہوجاتی ہے۔ مگر خود اس تعارف نے ایک ایسا اہم مسئلہ پیدا کر دیا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے، اور جس کے حل کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ مسئلہ اسلام کی اُس مخصوص اور ممتاز حیثیت سے تعلق رکھتا ہے جو اسے دوسرے تمام دینوں کے مقابلے میں حاصل ہے۔ یعنی یہ کہ صرف وہی ہر حیثیت سے کامل دین ہے، سارے انسانوں کے لیے ہے، آخری دین ہے، اور نجات کے لیے ضروری ہے کہ اسی کی پیروی کی جائے۔ عقل کہتی ہے کہ اسلام کو اگر یہ مخصوص حیثیت حاصل ہے تو اس مخصوص حیثیت کا ایک مخصوص لازمی تقاضا بھی ہوگا۔ اور وہ یہ کہ اسے دُنیا کے گوشے گوشے تک پہنچنا چاہیے اور برابر پہنچتے رہنا چاہیے، قوم قوم کے سامنے اس کی وضاحت ہونی چاہیے، اور پیہم ہوتی رہنی چاہیے، فرد فرد کو اس کا پیغام دیا جانا چاہیے اور مسلسل دیا جاتا رہنا چاہیے۔ ورنہ دنیا اسے جان پہچان نہ سکے گی اور جب جان ہی نہ سکے گی تو اس پر ایمان کس طرح لا سکے گی۔ حالاں کہ وہ اس پر ایمان لانے کی مکلّف قرار دی گئی ہے۔ اور اگر ایمان نہیں لاتی تو بدبختی کا شکار بنتی ہے۔ یہ تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوگی کہ بے شمار لوگوں کے لیے ان کے مالک کی بھیجی ہوئی ہدایت ایک راز ہی رہے، اور انھیں بے خبری میں پکڑ لیا جائے۔ اس لیے اگر انسانیتِ عامّہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلام ہی کی پیروی کرے، تو اس فرض سے پہلے اس کا یہ حق ہے کہ اسے اس دین سے واقف کرایا جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ خود اسلام پر بھی ظلم ہے، کیوں کہ اس طرح وہ

بڑی حد تک بے مصرف بن کر رہ جائے گا۔ اور انسانیت پر بھی ظلم ہے، کیوں کہ اس طرح وہ اس نعمت سے لازماً محروم رہ جائے گی جس پر اس کا مقدر موقوف ہے۔ جب تک اسلام کا لانے والا رسول دنیا میں موجود تھا، بلاشبہ اس نے بہترین طریقے سے انسانیت کا یہ "حق" ادا کیا لیکن اس کے چلے جانے کے بعد بھی تو یہ حق اپنے ادا کیے جانے کا مطالبہ کر رہا ہے، اور قیامت تک کرتا رہے گا۔ اب تو کوئی نبی بھی آنے والا نہیں کہ یہ حق اس کا انتظار کرے۔

اگر اسلام کی اس مخصوص حیثیت کے اس لازمی تقاضے کا کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا، اور یقیناً نہیں کیا جا سکتا تو ضروری ہے کہ وہ پورا ہو۔ قطع نظر اس بات سے کہ اس کا پورا ہونا کتنا مشکل کام ہے، اس کا کوئی مؤثر اور مستحکم عملی نظم بہرحال ہونا چاہیے، اور نہ صرف یہ کہ کوئی عملی نظم ہونا چاہیے، بلکہ اس کا تعین اسلام کی اپنی زبان سے ہونا چاہیے کیوں کہ جب وہ خدا کا بھیجا ہوا دین ہے، اور اسے فی الواقع ساری دنیا کے لیے اور ہمیشہ کے واسطے بھیجا گیا ہے، تو قدرتی طور پر اس کی یہ ذمہ داری بھی قرار پاتی ہے کہ وہ لوگوں تک اپنے پہنچنے اور پہنچتے رہنے کا کوئی مستقل اور مؤثر و کارگر نظم بھی قائم کرے اور قائم رکھے۔

اُمّت کی مخصُوص ذمّہ داری

اس غرض سے جب ہم قرآن کریم کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے اس مسئلے کا حل پورے اہتمام سے کر رکھا ہے، اور جتنا عظیم الشان ابلاغِ حق کا یہ کام تھا اتنا ہی عظیم الشان اس کا نظم بھی کیا ہے۔ اس حل اور اس نظم کے الفاظ یہ ہیں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔[1]

اور اسی طرح ہم نے تم (اہلِ ایمان) کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت بنایا ہے' تاکہ تم دوسرے تمام لوگوں کے لیے (ہمارے نازل کیے ہوئے دینِ حق کے) "شاہد"

---

[1] سورۂ بقرہ ۔ ۱۴۳

بنو، اور ہمارا رسول تمہارے لیے شاہد بنے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس حل اور اس نظم کی عملی شکل یہ قرار پاتی ہے :۔

(۱) اِسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کام رسول اپنی زندگی میں کرتا رہا ہے، اس کے دنیا سے رُخصت ہو جانے کے بعد وہ اس کے پیرووں کے ذمّہ ہو گیا ہے، اور اب یہ لوگ اس وقت تک اس کام کے ذمّہ دار رہیں گے جب تک وہ اس زمین پر موجود ہیں۔

(۲) اِسلام کو دوسروں تک پہنچانے، کا مطلب محض عام طرز کی تبلیغ و اشاعتِ حق نہیں ہے، بلکہ ایسی تبلیغ و اشاعت ہے جسے "شہادت" (گواہی) کہہ سکیں۔

(۳) شہادتِ اسلام یا شہادتِ حق کا ایک متعین مفہوم ہے، جس کا تعین رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کرتا ہے۔ یعنی اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام مسلمان اپنے بس بھر ٹھیک اسی طرح کریں گے اور برابر کرتے رہیں گے، جس طرح آں حضرتؐ نے خود ان تک (یعنی صحابہؓ تک) اس کے پہنچانے کا کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ پچھلی اُمّتیں اگر صرف ایک ذمّے داری رکھتی رہی ہیں، اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرتی رہیں، تو اُمّتِ مسلمہ اس عام ذمّے داری کے ساتھ ساتھ خصوصیت سے ایک ذمّے داری اور بھی رکھتی ہے۔ اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے وہ اسلام کی اس طرح گواہی دیتی رہے جس طرح کی گواہی دینے کا حق ہے، اور جس کا عملی نمونہ اس کا رسول اُس کے سامنے رکھ گیا ہے۔ دراصل اس معاملے میں امرِ واقعی ہے ہی یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے، لیکن اس عالم گیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی شکل اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمائی تھی، اور فطری طور پر یہی صحیح بھی تھی اور یہی ممکن بھی تھی، کہ آپؐ اپنا قائم مقام ایک ایسا گروہ تیّار کر دیں جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عمل میں اتنا معیاری "مسلم"، ہو کہ وہ آپؐ کے بعد آپؐ ہی کی طرح حق کی ٹھیک ٹھیک شہادت دے سکے، اور پھر یہ گروہ اپنے بعد کی نسل کو اس کام کے لیے تیار کرے، اور یہ سلسلہ آخر تک یُوں ہی چلتا رہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب اہلِ عرب فوج در فوج دین کے حلقے میں داخل ہونے لگے، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہؓ کا مقدس گروہ وجود میں آگیا تو

آپؐ کی اپنی اصل ڈیوٹی گویا پوری ہوگئی ، اس لیے آپؐ کو واپس بلا لیا گیا[1]۔ اس کے بعد دوسرے بندگانِ خدا کے سامنے اسلام کی تبلیغ وشہادت کا کام اس وقت کی اُمّتِ مسلمہ (یعنی صحابۂ کرامؓ) کے ذریعے انجام پانے لگا جسے آپؐ "شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ" بنا گئے تھے ۔ اس طرح حقیقتِ واقعی یہ قرار پاتی ہے کہ آپؐ کی بعثت اہلِ عرب کی طرف تو براہِ راست تھی ، مگر باقی دنیا کی طرف اس "اُمّتِ مسلمہ" کے توسط سے تھی جسے آپؐ تیار کر گئے تھے ، اور جو نسلاً بعد نسلٍ وجود میں آتی اور تیار ہوتی رہے گی ۔ اِس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد اب قیامت تک یہ کام اِس اُمّت کا ہے کہ دنیا کے سامنے حق کی شہادت دیتی رہے ، اور اپنے بس بھر اُسی طرح دیتی رہے جس طرح دینے کا حق ہے ۔ مختصر یہ کہ یہ اُمّت اپنے مجموعی وجود میں اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے ، اور بحیثیت اُمّت اس کی زندگی کا مشن ٹھیک وہی ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تھا ۔

اُمّتِ مسلمہ کی یہ ذمّہ داری کوئی معمولی ذمّہ داری نہیں ہے ، بلکہ بہت بڑی اور انتہائی ہمہ گیر ذمّہ داری ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "ہم نے تمہیں وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی اُمّت بنایا ہے تاکہ تم باقی سارے انسانوں کے لیے دینِ حق کے گواہ بنو" اس اُمّت کی حیثیت صاف طور سے یہی مقرر کر رہا ہے ۔ مزید صراحت اس کے اس ارشاد سے ہو رہی ہے :

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۔ الخ[2]

تم ایک بہترین اُمّت ہو جو سارے انسانوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہے ۔ الخ

یہ الفاظ خداوندی صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ اُمّت کچھ اُسی طرح کی ایک اُمّت نہیں ہے جس طرح کی اُمّتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں ، بلکہ ایسی اُمّت ہے جو باقی ساری نوعِ انسانی کی ہادی ، اور پوری انسانیت کی پاسبان بنائی گئی ہے ۔ اور یہی اس کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے ، کسی چیز کی قدر وقیمت اسی وقت تک باقی رہا کرتی ہے جب تک وہ اپنے وجود کے مقصد کو پورا کرتی رہتی ہے ۔ اس مقصد سے بے تعلق ہو جانے کے

---

[1] سورہ نصر کی آیتیں ملاحظہ ہوں [2] سورۂ آل عمران - ۱۱۰

بعد وہ اپنی ساری قدر و اہمیت کھو دیتی ہے۔ اس لیے اُمّتِ مسلمہ کی اصل قدر و اہمیت بھی اسی "شہادت" پر موقوف ہے۔ وہ "اُمّتِ وَسَط" اور "خیر امت" فی الواقع اسی وقت تک ہے جب تک کہ وہ دنیا کے سامنے حق کی گواہ بن کر کھڑی رہتی ہے۔ ورنہ ان القاب کے استحقاق سے محروم ہو جائے گی۔ حد یہ ہے کہ اپنے اصل نام (اُمّتِ مسلمہ) تک کی مستحق نہ رہ جائے گی۔ کیوں کہ جیسا کہ بتایا جا چکا، اس کا یہ نام کوئی رسمی قسم کا نام نہیں، بلکہ ایک صفاتی نام ہے، اور اسے مخصوص طور پر صرف اس لیے ملا ہے کہ اس کی مسلمانہ ذمّہ داریاں دُوسری اُمّتوں کے مقابلے میں دوہری تھیں۔ سورۂ حج کے ان الفاظ کو غور سے پڑھیے :-

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ [۱]

اُس نے تمہیں منتخب کیا ہے، اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ اپنے باپ ابراہیم کے راستے کی پیروی کرو، اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام "مسلم" رکھا ہے، اور اسی خصوص میں رکھا ہے، تاکہ رسول تمہارے لیے (دینِ حق کا) شاہد ہو، اور تم دُوسرے تمام لوگوں کے لیے شاہد بنو۔

اِس آیت میں اُمّتِ مسلمہ کی مخصوص حیثیت اور اس کی مخصوص ذمّہ داری، دونوں چیزوں کو پوری طرح اُجاگر کر دیا گیا ہے۔ سبؔ سے پہلے تو اس کے الفاظ 'اِجْتَبٰىكُمْ' کو دیکھیے، "اجتباء" کے تقریباً وہی معنی ہیں جو لفظ "اصطفاء" کے ہیں۔ یعنی چیزوں میں سے بہتر شے کا انتخاب۔ یہ لفظ قرآن مجید میں عام طور سے انبیاء کے انتخاب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ایک ایسا لفظ، جو منصب نبوت کی خاطر کیے جانے والے انتخاب کے ہم معنی ہو، اسے اگر ایک اُمّت کے انتخاب کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے تو یہ اس امر کی نشان دہی ہے کہ اس کی حیثیت اور

---

[۱] سُورۂ حج - ۷۸

شانِ پیغمبرانہ حیثیت اور شان کا عکس ہے۔ اس کے بعد "ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ" کے لفظوں کی طرف آئیے۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ خاص طور پر اسی اُمّت کو "مسلم" نام سے نوازا گیا ہے، اور آج نہیں، مدّتوں پہلے اس کا یہ نام رکھا جا چکا تھا۔ یہ اس اُمّت کے ایک ممتاز اور غیر معمولی حیثیت کی مالک اُمّت ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس طرح نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت آپؐ کی آمد سے سیکڑوں سال پہلے ہی دی جا چکی تھی اور دُنیا اس بشارت کے ظاہر ہونے کے لیے ایک مدّت سے آنکھیں لگائے منتظر بیٹھی تھی، کچھ ویسا ہی معاملہ آپؐ کی اُمّت کا بھی تھا۔ ابھی اس کے وجود پزیر ہوتے میں شب و روز کی ہزاروں گردشیں باقی تھیں، مگر اس کے نام کا، اس کے کام کا اور اس کے اوصاف کا اعلان پہلے ہی سے کر دیا گیا تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اعلان محض ایک اعلان نہ تھا، بلکہ اعلانِ بشارت تھا اور یہ بشارت اس اُمّت کے ایک غیر معمولی اُمّت ہونے کی دلیل تھی کیوں کہ کسی فرد یا گروہ کے معرضِ وجود میں آنے کی اطلاع اتنے پہلے سے اسی وقت دی جاتی ہے جب وہ کوئی مخصوص اہمیت رکھتی ہو۔ اب تیسری چیز "وَفِیْ ھٰذَا" کے لفظوں کو لیجیے۔ یہ الفاظ اُس وجہ اور اُس غایت کے چہرے سے پردہ ہٹاتے ہیں جس کی خاطر اس اُمّت کو یہ اونچا نام اور اونچا مقام عطا ہوا تھا۔ یہ بتاتے ہیں کہ اس اُمّت کو یہ نام اور یہ مقام عطا ہوا ہے تو یُوں ہی نہیں عطا ہوا ہے، بلکہ اُس "اجتبا،" (یعنی انتخاب) کی بنیاد پر عطا ہوا ہے جس کا ذکر ابھی گزرا، اور جو صرف اسی بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہ ایک بلند مرتبہ اُمّت ہے، بلکہ اس حقیقت کا بھی مظہر ہے کہ اس اُمّت کی منصبی ذمّہ داری بہت بڑی اور حد درجہ غیر معمولی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس اُمّت کو یہ نام صرف اس لیے عطا ہوا ہے کہ اُسے کام بھی اسی نام کے شایانِ شان انجام دینے تھے۔ سب سے آخر میں "لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ" کے لفظوں پر نظر ڈالیے۔ یہ الفاظ اس سوال کا جواب ہیں کہ اُمّتِ مسلمہ کا "اجتبا،" جس کام کے لیے ہوا ہے، متعیّن طور پر وہ کیا ہے، اور اسے ٹھیک طور پر کس شکل میں ادا کیا جانا چاہیے؟

غرض اس آیت میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کا نام اور مقام کیا ہے، وہیں اس پر

اور ساری دنیا پر یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ اسے اس نام اور مقام کے ملنے کی وجہ اور بنیاد اس کا وہ کام ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر وہ اس کام کو انجام دیتی ہے تو یقیناً "اُمّتِ مسلمہ" ہے اور اگر انجام نہیں دیتی تو چاہے عُرف میں اس کا یہی نام چلتا رہے، مگر حقیقت میں اس سے یہ نام چھن چکا ہوگا۔

جب "دینِ حق کی شہادت" ہی اس اُمّت کے وجود کی اصل غرض و غایت ہے، جیسا کہ اُوپر کی بحث سے پوری طرح آشکارا ہو چکا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کے سلسلے میں خُدا کے حضور جواب دہ بھی ہوگی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جہاں ایک ایک مسلمان کو اپنی انفرادی ذمّہ داریوں کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی، وہیں پوری اُمّت کو بھی ایک اُمّت کی حیثیت سے اجتماعی جواب دہی کرنی پڑے گی۔ یہ جواب دہی کوئی معمولی جواب دہی نہ ہوگی، بلکہ کچھ اسی طرح کی ہوگی جس طرح کی انبیاء علیہم السّلام کی، ان کی اپنی پیغمبرانہ حیثیتوں میں، ہوگی۔ کیوں کہ وہ اگرچہ اصطلاحی طور پر پیغمبر نہیں، مگر پیغمبری کا فریضہ ضرور رکھتی ہے۔ قیامت کے حساب کتاب کے بارے میں قرآن کہتا ہے:-

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ۔[1]

پس ہم ضرور پُوچھ گچھ کریں گے اُن لوگوں سے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے اور ان پیغمبروں سے بھی سوال کریں گے۔

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح عام لوگوں سے ان کے اپنے فرض کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے انبیاء کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا، اسی طرح خود انبیاء سے بھی پوچھا جائے گا کہ انھوں نے اللہ کا دین لوگوں تک کس طرح پہنچایا تھا اور اس کا انھیں کیا جواب ملا تھا؟ اُمّتِ مسلمہ ایک پیغمبر کی ذمّہ داریاں رکھتی ہے تو اِس اُصولی اعلان کا تقاضا ہے کہ وہ سوال اس سے بھی ہو جو پیغمبروں سے ہونے والا ہے، اور اس سے پوچھا جائے کہ ہمارے بندوں کے سامنے

---

[1] سورۂ اعراف - ٦

تو نے ہمارے دین کی شہادت کس طرح دی تھی، اور انھوں نے اس کا کیا جواب دیا تھا؟ غور کیجیے، اگر اپنے اس فرض کے ادا کرنے میں اُمّت نے کوتاہیاں کی ہوں گی تو کتنی سخت ہو گی اس کے لیے یہ گھڑی! اور کتنی مشکل ہوگی یہ جواب دہی! اور اگر خدانخواستہ، خدانخواستہ معاملہ اس سے بھی آگے کا نکلا، ظاہر یہ ہوا کہ نہ صرف اس شہادت کا حق نہیں ادا کیا گیا، بلکہ اسے چھپایا بھی گیا، تو پھر یہ جواب دہی صرف مشکل ہی نہ رہ جائے گی، بلکہ کچھ اور بن جائے گی۔ کیوں کہ یہ ایک انتہائی خطرناک جرم ہے، اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ خبردار کر چکا ہے کہ:-

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ۔[1]

اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس نے اللہ کی کسی شہادت کو، جو اس کے پاس تھی، چھپایا ہو۔

شہادتِ حق کیا ہے؟

دین کی یہ "شہادت" کیا چیز ہے؟ اس کا مفہوم اور اس کی عملی شکل کیا ہے؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے جو یہاں پہنچ کر لازمًا پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کر لینا خود اسلام کو سمجھنے کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اصولاً اور مجملاً اتنا تو معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح "اسلام" اور "دینِ حق" ایک متعیّن چیز ہے، اسی طرح اس دینِ حق کی "شہادت" کا مفہوم اور اس کی عملی شکل بھی متعیّن ہی ہے اور یہ تعیّن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ کرتا ہے۔ لیکن مناسب نہ ہوگا کہ اتنی مجمل بات کو اتنے اہم مسئلے کا کافی وشافی جواب سمجھ لیا جائے، اس لیے آئیے اس اجمال کی تفصیل معلوم کریں:-

"شہادت"، یا گواہی عرفِ عام میں اس بات کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی واقعہ یا کسی چیز کے بارے میں جو کچھ یقین کے ساتھ جانتا ہے دوسروں کو ٹھیک ٹھیک بتا دے۔ اس لیے "دینِ حق

---

[1] سورہ بقرہ - ۱۴

کی شہادت"، کا لغوی اور عرفی مفہوم یہ ہوگا کہ لوگوں کے سامنے اسلام کو، جیسا کچھ وہ ہے، پوری طرح واضح کر دیا جائے۔ رہا اس کا قرآنی اصطلاحی مفہوم، تو اگرچہ یہ مفہوم بھی بنیادی طور پر یہی ہے، مگر اس کا پورا تصور بڑی وسعت اور جامعیت رکھتا ہے جس کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوے کی روشنی میں یہ ہے :-

"شہادتِ حق" کے دو پہلو ہیں، قولی[1] اور عملی[2] :-

(۱) "قولی شہادت"، تو یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک کو غیر مسلموں کے سامنے موزوں ترین الفاظ اور عبارات میں پیش کیا جائے، یہاں تک کہ یہ دین ان کے لیے کھلی کتاب بن جائے اور ان کے لیے اپنے مسلک کی غلطی اور اسلام کی صداقت کا ادراک کر لینے میں کوئی معقول رکاوٹ باقی نہ رہ جائے۔

اس کام کو صحیح طریقے سے انجام دینے کے لیے چند باتیں ضروری ہیں :-

پہلی[1] بات تو یہ کہ اسلام کے بنیادی عقائد پر علم و عقل کی ایسی دلیلیں، اور فطرت و وجدان کی ایسی شہادتیں مہیّا کی جائیں جن سے ان کی سچّائی بالکل آشکارا ہو جائے۔ قرآنِ عزیز نے توحید، رسالت اور آخرت پر جس زور و قوت کے ساتھ، اور جس ہمہ گیر و موثر انداز میں دلائل پیش کیے ہیں، اس کا تتبع بہرحال ضروری ہے۔ اسی طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام نے جو احکام دیے ہیں، انھیں بھی تفصیل سے پیش کیا جائے، اور دلیل کے ساتھ بتایا جائے کہ وہ زندگی کے مسائل کس حُسن و خوبی سے حل کر دیتا ہے، اور اس کی پیروی کس طرح دنیوی زندگی کی بھی خوش گواریوں کی ضامن ہے۔

دوسری[2] بات یہ کہ غیرِ اسلام پر سنجیدہ اور مدلّل تنقید کی جائے۔ اس تنقید کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اُن افکار و نظریات سے گہری واقفیت حاصل کر لی جائے جن کی غیر مسلم دنیا پیروی کر رہی ہے، اور جو اس وقت کے مذہبوں، تہذیبوں، فلسفوں اور نظاموں کی بنیاد ہیں۔ اچھی طرح معلوم کر لیا جائے کہ وہ کون سی نام نہاد دلیلیں ہیں جن پر یہ نظریات قائم ہیں۔ اس کے بعد ان نظریات کی پوری قوّت سے تردید کی جائے، اور اس طرح کی جائے کہ ان کا غیر عقلی، غیر منطقی اور غیر فطری ہونا بالکل کھل جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان نظریات کے پیدا کیے ہوئے اُن عملی

نتائج کو بھی اُنگلی رکھ رکھ کر گنایا جائے جنھیں کسی طرح بھی انسانیت کے لیے خوش آئند نہیں کہا جا سکتا۔ غیر اسلام کی یہ مدلل تردید شہادتِ اسلام کی راہ کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔ اس کے بغیر یہ فریضہ صحیح طور سے ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ اسلام کی دعوت ایک نئی تعمیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب کوئی نئی عمارت بنانی ہو تو ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اس کے لیے بنیادیں کھودی جائیں۔ زمین کے اوپر ہی اوپر سے کوئی عمارت نہیں اُٹھا کرتی۔ ضروری حد تک بنیادیں کھُد جانے کے بعد ہی دیواروں کی چُنائی شروع کی جاتی ہے۔ اسی طرح جن دلوں اور دماغوں میں آپ اسلام کی جڑیں اُتارنی چاہتے ہیں، پہلے ان میں وہ جگہ پیدا کیجیے جہاں یہ جڑیں جاکر اُتر سکیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جگہ اسی وقت پیدا ہو سکے گی جب ان کے اندر سے اُن غلط افکار و نظریات کو کھود کر نکال دیا جائے جو پہلے سے نسلاً بعد نسلٍ، گہرے جمے چلے آرہے ہیں۔ آپ کسی برتن میں کوئی چیز اُسی وقت تو رکھ سکتے ہیں جب وہ خالی ہو۔ اسی طرح کسی کے دل و دماغ میں اسلام بھی اسی وقت گھر کر سکتا ہے جب وہاں کوئی اور "دین" یا کوئی اور "ازم" قابض نہ رہ گیا ہو۔ قرآن مجید نے اپنی دعوت کے سلسلے میں صرف اسی بات کو کافی نہیں سمجھ لیا تھا کہ توحید، رسالت اور آخرت پر دلیلیں دے دے، بلکہ یہ بھی ضروری سمجھا تھا کہ شرک، کفر اور الحاد کے فلسفوں، اور انکارِ رسالت و انکارِ آخرت کے نظریوں کی پوری شدّومد کے ساتھ تردید کر دے۔ چناں چہ کفر و انکار کی جو جو شکلیں تھیں، انھیں اس نے ایک ایک کر کے لیا جن جن راہوں سے یہ نظریات ذہنوں میں گھسے تھے، ان میں سے ایک ایک کو نگاہ میں رکھا۔ ان نظریات کے حق میں لوگوں کے پاس جو کچھ بھی دلیلیں تھیں، انھیں ایک ایک کر کے نوٹ کیا۔ اور پھر ان غلط افکار و نظریات پر گفتگو کی۔ اُن کی بے بضاعتی واضح کی اور انھیں ڈھا کر رکھ دیا۔ تب جاکر اللہ کے گھر میں رکھ دیے جانے والے تین سو ساٹھ بُت سجدے میں گرے۔ "قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ"[1] (راستی ضلالت سے ممیز ہو کر بالکل نمایاں ہو گئی) کی کیفیت پیدا ہوئی۔

تیسری بات یہ کہ اسلام کو حق، اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کا یہ کام دل نشین

---

[1] سورۂ بقرہ - ۲۵۶

اور جدید ترین انداز کا ہو۔ اس زبان میں ہو جس سے وقت کا انسان مانوس ہے، اس طرز کا ہو جو آج کے ذہنوں کو اپیل کرسکتا ہو، اس طریقے کا ہو جسے سائنس کا یہ دور بحث و استدلال کا طریقہ تسلیم کرتا ہو کیوں کہ اسلام کو حق، اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کی یہ کوشش محض ایک علمی مناظرے کی خاطر نہ ہوگی، بلکہ دینِ حق کی توضیح اور تبلیغ کی خاطر ہوگی۔ وہ توضیح، توضیح نہیں ہوتی جس کے بعد بھی مخاطَب بات کو نہ پا سکے اور وہ تبلیغ تبلیغ نہیں کہی جاسکتی جو اپنے پیغام کو دلوں اور دماغوں تک پہنچا نہ دے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنی بات کہتے وقت مخاطَب کا ذہن اور اس کا ذوق بھی لازماً سامنے رہے، اور بحث و استدلال کا انداز وہ ہو جسے وہ بحث و استدلال کا انداز سمجھتا ہو۔ قرآن مجید نے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے زبان، اندازِ بیان، اور طرزِ استدلال، سب کچھ وہی اختیار کیا، اور پورے اہتمام کے ساتھ اختیار کیا جس سے اہلِ عرب مانوس تھے۔ ایک طرف تو اس نے جو کچھ کہا "عربی مبین" میں کہا، (بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ)[1] بہترین اسلوب میں اور وقت کی معیاری اور واضح زبان میں کہا۔ تاکہ بات سمجھنے میں عبارت اور طرزِ بیان کی کوئی ناموزونیت، واقعی رکاوٹ نہ بن سکے۔ اپنے کلام میں فواصلِ آیات کی، چھوٹے چھوٹے جملوں کی، بجلی کی کڑک جیسی خطابت کی پوری پوری رعایت رکھی۔ کیوں کہ عرب ایسی چیزوں کے بڑے گرویدہ تھے۔ دوسری طرف اس نے استدلال کے لیے عقل کے مسلّمات، فطرت کے اشارات اور آفاق وانفس کے مشاہدات سے کام لیا۔ کیونکہ یہ طرزِ استدلال بجائے خود تو صحیح، مفید اور کارگر تھا ہی، اس کے ساتھ ساتھ عربی ذہن کو اس سے ایک خاص مناسبت بھی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حق کی دعوت دینے کے بارے میں ہدایت کی تھی کہ "دنیا کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور ضرورت کے وقت بہترین انداز سے بحث مباحثہ کرو۔" (اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ)[2] یہ تینوں باتیں جو دعوت کے کام کی صحیح صحیح

---

[1] سورۂ شعراء - ۱۹۵ [2] سورۂ نحل - ۱۲۸

انجام دہی کے لیے ضروری بتائی گئی ہیں، دراصل اِسی اُصولی ہدایت قرآنی کی شرح و تفصیل تھیں۔
چوتھی بات یہ کہ اِس تبلیغ دعوت کے پیچھے کوئی قومی احساسِ فخر، کسی طرح کی انا، کوئی غیر دینی محرک، غرض کوئی بھی غلط جذبہ بالکل نہ کام کر رہا ہو، بلکہ زبان و قلب سے جو کچھ نکلے اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ نکلے۔ محض اپنے فرض کے احساس اور بنی آدم کی محبّت اور خیر خواہی کی بنا پر نکلے۔ اِس حال میں نکلے کہ بندگانِ خدا کی گمراہیوں پر اندر سے دل کُڑھ رہا ہو، اور انھیں ایسا محسوس ہو رہا ہو، یا ہوسکتا ہو، کہ یہ اسلام کا داعی ہم سے کچھ لے نہیں رہا ہے، بلکہ ہمیں کچھ دے رہا ہے، اور ایک بڑی نعمت دے رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے اندر لوگوں کے ایمان لانے کے بارے میں جو اخلاص بھری تمنّا اور گُھلا دینے والی بے قراری تھی، اس کا ذکر اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں کرتا ہے " اے نبی! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو تم ان کے پیچھے اپنے آپ کو مارے غم کے ہلاک کر لوگے"۔ (فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰىٓ اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا)[1]

(۲) "عملی شہادت" یہ ہے کہ اسلام کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جائے، وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں بھی دیکھی جا سکے۔ اُمّت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں، اور پوری اُمّت اپنی اجتماعی حیثیت میں، سب کے سب اسلام کے عملی ترجمان ہوں۔ انھیں توحید، آخرت اور رسالت وغیرہ عقائد پر گہرا یقین ہو، اور یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ اُن کے اخلاق وہ ہوں جن کی اسلام نے تلقین کی ہے۔ اُن کے معاملات اُن ہی خطوط پر انجام پائیں جو کتاب و سنّت نے کھینچ رکھے ہیں۔ اُن کی معاشرت، اُن کی معیشت اور اُن کی سیاست، غرض ان کی زندگی کا پورا نظام، اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ، اسی نقشے کے مطابق تعمیر ہو جو اللہ اور رسول نے بنا کر دے دیا ہے۔ تاکہ دنیا اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لے کہ اسلام کسے کہتے ہیں؟ وہ کس قسم کے افراد، کس قسم کا معاشرہ اور کس قسم کی اسٹیٹ وجود میں لاتا ہے؟
"عملی شہادت" کا مرتبہ "قولی شہادت" سے مقدم تر بھی ہے اور اہم تر بھی۔ ایک تو

---

[1] سورہ کہف - ۶

اِس لیے کہ جب تک کوئی شخص یا گروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے ۔ نہ صرف یہ کہ اس دعوت کا دینا اسے زیب نہیں دیتا، بلکہ نتیجہ کے اعتبار سے بھی یہ ایک ایسی کوشش ہوگی جس کا شاید ہی کسی پر کوئی اثر پڑ سکے ۔ دوسرے اس لیے کہ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت، شاید سنّویں ننانوے سے بھی زیادہ بڑی اکثریت، اصلاً "عملی دلائل" ہی کی زبان سمجھتی ہے، عقلی دلائل تک اس کی رسائی بہت کم ہو پاتی ہے ۔

اِس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوے کے متعلق کچھ وضاحت کرنا بالکل غیر ضروری ہوگا ۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ آپؐ نے جب لوگوں کو ایمان کی دعوت دی تو اِس حال میں دی کہ پہلے خود ایمان ویقین کا پیکر بن چکے تھے، اور دوسروں کو جب اللہ کا کوئی حکم سُنایا تو اس طرح سُنایا کہ سرِ مبارک اس کے آگے پہلے خود جُھک چکا ہوتا تھا ۔

یہ ہے 'اسلام کی شہادت' کا پورا مفہوم اور معیاری طریقہ ۔ اُمّتِ مسلمہ کی عملی کوششیں اِس معیار کے جس حد تک قریب پہنچیں گی اُسی حد تک وہ اپنے فرض میں کامیاب اور اپنے مقصد میں بامُراد ثابت ہوگی، اور جس حد تک یہ کوششیں اس معیار سے دور ہوں گی اُسی حد تک وہ ناکام و نامُراد رہے گی ۔

رکاوٹیں اور اُن کے تقاضے

یہ دنیا خیر اور شر، دونوں کا مسکن ہے ۔ یہاں بھلائی کی بھی طاقتیں موجود ہیں اور بُرائی کی بھی، اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری آزادی ملی ہوئی ہے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں، اور ایک دوسرے کو زیر کر لینے کے لیے برابر زور لگاتی رہتی ہیں ۔ اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے، اور نہ صرف یہ کہ اس کے "شاہدوں" کی شہادت قبول نہ کی جائے بلکہ سرے سے اس شہادت ہی کو برداشت نہ کیا جائے، جیسا کہ ہر دعوت کی تاریخ خبر دیتی ہے اور آئے دن کا مشاہدہ بتاتا ہے ۔ اس لیے قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان متوقع رکاوٹوں کے بارے میں "اُمّتِ مسلمہ" کا

رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ اسلام اس سوال کے جواب میں یہ ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی اور کیسی ہی ہو، اُسے دور کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ مسلسل کی جائے اور آخری حد تک کی جائے۔ اس کوشش کو شریعت نے "جہاد فی سبیل اللہ" (اللہ کی راہ میں جہاد) کا نام دیا ہے۔ "جہاد" کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر ڈالی جائیں اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری طاقت نچوڑ دی جائے۔ اس لیے "راہِ خدا میں جہاد کرنے" کا مفہوم یہ ہے کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر، اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کر دینے کے لیے صحیح طور پر وہ سب کچھ کر ڈالا جائے جو بس میں ہو۔

ظاہر بات ہے کہ کسی مقصد کی خاطر جو جدّوجہد کی جاتی ہے، اس کا حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جیسے حالات ہوتے ہیں، ان ہی کی مناسبت سے جدّوجہد کی شکلیں بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ موقع پرستی نہیں ہے، بلکہ عین اصول پسندی ہے۔ کیوں کہ کوئی جدوجہد، محض جدّوجہد کی خاطر نہیں ہوتی، بلکہ کسی مقصد کی خاطر ہوتی ہے، اور کسی مقصد کی واقعی خدمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے لیے جدّوجہد کا طریقہ وقت اور ماحول کو سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہو ورنہ جدوجہد میں تو سب کچھ لگا دیا جائے گا، مگر اس کا حاصل شاید ہی کچھ نکل سکے گا۔ اور یہ کوئی دانش مندی کی بات نہ ہوگی۔ اور جو بات دانش مندی کی نہیں ہوتی وہ اصول پسندی کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے "جہاد فی سبیل اللہ" کی شکل کب کیا ہو، اس کا تعیّن حالات ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے اُصولی طور پر، مختلف حالات کے لیے، اس کی جو مختلف شکلیں اور قسمیں مقرر کر دی ہیں وہ تین ہیں:-

(۱) داخلی جہاد (۲) دعوتی اور فکری جہاد (۳) مسلّح جہاد

کس طرح کے حالات میں ان میں سے 'جہاد' کی کون سی قسم اختیار کی جانی چاہیے، اور اس کا عملی طریقہ کیا ہوگا؟ اس کی وضاحت کتاب وسنّت کی روشنی میں یہ ہے:-

۱۔ داخلی جہاد

'داخلی جہاد' کا مطلب یہ ہے کہ خود اسلامی معاشرے کے اندر جو بُرائیاں سر اُٹھاتی نظر آئیں ان کے خلاف 'جنگ' کی جائے اور انھیں کچل کر رکھ دیا جائے۔ کیوں کہ یہ اندر کی بُرائیاں

شہادتِ اسلام کی راہ کی بڑی خطرناک، بلکہ سب سے خطرناک رکاوٹ ہوتی ہیں۔ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنیے :۔

مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِیْ اُمَّةٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَهُ فِیْ اُمَّتِهٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَّاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَالَا یُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِیَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ۔[1]

مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی مبعوث کیا تھا اس کو اپنی اُمت میں سے ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اُس کے طریقے کو مضبوطی سے اختیار کیے رہتے، اور اس کی ہدایتوں کا اتباع کرتے رہتے۔ پھر ان کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف آتے جن کا حال یہ ہوتا کہ کہتے وہ جس پر عمل نہ کرتے اور کرتے وہ جس کی انھیں ہدایت نہ ہوتی۔ پس جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے، اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے۔ اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ یہ ارشاد صرف ایک خبر کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ایک ہدایت اور حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا مقصد دراصل اُمتِ مسلمہ کو یہ بتانا ہے کہ آئندہ چل کر اسے بھی ایسے ہی حالات پیش آنے والے ہیں، اور جب یہ حالات پیش آجائیں تو اسے کیا کچھ کرنا ہوگا۔

---

[1] مسلم، جلد اول، باب کون النہی عن المنکر من الایمان۔

اِس حدیث سے دونوں باتیں واضح ہوجاتی ہیں :-

(۱) ایک تو یہ کہ مسلم معاشرے کے اندر جو بُرائی اور گُم رہی بھی پیدا ہو، اسے ختم کردینے کی کوشِشش "جہاد" ہے۔

(۲) دُوسری یہ کہ اس کوشِش یا "جہاد" کی عملی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں، جن کے ایمانی مرتبے بھی مختلف ہوں گے :-

سبؔ سے افضل صورت تو یہ ہے کہ اس بُرائی یا گُم رہی کے خلاف مناسب انداز میں قوت کا استعمال کیا جائے، اور اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

لیکنؔ اگر کوئی فی الواقع ایسی پوزیشن رکھتا ہی نہ ہو یا اس کے اندر اتنی جرأت نہ ہو کہ کسی معنی اور کسی شکل میں بھی ہاتھ کی قوت استعمال کرسکے، تو پھر زبان کی قوت سے کام لے۔ بُرائی کو کھُلّم کھُلّا بُرائی کہے، ملامت کرے، سمجھائے، آخرت یاد دلائے، اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے ڈرائے۔ اور جب اِن باتوں سے کام نہ چلے تو موقع و محل کے مطابق زجر و تنبیہ بھی کرے۔

اورؔ اگر اتنی ہمّت بھی نہ ہو تو ایسا تو لازماً کرے کہ اس بُرائی کے خلاف اس کا دل بےچینی سے بھر جائے۔ آنکھوں میں وہ کانٹا بن کر چُبھتی رہے۔ آرزو کرے کہ یہ بُرائی جلد سے جلد مٹ جائے، دعائیں کرے کہ خدایا! اپنے اس خاطی بندے کو شیطان کے حملے سے بچالے، اس کے ضمیر کو زندہ اور اس کے ایمان کو بےدار کردے۔ تاکہ اس برائی سے اسے نفرت ہوجائے، اور اس نجاست سے وہ اپنے کو پاک کرلے۔

مسلم معاشرے کو برائیوں سے پاک کرتے رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں، اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں کی ہر "شکل" جہاد ہے۔ کیوں کہ ہر شکل حق کے قائم رہنے اور دین کی شہادت کے انجام پاتے رہنے کی کسی نہ کسی درجے کی کوشِش ہی ہوتی ہے۔ اور حق کی خاطر کوشش کرنے ہی کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

برائیوں کو مٹانے کی جن کوششوں کو اس حدیث میں "جہاد" سے تعبیر کیا گیا ہے، ٹھیک ان ہی کوشِشوں کو بعض حدیثوں میں "تغییر منکر" (بُرائیوں کو بدل دینا) بھی کہا گیا

ہے۔ مثلاً :-

مَنْ رَأَىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ[۱]

تم میں سے جس کسی کو کوئی بُرائی نظر آئے تو چاہیے کہ اُسے اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اور اگر ہاتھ سے ایسا نہ کر سکتا ہو تو اپنی زبان سے یہ فریضہ انجام دے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو یہ کام اپنے دل سے کرے۔ اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہوگا۔

پھر ان ہی کوششوں کو "نہی عن المنکر" (بُرائیوں سے روکنا) بھی کہا گیا ہے، مثلاً :-

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ[۲]

بھلائی کی تلقین کرو اور بُرائی سے روکو۔

اِئْتَمِرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ[۳]

نیکی کی ایک دوسرے کو تلقین کرو اور بُرائی سے ایک دوسرے کو روکو۔

ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ مسلم معاشرے کے بُرے افراد سے "جہاد" کرنا ان کی "بُرائیوں کو بدل ڈالنا" اور انھیں "بُرائیوں سے روکنا" یہ سب دراصل ایک ہی مدعا کے بیان کرنے والے مختلف الفاظ ہیں، اور ہم ان میں سے جس لفظ یا اصطلاح کو بھی لیں، منشاء ومفہوم میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

پھر ایک بات ان حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوئی کہ یہ 'جہاد' اُمّت کا عام اور ہمہ گیر اور دائمی فریضہ ہے۔ اس فریضے سے نہ تو افراد بری الذمہ ہیں، نہ اجتماع اور اسٹیٹ۔ بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عظیم ذمہ داری میں سب شریک ہیں۔ مزید دلیل اور وضاحت کی ضرورت

---

[۱] مسلم، جلد اوّل، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان۔ [۲] سورۂ لقمان۔ ۱۷

[۳] ابوداؤد، جلد دوم، باب فی الامر والنہی۔

ہوتو قرآن مجید کے یہ ارشادات بھی سُنیے ۔ افراد کے بارے میں وہ کہتا ہے :-

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ [1]

مومن مرد اور مومن عورتیں، ایک دوسرے کی رفیق ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے اور بُرائی سے روکتے ہیں۔

اِس ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ بھلائی (معروف) کا حکم دینا اور بُرائی (منکر) سے لوگوں کو باز رکھنا، مسلمان کی کبھی نہ الگ ہونے والی صفت ہے۔ یہ ایمان کی فطرت ہے۔ یہ اسلام کا مزاج ہے۔ جہاں مسلمان ہوگا یہ کام بھی وہاں ضرور کیا جا رہا ہوگا، اور جو مسلمان ہوگا، وہ یہ کام ضرور کرے گا۔

اسلامی اسٹیٹ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ [2]

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخش دیں تو نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم کریں گے اور بُرائی سے روکیں گے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ مسلمان جس طرح اپنی عام اور انفرادی حیثیت میں بُرائی کو پنپتے دیکھنا گوارا نہیں کرسکتا، اسی طرح صاحبِ اقتدار ہوکر بھی وہ ایسا ہی کرے گا، اور منکرات کو مٹانا اس کے اقتدار کے بنیادی مقاصد اور فرائض میں شامل ہوگا۔

۲۔ دعوتی اور فکری جہاد

"دعوتی اور فکری جہاد"، کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم حلقوں کی طرف سے اسلام کے خلاف جن شبہات کو پیش کیا جائے، جو اعتراضات اُٹھائے جائیں، جو دلیلیں دی جائیں، ان کا مناسب

---

[1] سورۂ توبہ - ۷۱ [2] سورۂ الحج - ۴۱

جواب دیا جائے، اور کوئی شبہ یا اعتراض یا دلیل ایسی نہ رہنے دی جائے جو اسلام کے چہرے کا باریک سا حجاب بھی بنا لی جا سکتی ہو۔ مکّی دور سرتا سر اسی جہاد کا دَور تھا، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو حکم دے رکھا تھا کہ :۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔[۱]

پس تم اِن منکرینِ اسلام کی بات نہ مانو، اور قرآن کے ذریعہ ان سے پُورا پُورا جہاد کرتے رہو۔

"قرآن کے ذریعہ جہاد کرنے" کا مطلب یہ ہے، اور یہی ہو سکتا ہے، کہ منکرینِ اسلام کے سامنے ان قرآنی دلیلوں کو برابر پیش کرتے رہو جو اسلام کی سچّائی کو اور ان کے وجوہِ انکار کی بے وقعتی کو کھول کر رکھ دیتی ہیں، اور اس طرزِ استدلال سے اُن کے موقف کی کمزوری برابر واضح کرتے رہو جو قرآن نے تمہیں سکھایا ہے۔ یہ کام پورے زور کے ساتھ انجام دیتے رہو، یہاں تک کہ ان کے پاس اپنے انکار کے حق میں کہنے کے لیے کوئی نام کی بھی معقول بات نہ رہ جائے، اور ہر طرف سے گھِر کر رہ جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی اس کام کو 'زبان' کا جہاد، ہی فرمایا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے :۔

جَاهِدُوا الْمُشْرِكِيْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ۔[۲]

مشرکوں سے اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ذریعہ جہاد کرو۔

"دعوتی اور فکری جہاد" دراصل عقل و استدلال کے اسلحوں سے لڑنے کا نام ہے۔ یہ لڑائی اس وقت تک لڑی جانی چاہیے جب تک کہ اسلام کی مخالفت کے سارے فکری اور استدلالی قلعے مسمار نہ ہو جائیں، چاہے وہ الٰہیات سے تعلق رکھتے ہوں، چاہے طبعیات سے، تہذیب و تمدّن کے میدان کے ہوں یا معاشیات و سیاسیات کے، سائنس سے حاصل کیے ہوئے ہوں یا فلسفے سے۔ قرآن مجید نے عربوں کی ایک ایک دلیل اور ان کے اٹھائے ہوئے

---

[۱] سُورہ الفرقان ۔ ۵۲ [۲] ابوداؤد، جلد اوّل، باب کراہیۃ ترک الغزو۔

ایک ایک اعتراض کے جس طرح پرخچے اُڑاتے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کا حال معلوم کرلینے کے لیے اللہ تعالیٰ کے اِس وعدے کے لفظوں کو سُن لینا کافی ہوگا جس کا اس نے اس سلسلے میں اعلان فرما رکھا تھا :۔

وَلَا یَاْتُوْنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰکَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا۔[1]

اے نبیؐ! یہ لوگ تمہارے سامنے جو انوکھے سے انوکھا اعتراض بھی لے آئیں گے ہم اس کے جواب میں تمہیں ٹھیک بات اور بہترین وضاحت والی دلیل بتا دیا کریں گے۔

یہ فکری اور استدلالی لڑائی جس انداز سے لڑی جانی چاہیے اس کے لیے قرآنِ حکیم نے یہ اصولی ہدایت دی ہے کہ "بحث و مباحثے کا وہ طریقہ اختیار کرو جو سب سے اچھا طریقہ ہو۔" (وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ)[2] کسی طریقے کی اچھائی اور بُرائی کا فیصلہ یہ بات کرتی ہے کہ جس مقصد کی خاطر اسے اختیار کیا گیا ہے صحیح طور پر وہ اس سے کس حد تک حاصل ہو سکا۔ اس لیے اسلام کی خاطر بحث و مباحثے کا صحیح اور قرآنی طریقہ وہی ہو سکتا ہے جو مخاطب کو اس کے قریب لائے، اس کے دماغ کو اس کی صداقت کا معترف بنائے، اور اس کے دل کے دروازے اس کے لیے کھول سکے۔ اور ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اسلام کے حق میں بولے جانے والے الفاظ ایک طرف تو عقل کو اپیل کرنے والے ہوں، دوسری طرف وہ مخاطب کے ذہن اور اس کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر کہے گئے ہوں، تیسری طرف ان میں دِل کا خلوص اور لہجہ کا سوز بھرا ہو۔

اس "فکری اور استدلالی لڑائی" کے علاوہ "دعوتی اور فکری جہاد" کا ایک ضمنی پہلو بھی ہے۔ جو اگرچہ ہے ضمنی، مگر عملاً اس کی بڑی بھاری اہمیت ہے، اور اس کے بغیر یہ "جہاد" کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ پہلو صبر اور استقلال کا پہلو ہے۔ اس حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ

---

[1] سورہ الفرقان۔ ۳۳ [2] سورہ نحل۔ ۱۲۵

دعوتِ اسلام کی شرافت کا جواب عموماً شرافت سے نہیں ملا کرتا۔ جس باطل کے علم برداروں کے سامنے آپ دینِ حق کو پیش کریں گے وہ اتنے عالی ظرف اور اتنے حق پسند بہت کم نکلیں گے کہ آپ کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے اور سنجیدگی کے ساتھ سُن لیں۔ اور پھر انھیں مان لیں یا بات کا جواب بات سے، اور دلیل کا جواب دلیل سے دے کر خاموش ہو جائیں۔ اس کے بخلاف اکثر یہی ہوگا کہ ان پر ایک بحرانی کیفیت طاری ہو جائے گی، اور غلط قسم کی حمیت ان کے ذہنی توازن کو درہم برہم کر کے رکھ دے گی۔ جس کے نتیجے میں وہ سنجیدہ گفتگوؤں اور معقول دلیلوں کے جواب میں سخت کلامیوں، دل آزاریوں اور ایذا رسانیوں تک پر اُتر آئیں گے۔ صحابۂ کرامؓ سے زیادہ دل سوزی اور خیر خواہی میں ڈوبا ہوا اور دل نشین اور مدلّل طریقِ دعوت اور کون اختیار کر سکتا ہے، مگر انھیں بھی نہ صرف یہ کہ اس صورتِ حال سے دو چار ہونا پڑا، بلکہ ناقابلِ بیان حد تک دو چار ہونا پڑا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں پہلے ہی سے جن لفظوں میں خبردار کر دیا تھا انھیں ذرا غور سے پڑھیے:۔

..... وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ[1]

.... اور تمھیں ان لوگوں کی طرف سے بھی جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، اور مشرکوں کی طرف سے بھی، بہت سی تکلیف دہ باتیں سُننی پڑیں گی۔ اگر ایسے وقت تم نے صبر سے کام لیا اور تقویٰ کی روش پر جمے رہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑی عزیمت کی بات ہوگی۔

معلوم ہوا کہ اسلام کی اس "قولی شہادت" کا بجائے خود مصائب کی بدلیاں بن جانا یقینی ہے، اور یہ بدلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر برستی ہیں، ایسا ہو کر رہتا ہے کہ خیر خواہی کا جواب جاہلی حمیت سے، میٹھے بول کا جواب گالیوں سے، اور دلیلوں کا جواب پتھروں سے دیا جائے،

---

[1] سورۂ آلِ عمران - ۱۸۶

مطالبہ کیا جائے، بلکہ حکم دیا جائے کہ زبانیں بند کرلو۔ لیکن "شہادتِ حق" کا تقاضا یہ ہے کہ اِن مطالبوں اور حکموں کو ٹھکرا دیا جائے، اور ساری مخالفتوں کے باوجود اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کی دعوت مسلسل دی جاتی رہے، بلاکسی خوف ملامت کے دی جاتی رہے، اور حالات کا دباؤ چاہے کیسا ہی سخت ہو کسی مصالحت کا خیال تک ذہن میں نہ لایا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ایسی ہی صورتِ حال کے لیے دی گئی تھی کہ:۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ [1]

جس کام کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اسے واشگاف طور سے انجام دو، اور جاہلوں کی پروا نہ کرو۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ دعوتی سرگرمیوں پر "جہاد" کا صحیح معنوں میں اطلاق ہوتا ہی اُسی وقت ہے جب وہ مخالفتوں کے طوفان میں انجام دی جائیں۔

۳۔ مسلّح جہاد

"مسلّح جہاد" کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی راہ روکنے والوں کے خلاف مسلّح جنگ کی جائے، اور اس وقت تک کی جائے جب تک کہ وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہیں جاتے۔ یہ جہاد کی آخری شکل ہے، اور اس کا دوسرا اور مخصوص نام "قتال" ہے۔ عملی طور پر یہ جہاد کی سب سے مشکل اور صبر آزما قسم ہے۔ لیکن دین کی بقا کے لیے اس کی بھی ضرورت آپڑا کرتی ہے، جیسا کہ اُسی وقت واضح کر دیا گیا تھا جس وقت کہ اس مسلّح جہاد کا سب سے پہلا حکم دیا گیا تھا:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ الخ [2]

ایمان والو! تم پر لڑائی فرض کردی گئی ہے اگرچہ وہ تم کو ناگوار محسوس ہو رہی ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار محسوس کرو اور (فی الواقع) وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔

---

[1] سورۃ الحجر۔ ۹۴ [2] سورۃ البقرۃ۔ ۲۱۶

یہ قتال اور مسلح جہاد، اسلام اور اہل اسلام کے حق میں 'بہتر' اور باعث خیر کس طرح ہے؟ اس کی وضاحت ان دوسری آیتوں میں ملے گی جن میں قتال کی غایت بتائی گئی ہے، مثلاً :-

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ ۔[1]

اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ "فتنہ" باقی نہ رہ جائے، اور "دین" (اطاعت) اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے۔

ان الفاظِ خداوندی سے صاف اور متعین طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ حق کے دشمنوں سے لڑنے کا حکم ایک بہت بڑی ضرورت کے تحت دیا گیا ہے۔ اور وہ ضرورت یہ ہے کہ اللہ کا نام لینے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی راہ صاف ہو جائے، اور "فتنے" کی حالت ختم ہو جائے۔ "فتنہ"، قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کو دین کی پیروی کا حق نہ دیا جائے، اور انھیں اپنے معبودِ حقیقی کی بندگی سے زبردستی روکا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا ظلم ہے جس سے بڑا اور کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ قتل و خون کی چنگیزیت بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ اگر کسی کی جان لے لی گئی تو اس کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اسے دنیا کی چند روزہ بہار سے محروم کر دیا گیا، لیکن اگر کسی سے اس کی "خدا پرستی" لے لی گئی اور اپنے رب کا بندہ بننے سے اسے جبراً روک دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اصل زندگی تباہ کر دی گئی اور اسے آخرت کی ابدی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا۔ بلاشبہ دونوں ہی چیزیں ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن جب ان دونوں ناپسندیدہ چیزوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑ جائے تو ایک احمق بھی پہلی کے مقابلے میں دوسری کا انتخاب نہ کرے گا۔ اس لیے قرآن مجید جب یہ کہتا ہے کہ :-

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۔[2]

فتنہ قتل سے بھی زیادہ بری چیز ہے۔

---

[1] سورۃ البقرۃ - ۱۹۳

[2] سورۃ البقرہ - ۱۹۱

تو ایک ایسی بات فرماتا ہے جس کی صداقت میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ اور اگر اس بات میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر اگر حق کے راستے کی جبری رکاوٹیں دُور کردی جائیں تو اس کے بہتر ہونے میں دو رائیں ہوسکیں۔

ایک اور آیت سُنیے، جس نے مسلّح جہاد کی ضرورت پر منفی پہلو سے روشنی ڈالی ہے:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا وَّلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ [1]

اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعضوں کے ذریعہ دفع نہ کیا کرتا تو ڈھا دیے جاتے صومعے، اور گرجے، اور کنیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ اور اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔

اِس آیت سے اور زیادہ واضح ہوگیا کہ اگر دین کی خاطر کبھی تلوار نہ اُٹھائی جائے اور "فتنے"، کی جڑ نہ کاٹ دی جائے تو خود دین کی جڑ کٹ رہے گی، فتنہ پسند عناصر خدا کا نام لینا دُوبھر کردیں گے، اور خُدا پرستی کے ایک ایک نشان کو مٹا کر دم لیں گے۔ اس لیے دین کی بقا اور ترقی کے لیے مسلّح جہاد بھی ایک ناگزیر ضرورت بن جایا کرتا ہے۔

مسلّح جہاد کی قسمیں

جہاں تک اُن رکاوٹوں کا تعلق ہے جنھیں دُور کرنے کے لیے مسلّح جہاد کا حکم دیا گیا ہے، واضح بات ہے کہ وہ سب ایک ہی نوعیت کی نہیں ہوسکتیں۔ اِس لیے ان کے خلاف کیے جانے والے جہاد کی نوعیت بھی ہمیشہ ایک ہی سی نہیں ہوسکتی، بلکہ اس میں بھی فرق ہوگا۔ جائزہ بتاتا ہے کہ یہ رکاوٹیں اصولی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں:۔

ایک رکاوٹ تو وہ ہوتی جو اسلام کے ماننے والوں کی نسبت سے پیش آتی ہے یعنی

---

[1] سورۃ الحج ـ ۴۰

یہ کہ جو لوگ مسلمان ہوں انھیں مسلم ہونے کے جُرم میں ستایا جائے اور مطالبہ کیا جائے کہ اسلام سے باز آجاؤ، اور اس غرض سے ان کے خلاف طاقت بھی استعمال کی جائے۔

دوسری[2] رکاوٹ وہ ہوتی ہے جو غیر مسلم حلقوں کی نسبت سے پیش آتی ہے۔ یعنی یہ کہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کو پیش ہی نہ کرنے دیا جائے، یا ان کے اوپر ایک ایسا اجتماعی نظام مسلط رکھا جائے جس کے ہوتے ہوئے انھیں اسلام کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔

اور جب رکاوٹیں دو قسم کی ہوتی ہیں تو ان کی مناسبت سے وہ جہاد بھی دو الگ الگ نوعیتوں کا ہوگا جو ان کے ہٹانے کے لیے کیا جانا چاہیے۔

(۱) جہاں تک پہلی قسم کی رکاوٹ کا تعلق ہے، وہ زیادہ سخت اور زیادہ ناگوار ہی نہیں، بلکہ انتہائی جارحانہ بھی ہوتی ہے۔ اور اس کے خلاف جو جنگی قدم اُٹھایا جائے گا اس کی نوعیت واضح طور پر مدافعت کی ہوگی۔ اس بنا پر اسے دفاعی جہاد کہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سب سے پہلے اسی جہاد کا حکم دیا تھا۔ کیوں کہ وہ رکاوٹ جس کو ہٹانے کے لیے یہ جہاد کیا جاتا ہے عملاً پہلے پیش آئی تھی، جیسا کہ فطری طور پر عموماً پہلے پیش آیا ہی کرتی ہے۔ اس حکم جہاد کے الفاظ یہ تھے :-

> اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُنِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ[1]

> ان لوگوں کو (مقابلے کی) اجازت دے دی گئی جن سے جنگ کی جا رہی ہے، کیوں کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، اور یقیناً اللہ ان کی مدد کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جنھیں صرف یہ کہنے پر کہ ہمارا رب اللہ ہے، ان کے اپنے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا ہے۔

---

[1] سورہ الحج - ۴۰

یہ آیت مدینہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی۔ اس میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ مسلمانوں کو قریشِ مکّہ کے مقابلے میں تلواریں اُٹھانے کی جو اجازت دی گئی ہے وہ ان کی مظلومیت کی وجہ سے دی گئی ہے، اور اس لیے دی گئی ہے کہ خود ان پر حملہ کیا گیا ہے۔ یہی بات مختلف انداز میں فرمائی جاتی رہی جب تک کہ قریش کی یہ حملہ آورانہ حیثیت برقرار اور جنگ کی یہ حالت قائم رہی۔ بنا بریں اس وقت تک کے سارے مسلح جہاد صرف دفاعی نوعیت کے تھے۔

(۳) رہی دوسری قسم کی رکاوٹ، تو اس کے خلاف کیے جانے والے جہاد سے پہلے خود اس کی اپنی نوعیت کو ذرا تفصیل سے سمجھ لینا چاہیے۔ "اسلام" کی حیثیت اور "اُمّتِ مسلمہ" کا فریضۂ حیات، یہ دونوں چیزیں پچھلے صفحات میں آپ کے سامنے تفصیل سے آچکی ہیں۔ اسلام ساری دنیا کے لیے آیا ہے۔ وہی حق اور وہی شرطِ نجات ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ یا تو باطل ہے یا اللہ کے نزدیک اب نامقبول ہے۔ اُمّتِ مسلمہ اس بات کی ذمّے دار ہے کہ اسلام کی اس حیثیت کے تقاضے پورے کرے۔ اسے ساری دنیا تک پہنچائے۔ اس کے حق ہونے کی شہادت دے اور ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کرے کہ خدا کے بندے فی الواقع اس کے بندے اور فرماں بردار بن جائیں، اور اس کے بھیجے ہوئے اس دینِ حق سے دُور رہ کر اپنی دُنیا پریشان اور اپنی آخرت تباہ نہ کرتے رہیں۔ ان دونوں باتوں کا یہ کھُلا ہوا تقاضا ہے کہ اُمّتِ مسلمہ اپنے دائرے میں سمٹی نہ رہے، بلکہ آگے بڑھے۔ اللہ کے دین کو لے کر دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچے، اور اپنی اِس راہ میں کسی کو مزاحم نہ ہونے دے۔ جن لوگوں کے سینے اس دعوت کے لیے نہ کھُل سکیں انھیں اسلام لانے کے لیے مجبور تو ہرگز نہ کرے۔ کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ لیکن انھیں اس بات کی اجازت بھی نہ دے کہ وہ دوسروں کے دِلوں اور دماغوں پر پہرے دار بن کر بیٹھ جائیں، یا ایسی فضا بنائے رکھیں جو اسلام سے لوگوں کو واقف ہی نہ ہونے دے۔ ہر صاحبِ نظر محسوس کرے گا کہ اسلام کو ایسا کھُلا ہوا ماحول اُس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک کہ زندگی کا اجتماعی نظام باطل کے ہاتھوں سے نکل کر خود اس کے اپنے ہاتھوں میں نہ آجائے۔ کیوں کہ انسانی معاشرے پر جو نظام مسلّط ہوتا ہے

وہ لوگوں کے ذہنوں کو بھی اپنے تصورات کی گرفت میں لیے رہتا ہے، یا کم از کم یہ کہ لیے رہنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اور ان کے لیے کسی دُوسرے نظامِ فکر و عمل کی طرف متوجہ ہونے کا کوئی موقع باقی نہیں رہنے دینا چاہتا۔ اس لیے جب تک کوئی غیر اسلامی نظام کسی معاشرے پر چھایا رہے گا عملی اور نفسیاتی طور پر، اسلام کے لیے عام ذہنوں کے دریچے بند ہی رہیں گے۔ اور یہ ایک ایسی شکل ہے جسے اسلام کی راہ کی رکاوٹ ہی کہا جائے گا۔ کم از کم اسلام تو یہی کہتا اور یہی سمجھتا ہے۔ اور جو شخص بھی اس کی مذکورہ بالا حیثیت کو سامنے رکھ کر غور کرے گا وہ ضرور ہی یہ تسلیم کرے گا کہ یقیناً اسلام کو اپنی حد تک ایسا ہی کہنا اور ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔
اب اگر ہر غیر اسلامی نظامِ سیاسی اسلام کی راہ کی رکاوٹ ہے تو اس کا فطری تقاضا ہے کہ اسلام دنیا میں کہیں بھی کسی غیر اسلامی نظامِ سیاسی کو نافذ و متسلط رہنے کا حق دار تسلیم نہ کرے اور چاہے کہ اقتدار صرف اس کے ہاتھ میں ــ مسلمانوں کے نہیں، بلکہ اسلام کے ہاتھ میں ــ رہے، اور جہاں بھی اس کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے وہاں اسے تسلیم کرا کے رہا جائے۔ چناں چہ قرآن مجید نے جہاں ایک مدت تک دفاعی جہاد کی تلقین پر اکتفا کر رکھا تھا، وہاں آگے چل کر اپنا آخری نشانہ یہ بتایا:-

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ[1]

وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے، تاکہ اسے سارے دینوں پر غالب کر دے خواہ یہ بات مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔

"سارے دینوں پر غالب" کرنے سے مُراد نظریاتی غلبہ بھی تھا اور سیاسی غلبہ بھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس اعلان کے ساتھ ہی ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ :-

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً[2]

---

[1] سورۂ توبہ ــ ۳۳   [2] سورۂ توبہ ــ ۳۶

تم سب مل کر مشرکوں سے لڑو، جیساکہ وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔

اور پھر یہی رازِ حقیقت ہے جس کے مدّنظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس قتال اور جہاد کو کبھی نہ ختم ہونے والی ضرورت اور ذمّہ داری بتاتے ہوئے اُمّت کو خبردار کر رکھا ہے کہ:-

اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُذْ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِلٰى اَنْ يُّقَاتِلَ اٰخِرُ اُمَّتِيَ الدَّجَّالَ لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَّلَا عَدْلُ عَادِلٍ۔[1]

جہاد میرے وقت سے لے کر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ میری اُمّت کا آخری فرد دجّال سے نہ لڑلے۔ یہ جہاد کبھی نہ تو کسی ظالم امیر کے ظلم کی وجہ سے ساقط قرار پائے گا نہ کسی عادل امیر کے عدل کے نتیجے میں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری دَور میں، اور خلفائے راشدینؓ نے اپنے زمانوں میں عرب سے باہر کے حکمرانوں کو جو دعوتِ اسلام دی، اور اُن کے انکار پر جس طرح طاقت کے ذریعہ انھیں اسلامی اقتدار کا تابع فرمان بنایا، وہ اسی فرض کے تحت اور اسی مقصد کی خاطر تھا۔

چوں کہ اس جہاد کی نوعیت دفاع کی نہیں بلکہ اقدام کی ہے، اس لیے اسے "اقدامی جہاد" کہنا چاہیے۔

"اقدامی جہاد" کے بارے میں دو باتیں ذہن کے اندر بالکل صاف رہنی چاہییں:-

ایک تو یہ کہ اس کا منشا، یہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کو اسلام لانے پر مجبور کیا جائے۔ کیوں کہ اسلام کا تعلّق دل سے ہے، اور دل جبر سے کسی چیز کا معتقد نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے اسلام بھی جبر سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید میں یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ 'اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ اس کے بندوں میں کوئی گُم راہ اور نافرمان نہ رہے تو وہ انھیں پیدا ہی مومن اور مسلم بنا کر کرتا، یا پیدا کرنے کے بعد انھیں خود اپنے تکوینی حکم سے مسلم بنا دیتا،

---

[1] ابوداؤد، جلد اول، کتاب الجہاد

(لَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا[1]) یہ کام نبی یا اس کی اُمّت کے لیے اُٹھا نہ رکھتا کہ وہ اُنھیں زبردستی مومن و مسلم بنائیں، لیکن انسان جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ جبری اسلام چوں کہ کسی کام کا نہ ہوتا نہ کسی طرح مناسب قرار پاتا اس لیے اس نے ایسا نہیں کیا۔ چناں چہ اس کا صاف اعلان ہے کہ "دین کے معاملے میں مَیں نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے، کسی جبر سے کام نہیں لیا ہے، (لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[2]) ایسی حالت میں وہ اس بات کو کیسے صحیح قرار دے سکتا تھا کہ اسلام کے معاملے میں اگرچہ میں نے تو کسی جبر سے کام نہیں لیا ہے۔ مگر میرے نبیوں اور میرے مسلم بندوں کو اس کی کھلی چھوٹ ہے! یہ اعلان تو صاف بتاتا ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے لیے جبر کسی حال میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس معاملے میں ہر انسان کو پوری آزادی ہے، چاہے تو اسے قبول کرے چاہے تو نہ کرے۔

دوسری بات یہ کہ یہ کسی ایک قوم کو آقا، اور دوسری قوموں کو اس کا غلام بنانے کی مہم قطعاً نہیں ہے۔ یعنی جس چیز کو استعماریت یا سامراج کہا جاتا ہے اس سے اس کا دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بخلاف یہ کچھ ایسی بنیادی صداقتوں کی صرف سیاسی بالادستی تسلیم کرانے کی مہم ہے جن پر اس پوری کائنات کا نظام قائم ہے، اور جن کے تسلیم کر لینے پر انسان کی دُنیا اور آخرت دونوں کی فلاح موقوف ہے۔ پھر جو لوگ دوسروں سے اِن بنیادی صداقتوں کی صرف یہ سیاسی و جزئی بالادستی تسلیم کرانے اُٹھے ہوتے ہیں، اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ خود ان کی کُلّی بالادستی تسلیم کیے ہوتے ہیں۔ سوچیے، جو گروہ خود سب سے بڑے آقا کے سب سے مکمل غلام کی حیثیت رکھتا ہو، وہ کسی دوسرے کو کیا اور کیسے اپنا غلام بنائے گا؟ اس کے علاوہ دوسروں سے ان بنیادی صداقتوں کی یہ جزوی بالادستی بھی وہ اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں، بلکہ خود انہی کے فائدے کے لیے تسلیم کراتے ہیں۔ وہ ان کا کچھ لیتے نہیں، البتہ کچھ دینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح وہ انھیں اس حق کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں جس میں ان کی دونوں جہان کی مسرتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اُن کی حمیّت کو یہ سیاسی محکومی ناگوار

---

[1] سورۂ الرعد - ۳۱ [2] سورۂ البقرۃ - ۲۵۶

ہو سکتی ہے، مگر یہ حمیّت ایک غلط قسم کی حمیّت ہوگی اور خود ان کے مفاد کے خلاف ہوگی۔ اس لیے وہ فی الاصل کوئی وزن نہیں رکھتی۔

مسلّح جہاد کی شرطیں

مسلّح جہاد، خواہ وہ اقدامی ہو خواہ دفاعی، ہر حال میں نہیں کیا جا سکتا۔ صرف خاص حالات ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اس کے لیے کچھ ضروری شرطیں ہیں۔ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہو رہی ہوں، وہ کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ اور نہ صرف یہ کہ ایسے "جہاد" کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی، بلکہ وہ سرے سے جہاد ہی نہ ہوگا، اور کسی اجر و ثواب کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب بن جائے گا۔

یہ شرطیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جہاد کرنے والے مسلمان آزاد اور خود مختار ہوں، اور ان کا اپنا ایک باضابطہ اجتماعی نظام قائم ہو اور ایک خلیفہ یا امیر اُن کا سربراہ ہو۔ بغیر اس آزاد اجتماعی نظم کے کوئی جنگی قدم نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ جنگی اقدام، خواہ وہ دفاعی نوعیت کا ہی کیوں نہ ہو، ایک آزاد ماحول میں اور ایک با اختیار امیر کی سرکردگی میں ہی کیا جا سکتا ہے[۱] چناں چہ مسلمانوں کو مکّہ کی مغلوبانہ

---

[۱] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی ملک کے مسلمان اگر آزاد اور خود مختار نہ ہوں اور ان پر تشدّد کیا جاتا ہو تو وہ اس تشدّد کی مدافعت بھی نہیں کر سکتے۔ کسی ظالم کے ظلم کا مقابلہ کرنا بجائے خود کارِ ثواب ہے، اور اگر اس خود حفاظتی مقابلے میں کوئی مسلمان مارا جائے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک شہید کا درجہ پائے گا (مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ وَّ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ اَھْلِہٖ اَوْ دُوْنَ دَمِہٖ اَوْ دُوْنَ دِیْنِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ (ابو داؤد، جلد دوم) مگر ظاہر ہے جس اصطلاحی جہاد و قتال کی یہاں گفتگو ہو رہی ہے وہ اور چیز ہے، اور اپنی جان و مال کے بچاؤ کے لیے ظالموں اور حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔

(ص)

زندگی میں اپنے دفاع کے لیے بھی ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی، حالاں کہ قریش کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ یہ اجازت ہجرت کے بعد اور مدینے کا آزاد ماحول میسّر آنے کے بعد ہی مل سکی، جہاں آپؐ کے زیرِ قیادت باضابطہ اسلامی اسٹیٹ قائم ہو چکی تھی۔
یہی حال ان تمام انبیاءؑ کا رہا جن کی دعوت مسلّح جہاد کے مرحلے میں داخل ہو سکی تھی۔
جب تک یہ شرط پوری نہیں ہو جاتی اس وقت تک دین کی خاطر پہنچائی جانے والی تکلیفوں کا برداشت کرنا ہی اصل جہاد ہے۔

(۲) مخالف قوتوں سے لڑنے کے لیے ضروری طاقت میسّر ہو۔ کیوں کہ شریعت نے اپنے احکام کی پیروی کے سلسلے میں جا بجا یہ اصول بیان فرما رکھا ہے :۔

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا۔[1]

کسی شخص پر اس کی استطاعت کے مطابق ہی ذمّہ داری ڈالی جاتی ہے۔

اسی اصول کے مطابق اس نے یہ ارشاد بھی فرمایا ہے :۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔[2]

اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس قدر کہ تمہارے بس میں ہو۔

اِس لیے جب تک دشمن سے لڑنے کے لیے ضروری طاقت موجود نہ ہو، جہاد کرنے کی ذمّہ داری بھی مسلمانوں پر عائد نہ ہوگی۔

(۳) یہ جہاد اور قتال کلیتہً "فی سبیل اللہ" ہو۔ لڑنے والے مسلمان صرف دین کی خاطر، اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے لڑ رہے ہوں، بدی اور ظلم کو مٹانا اور نیکی اور انصاف کو فروغ دینا ہی ان کا مقصد ہو۔ اور یہ سب کچھ بھی صرف اس لیے ہو کہ ان کا اللہ ان سے راضی ہو جائے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد اور محرک اس جنگ کے پیچھے کام نہ کر رہا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ "ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے لڑتا ہے، دوسرا شہرت کے لیے اور تیسرا دکھاوے کے لیے لڑتا ہے، ان میں سے کس کی لڑائی فی سبیل اللہ ہوتی ہے؟"

---

[1] سورۂ بقرۃ ۔ ۲۲۳ [2] سورۂ تغابن ۔ ۱۶

آپؐ نے فرمایا :-

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ [۱]

جو شخص صرف اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑتا ہے، بس اسی کا لڑنا فی سبیل اللہ ہوتا ہے۔

ایک اور موقع پر کسی نے پوچھا "اے اللہ کے رسولؐ! ایک شخص ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے، لیکن ساتھ ہی دنیا کا کوئی مفاد بھی اس کے سامنے ہے، اس کی بابت حضورؐ کیا فرماتے ہیں؟" ارشاد ہوا "لَا اَجْرَ لَہٗ" (اسے کوئی اجر نہ ملے گا) پوچھنے والے نے تین بار یہی سوال کیا، اور حضورؐ نے تینوں بار یہی جواب دیا۔[۲]

اسی طرح آپؐ نے یہ کلمہ بیان فرما رکھا ہے کہ :-

.... لَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِيَّةً وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَّاتَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ [۳]

.... نہیں ہے ہم میں سے وہ جو کسی عصبیت کے تحت لڑے، اور نہیں ہے ہم میں سے وہ جو کسی عصبیت کی بنا پر جان دے۔

جہاد کی پہلی دو شرطوں کی ضرورت تو بالکل واضح ہے۔ لیکن اس تیسری شرط کی ضرورت سمجھنے کے لیے تھوڑا سا غور کرنا پڑے گا۔ اسلام نے لڑائی کا حکم بُرائی اور فتنے کے مٹانے اور نیکی و خدا پرستی کے قائم کرنے کے لیے دیا ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل سے معلوم ہو چکا۔ تو کیا وہ لوگ جو خود اپنے اندر غلط جذبات پال رہے ہوں اور ان ہی جذبات کے تحت لڑ رہے ہوں، وہ اپنی لڑائی کے نتیجے میں نیکی اور خدا پرستی کو فروغ دے سکیں گے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ ایسے لوگ تو جو کچھ کریں گے وہ صرف یہ ہوگا کہ ایک بُرائی کی جگہ دوسری بُرائی کو لا کر نصب کر دیں۔ اور بات نہ صرف یہ کہ اسلام کی کوئی خدمت نہیں، بلکہ اُلٹی اُس کی عداوت ہے کیوں کہ ایسے لوگ بُرائی کا یہ کھیل اسلام کے نام پر کھیلیں گے۔ جس کے نتیجے میں اللہ کی مخلوق

---

[۱] بخاری، جلد اوّل، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا۔ [۲] ابوداؤد، جلد اوّل۔ باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا۔ [۳] ابوداؤد، جلد دوم۔ باب فی العصبیۃ۔

اسلام سے کچھ اور دُور ہی ہو جائے گی۔

دین میں جہاد کی اہمیت

جس جہاد پر دین کی بقا موقوف ہو اور جو ایمان کی فطری مانگ ہو، دین میں اس کا مقام کوئی معمولی مقام نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید جب کبھی سچے اہلِ ایمان کی بنیادی صفتیں بیان کرتا ہے تو ان میں جہاد کو ضرور شامل رکھتا ہے۔ مثلاً :-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔[1]

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جہاد کیا، اور وہ لوگ جنھوں نے انھیں پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ۔[2]

اے ایمان والو! کیا میں تمھیں وہ تجارت بتاؤں جو تمھیں (آخرت کے) دردناک عذاب سے بچا لے؟ (وہ یہ ہے کہ) اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھو اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے راہِ خدا میں جہاد کرو۔

گویا اس کے نزدیک جہاد کے بغیر دُنیا میں "سچے دین و ایمان" کا، اور آخرت میں "دردناک عذاب سے نجات" کا کوئی تصوّر ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

اِن آیتوں میں ذکر اگرچہ مسلّح جہاد ہی کا ہے، مگر ان میں جہاد کی جو اہمیت اور عظمت بیان ہوئی ہے وہ اسی جہاد کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ عام ہے، اور جہاد کی دوسری قسموں کا بھی مرتبہ و مقام ایسا ہی ہے۔ گویا اپنے اپنے موقع پر، جہاد کی ہر شکل اور ہر قسم، بجائے خود،

---

[1] سورۂ انفال - ۷۴ [2] سورۂ صف - ۱۰-۱۱

ایمان کی کسوٹی ہے۔ آئیے اللہ اور رسولؐ کی زبان سے اس حقیقتِ واقعی کی توثیق اور اس کی وضاحت سُنیے :۔

(۱) داخلی جہاد :۔ سب سے پہلے "داخلی جہاد" کو لیجیے۔ اُوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن مجید نے اس جہاد کو ایمان اور نفاق کے درمیان فرق کرنے والا خط بنایا ہے، اور حدیث میں اسے ایمان کی ضروری علامت قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ و رسول، دونوں کا فیصلہ یہ ہے کہ جس دل میں بھلائی کی تلقین کرنے اور بُرائی سے روکنے کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا اس میں نفاق کی اندھیاری ہی ہوسکتی ہے، ایمان کی روشنی نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ ایک صاحبِ ایمان کے لیے اگر وہ فی الواقع صاحبِ ایمان ہے، بُرائیوں کو انگیز کرتے رہنا ممکن ہی نہیں ہے۔ کسی بُرائی کو دیکھ کر اگر وہ کچھ نہیں کرسکتا، حتیٰ کہ اس کے خلاف اس کی زبان بھی نہیں کھل پاتی، تو کم سے کم دل میں تو اسے لازماً بُرا سمجھنا ہی چاہیے۔ یہ ایمان کا کم سے کم اور کمزور سے کمزور درجہ ہے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا دل بھی نہیں رکھتا تو اللہ اور رسولؐ کے نزدیک وہ مسلمان بھی نہیں ہے۔

ایمان سے اس جہاد کا فطری تعلق اتنا گہرا ہے کہ وہ قوموں کی موت و حیات کا فیصلہ کر دیا کرتا ہے۔ ایسی قوم کی اس زمین پر کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی جس کے اندر کے بھلے لوگ بس اپنے ہی بھلے پن سے سروکار رکھتے ہوں، اور ان کے چاروں طرف بدی کا جو سیلاب اُمنڈتا رہتا ہے اس کی انھیں کوئی پروا نہ رہتی ہو۔ جس طرح جنگل کی سوکھی گھاس جلا دی جاتی ہے اسی طرح ایسی قوم بھی تباہ کر کے رکھ دی جاتی ہے۔ اور جب یہ تباہی آتی ہے تو بدکاروں اور بدی پر خاموش رہنے والے، نیکوکاروں، دونوں کے سمیت پوری آبادی مبتلائے عذاب کر دی جاتی ہے، اور اس عذابِ عام سے اگر کچھ لوگ بچتے ہیں تو صرف ایسے لوگ بچتے ہیں۔ جو بدی کے اس طوفان میں بھی اپنے فرض کو بھولے نہ رہے ہوں، اور اپنی سکت بھر لوگوں کو بُرائی سے باز رہنے کی تلقین کرتے رہے ہوں۔ قوموں کی پچھلی تاریخ دراصل اسی قانونِ الٰہی کے نفاذ کی تاریخ ہے۔ قرآن مجید مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنے اور خود اپنی جگہ ہوشیار رہنے کی تاکید کی غرض سے اس تاریخ پر یوں تبصرہ کرتا ہے :۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ

اَلْفَسَادِ فِی الْاَرْضِ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْھُمْ [1]

تو تم سے پہلے کی قوموں میں ایسے خیر پسند کیوں نہ ہوئے جو لوگوں کو زمین میں بگاڑ پھیلانے سے روکتے، ان تھوڑے سے اشخاص کے سوا جن کو ان کے اندر سے ہم نے عذاب سے بچالیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی قانونِ عذاب و نجات کی طرف سے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْھَوُنَّ عَنِ الْمُنْکَرِ اَوْ لَیُوْشِکَنَّ اللّٰہُ اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عِقَابًا مِّنْہُ فَتَدْعُوْنَہٗ فَلَا یُسْتَجَابُ لَکُمْ [2]

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے، تم ضرور بالضرور نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا۔ ورنہ قریب ہوگا کہ اللہ تم پر اپنا عذاب بھیج دے، اور پھر تم اسے پکارتے رہو، پر تمہاری ایک نہ سُنی جائے۔

یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے ارشاداتِ رسول دراصل حسبِ ذیل اس فرمانِ خداوندی کی وضاحت ہیں کہ:-

وَاتَّقُوْا فِتْنَۃً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَاصَّۃً وَّاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔ [3]

اس فتنے سے بچتے رہو جس کی مار تم میں سے صرف ان ہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے "ظلم" کا راستہ اختیار کیا ہوگا، اور جان رکھو کہ اللہ بڑی سخت پاداش والا ہے۔

بنی اسرائیل کی قوم اللہ تعالیٰ کے سخت ترین عتاب کی زد میں اسی وقت آئی تھی جس

---

[1] سورہ ہود — ۱۱۶ [2] ترمذی، جلد دوم، باب ما جاء فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر۔

[3] سورۂ انفال - ۲۵

وقت اس کے اندر سے اِس "داخلی جہاد" کا احساس تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ برائیاں جنگل کے پودوں کی طرح آزادی کے ساتھ نشو و نما پا رہی تھیں، اور ان سے معاشرے کو پاک کرنے کی کوئی قابلِ ذکر کوشش باقی نہ رہ گئی تھی، قرآنِ عزیز کا بیان ہے کہ :۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ [۱]

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کر رکھی تھی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبانوں سے لعنت کر دی گئی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ وہ نافرمان ہو گئے تھے اور حد سے بڑھتے رہتے تھے۔ جن برائیوں کا ان سے ارتکاب ہوتا ان سے ایک دوسرے کو روکا نہیں کرتے تھے۔ یقیناً بڑا تھا یہ رویہ جو وہ اختیار کیے ہوئے تھے۔

جہاد کی یہ قسم 'شہادتِ حق' کے لیے مثبت پہلو سے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے، بلکہ ایک لحاظ سے تو اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ کیوں کہ دوسرے لوگوں کے سامنے اسلام کی گواہی دینے کے مقصد میں کامیابی کا زیادہ تر انحصار اس بات پر ہے کہ خود اس گواہی کے دینے والوں کا معاشرہ بھی اپنے عمل سے اس گواہی میں شریک ہو۔ ورنہ اگر ایک طرف لوگوں پر اسلام کی حقّانیت ثابت کی جا رہی ہو اور دوسری طرف خود اسلام کے پیرو کفر و فسق کے تقاضوں سے اپنی عملی وابستگی کا ثبوت دے رہے ہوں، تو دنیا اس "شہادت" کا کیا اثر قبول کرے گی؟ ایسی حالت میں تو وہ اُسے شاید صرف مسلم قومیّت کے جذبۂ فخر اور احساسِ برتری کا ایک مظاہرہ ہی سمجھے گی، اور ایسا سمجھنے میں بڑی حد تک معذور بھی ہوگی۔ اس لیے جب تک اُمّتِ مسلمہ خود اپنے اندر کی برائیوں کے خلاف کھنچی ہوئی تلوار نہ بنی ہو، اس پوزیشن میں ہرگز نہیں ہو سکتی کہ دوسروں کے سامنے اسلام کے پیغام اور قرآن کی دعوت کو لے کر جائے۔

---

[۱] سورۃ مائدہ ۔ ۷۸

(۲) دعوتی اور فکری جہاد :- اب دعوتی اور فکری جہاد کی اہمیت کو لیجیے ۔ اگر ایک اُمّت کی حیثیت سے اُمّتِ مسلمہ کا مقصد قیام صرف اسلام کی شہادت دینا ہے ، جیسا کہ واقعہ ہے ، اس کے لیے یہ جہاد اپنی ضرورت کے لحاظ سے بھی اور اپنی وسعت کے لحاظ سے بھی بداہتہً غیر معمولی اہمیت رکھنے والا عمل ہوگا ۔ اس کی ضرورت تو بالکل واضح ہے ۔ جب تک آپ اسلام کو دوسروں کے سامنے اس طرح رکھیں ہی نہیں جس طرح اسے رکھنا چاہیے ، اس وقت تک اس کی شہادت کے فریضے کے ادا ہو پانے کا کوئی سوال ہی کہاں پیدا ہو سکے گا ۔ اس لیے بالکل ناگزیر ہے کہ لوگوں کے سامنے اس کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کی جائے ، واضح اور دل نشین انداز میں کی جائے ۔ اسے ضروری دلائل سے مسلّح کر کے پیش کیا جائے ، اور مخاطب کے ذہن کی گرہیں ایک ایک کر کے کھول کر رکھ دی جائیں ۔ رہی اس کی وسعت کی بات ، تو وہ بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے ۔ "اسلام" اگر ایک ہے تو "غیر اسلام" ایک سے بہت زیادہ ہے ۔ اس لیے جہاں تک اسلام کی ایک سادہ سی وضاحت اور رسمی تبلیغ کا تعلق ہے ، اس کے لیے تو ایک تقریر بھی کافی ہو سکتی ہے ۔ لیکن جس چیز کا نام "اسلام کی شہادت" ہے وہ اس سادہ سی وضاحت اور رسمی تبلیغ سے بالکل مختلف چیز ہے ۔ کیوں کہ ایک تو نفسِ "شہادت" کا مفہوم ہی رسمی تبلیغ سے بہت اونچا ہے ، دوسرے "غیر اسلام" کے جن لوگوں کے سامنے یہ شہادت دینی ہے وہ ایک ہی خیال اور ایک ہی مسلک کے لوگ نہیں ہیں ، بلکہ متعدد نظریوں ، مسلکوں ، ازموں اور مذہبوں کے ماننے والے ہیں ، اور امّت کو اسلام کی شہادت ان سب کے سامنے دینی ہے ۔ اندازہ لگائیے کہ اس زمانے میں اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کتنے پھیلے ہوئے محاذوں پر لڑنا ہوگا ؟ کیسے زنگارنگ اسلحوں کا مقابلہ کرنا ہوگا ؟ کتنے مشکل معرکوں کو سر کرنا ہوگا ؟ پھر جہاں تک جہاد کی تیسری قسم کا تعلق ہے ، وہ تو خاص حالات میں اور کئی شرطوں کے پورا ہونے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے ، جیسا کہ ابھی تفصیل سے معلوم ہو چکا مگر اس "فکری اور دعوتی جہاد" کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے لیے وقت اور ماحول کی نہ کوئی قید ہے نہ کوئی شرط ، بلکہ ہر حال میں ، ہر ماحول میں ، ہر زمانے میں اور ہر جگہ لازمی طور سے پوری کی جانے والی ذمّہ داری ہے ۔ اور ذمّہ داری بھی ایسی جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا ۔ جسے کبھی موقوف کیا ہی نہیں جا سکتا ۔ اور جب تک مسلّح جہاد

کے لیے ضروری حالات اور شرائط مہیّا نہ ہوجائیں، جہادِ حق کا سارا انحصار اسی دعوتی جہاد پر رہتا ہے۔ چناں چہ اکثر انبیاءؑ کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی نبوت کا پورا دور اسی جہاد تک محدود رہا، اور مسلّح جہاد کا وقت آیا ہی نہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہ دعوتی اور فکری جہاد ہی بیرونی دنیا سے کیا جاتے والا اصل جہاد ہے۔ "مسلّح جہاد" تو ایک مجبوری کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ دین کی دعوت اور حق کی شہادت کا مقصد لوگوں کو خدا شناس بنانا اور ان کے دلوں میں ایمان پیدا کرنا ہوتا ہے، تاکہ وہ دونوں جہان کی فلاح کے مستحق بن جائیں۔ اور دلوں میں خدا شناسی اور ایمان اچھی باتوں اور معقول دلیلوں ہی سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ تلواروں سے۔ تلوار تو صرف اس لیے اٹھائی جاتی ہے کہ ان "اچھی باتوں" اور "معقول دلیلوں" کے پیش کیے جانے کے لیے راہ کی رکاوٹیں دُور کر دی جائیں۔

یہ دعوتی اور فکری جہاد اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں اتنا اونچا مقام رکھتا ہے کہ وہ اسے "اپنی مدد" سے تعبیر فرماتا ہے، اور اس جہاد کے کرنے والوں کو، جو فی الواقع اس کے غلام ہوتے ہیں، "اپنا مددگار" قرار دیتا ہے:-

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ [1]

اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے خطاب کر کے کہا تھا کہ کون ہیں اللہ کے راستے پر میرے مددگار؟ تو ان حواریوں نے جواب دیا تھا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔

سب جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت اس دور میں داخل ہی نہ ہو سکی تھی جو "مسلّح جہاد" کا دور ہوتا ہے، اور وہ تمام تر فکری و دعوتی "جہاد" ہی تک محدود رہی تھی۔ اس کے باوجود ان کے حواریوں کو "اللہ کے مددگار" فرمایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انہیں

---

[1] سورۂ صف - ۱۴

یہ غیر معمولی شرف ومجد والاخطاب جس بنا پر عطا ہوا تھا وہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچانے کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس جگہ "حق ادا کر دینے،، کے لفظوں کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیجیے۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ "اللہ کے مددگار" ہونے کا شرف مومن کو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اس کے دین کو دوسروں تک پہنچانے میں اپنی فکر اور کوشش پوری طرح لگا دیتا ہے، جب وہ ناسازگار حالات میں بھی اپنی پکار بلند کرتا رہتا ہے، جب وہ خطروں کے طوفان میں بھی خاموش نہیں رہتا۔ یہ صرف قیاس کی بات نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید کی بتائی ہوئی حقیقت ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت (۵۲) صراحت کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے 'مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ' کی اضطراب بھری صدا اس وقت لگائی تھی جب ان کے مخاطب بنی اسرائیل نے ان کو آخری طور پر جھٹلا دیا تھا، اور اب ان کی طرف سے آں جنابؑ کے خلاف شیطانی کارروائیاں اپنے عروج پر پہنچنے والی تھیں۔ آیت کریمہ کے الفاظ یہ ہیں:-

> فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیۡسٰی مِنۡہُمُ الۡکُفۡرَ قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشۡہَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ [1]
>
> پھر جب عیسیٰؑ کو محسوس ہو گیا کہ یہ لوگ (میری دعوت کا آخری طور پر) انکار کر چکے ہیں تو انھوں نے کہا "اللہ کی راہ میں میرے مددگار کون ہیں؟" حواریوں نے جواب دیا "ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے، آپ گواہ رہیے کہ ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔"

معلوم ہوا کہ مومن کے "اللہ کے مددگار" بننے کا فیصلہ اس وقت ہوتا ہے جب دین کی دعوت اپنی عام تبلیغ و تفہیم کی منزلوں سے گزر کر شدید مخالفوں کی زد میں آ چکی ہوتی ہے، جو لوگ اس وقت بھی خاموش نہیں رہتے اور ہر مشکل برداشت کر کے اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچاتے ہی رہتے ہیں، وہی "اللہ کے مددگار،، قرار پاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسی ہی دعوتی

---

[1] سورۂ آل عمران - ۵۲

کوششیں حقیقی معنوں میں "جہاد" اور "اللہ کے دین کی مدد" ہوتی ہیں۔

(۳) مسلح جہاد:۔ آخر میں "مسلح جہاد" کے مرتبہ و مقام کا جائزہ لیجیے۔ قرآن مجید اور احادیث کے صفحات اس عمل کی عظمت کے تذکروں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جتنا محبوب اللہ کی نگاہ میں یہ عمل ہے، نماز کے سوا کوئی اور عمل اتنا محبوب نہیں ہے۔ دشمنان حق کے مقابلے میں "دعوتی اور فکری جہاد" کرنے والوں کو جب وہ "اپنا مددگار" قرار دیتا ہے، تو اندازہ لگائیے، وہ ان لوگوں کو کیا کچھ نہ قرار دے گا جو اس کے دین کی خاطر اپنی آخری پونجی بھی نثار کر دینے کے لیے میدان میں اُتر آتے ہیں۔ چناں چہ وہ ایسے لوگوں کو اپنا مددگار ہی نہیں، اپنا محبوب کہتا ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ۔[۱]

بلاشبہ اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

اس محبوبیت کی تھوڑی سی شرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنیے:۔

"ایک شب و روز کی، سرحدوں کی نگرانی ایک مہینے کے مسلسل روزوں اور اور نمازوں سے بھی افضل ہے۔"[۲]

"ہر مرنے والے کے عمل پر اس کی موت کے ساتھ ہی مُہر لگا دی جاتی ہے' لیکن اس شخص کا معاملہ اس سے مختلف ہے جو اللہ کی راہ میں جنگی پڑاؤ ڈالنے والا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کا یہ، عمل (ثواب کے لحاظ سے) قیامت تک، برابر بڑھتا ہی رہتا ہے۔"[۳] الخ

"قسم ہے اس ذات کی جس کی مُٹھی میں محمدؐ کی جان ہے، اللہ کی راہ میں

---

[۱] سورۂ صف۔ ۴ [۲] مسلم، جلد دوم، باب فضل الرباط [۳] ترمذی جلد اول۔ باب ما جاء فی فضل من مات مرابطاً۔

جہاد کرنے کے لیے ایک صبح یا ایک شام کا سفر، دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے، اور راہِ خدا میں دشمن کے بالمقابل جم کر ٹھیرا رہنا گھر کی ستّر برس کی نمازوں سے بھی بہتر ہے۔[1]

"راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کا حال ایسا ہے جیسے کوئی شخص اس وقت تک، جب تک کہ یہ مجاہد اپنے جہاد سے واپس نہ آجائے، مسلسل روزے رکھتا اور نمازیں ادا کرتا اور ان میں قرآن پڑھتا رہے، اور نہ تو اس روزے میں اسے کوئی سُستی لاحق ہو نہ اِس نماز میں۔"[2]

صرف یہی نہیں کہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے لڑنا اس کی محبّت اور مغفرت اور رحمت کا حق دار بنا دیتا ہے، بلکہ اس کی نگاہ میں تو وہ لوگ بھی خاصا اُونچا مقام پا لیتے ہیں جو لڑنے والوں کی بالواسطہ مدد کرتے ہیں اور جہاد کی تیاریوں میں بس اُن کا ہاتھ بٹا دیتے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ:-

"جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کسی شخص کو جہاد کا سروسامان مہیّا کر دیا، اس نے (گویا) خود جہاد کیا، اور جس نے کسی مجاہد کے اہل و عیال کی، اس کی عدم موجودگی میں، دیکھ بھال کی، وہ (گویا) خود شریکِ جہاد رہا۔"[3]

"اللہ تعالیٰ صرف ایک تیر کے طفیل تین آدمیوں کو جنّت میں داخل کرتا ہے:- ایک[1] اس شخص کو جو ثواب کی نیت سے یہ تیر بناتا ہے، دُوسرے[2] اس شخص کو جو اُسے دشمن پر چلاتا ہے، اور تیسرے[3] اس شخص کو جو یہ تیر اسے مہیا کرتا ہے۔"[4]

جس جہاد کی خاطر ہتھیار بنانے اور مہیّا کرنے والے تک کو اتنی بڑی دولت ہاتھ آجاتی ہو، وہ اس شخص کو کیا کچھ نہ عطا کرتا ہوگا جو اس کے لیے اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہو، میدانِ جنگ میں پہنچ کر لڑا ہو، زخمی ہوا ہو، خون میں نہایا ہو، یہاں تک کہ اس نے اپنی جان اپنے

---

[1] ترمذی، جلد اول، باب فی الغدوّ والرواح فی سبیل اللہ۔ [2] مسلم، جلد دوم، باب فضل الشہادۃ۔
[3] مسلم، جلد دوم، باب فضل اعانۃ الغازی [4] ابو داؤد، جلد اول، باب فی الرمی۔

مالک کے سپرد کر دی ہو۔ ایسے شخص کی خوش طالعی کا کچھ اندازہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے لگائیے :۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ..... يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ[1]

ان لوگوں کو ہرگز مُردہ نہ سمجھو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہوں (وہ فی الواقع مُردہ نہیں ہیں) بلکہ زندہ ہیں، اپنے مالک کے پاس رزق پا رہے ہیں، اور اس حال میں ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل میں یہ جو کچھ انھیں دے رکھا ہے اس پر پوری طرح شاداں و فرحاں رہتے ہیں۔... اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی، اس کے فضل و کرم کی، اور اس بات کی کہ یقیناً اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا، بشارت حاصل کر رہے ہیں۔

یاد رہے کہ پورے قرآن میں اس طرح کے جاں نواز کلمات صرف انہی لوگوں کے حق میں وارد ہوئے ہیں جو اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے اپنی جان دے دیتے ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن مجید کا یہ خصوصی اعلان بتاتا ہے کہ اس عمل کو اللہ کی نگاہ میں جو محبوبیت حاصل ہے وہ کوئی عام قسم کی نہیں، بلکہ ایک امتیازی شان رکھنے والی محبوبیت ہے۔ اللہ کے رسول نے اس سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے، اس سے اس "امتیازی شانِ محبوبیت" کی بہت کچھ وضاحت ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ :

مَا اَحَدٌ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ يُحِبُّ اَنْ يَّرْجِعَ اِلَى الدُّنْيَا وَلَهٗ مَا عَلَى الْاَرْضِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا الشَّهِيْدُ يَتَمَنّٰى اَنْ يَّرْجِعَ اِلَى الدُّنْيَا فَيُقْتَلَ عَشْرَ مَرَّاتٍ لِّمَا يَرٰى مِنَ الْكَرَامَةِ[2]

کوئی بھی شخص جو جنّت میں داخل ہوگا، اس دنیا کی طرف پلٹنا نہ چاہے گا، خواہ

---

[1] سورہ آل عمران - ۱۶۹ تا ۱۷۱ [2] بخاری، جلد اول، باب تمنی المجاہد ان یرجع الی الدنیا۔

اس زمین کی ایک ایک چیز اسی کی ملکیت کیوں نہ ہو ۔ مگر شہید کا حال یہ نہ ہوگا۔
شہید اپنی اس عزّت و تکریم کو دیکھ کر، جو اسے خدا کے حضور حاصل ہوگی، تمنا کرے گا
کہ کاش وہ دنیا میں دس بار واپس جائے، اور دس بار راہِ خدا میں قتل کیا جائے ۔

یہ تو آخرت کا معاملہ رہا۔ خود اس دنیا میں بھی راہِ خدا کے یہ شہید ایک امتیازی شان سے سرفراز ہوتے ہیں ۔ ہر مرنے والے کو غسل دیا جاتا اور جسم کے کپڑے اُتار کر صاف ستھرا کفن پہنایا جاتا ہے ۔ لیکن شہداء کے بارے میں حکم شریعت یہ ہے کہ انہیں نہ تو غسل دیا جائے، نہ کوئی کفن پہنایا جائے، بلکہ ان کے اُوپر کے اُن ہی خون آلود کپڑوں میں، جن میں وہ قتل ہوئے ہوں، دفن کر دیا جائے ۔ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ :۔

اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِقَتْلٰی اُحُدٍ اَنْ یُنْزَعَ عَنْھُمُ الْحَدِیْدُ وَالْجُلُوْدُ وَاَنْ یُّدْفَنُوْا بِدِمَائِھِمْ وَثِیَابِھِمْ ۔[1]

اُحد کے شہیدوں کے بارے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حکم دیا کہ ان کے جسموں پر سے ہتھیار اور زرہیں اُتار لی جائیں، اور پھر ان کے خون اور ان کے کپڑوں سمیت (جوں کا توں) انہیں دفن کر دیا جائے ۔

اس امتیاز خاص کی وجہ ایک اور روایت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ شہیدوں کا خون وہ خون نہیں ہوتا جسے فقہ کی زبان میں "ناپاک" کہتے ہیں، بلکہ وہ خون ہوتا ہے جس سے زیادہ پاک چیز شاید کوئی اور ہوتی ہی نہیں ۔ اللہ کے نزدیک وہ زعفران جیسا خوش رنگ اور مُشک جیسا خوشبودار ہوتا ہے۔ (لَوْنُھَا لَوْنُ الزَّعْفَرَانِ وَرِیْحُھَا رِیْحُ الْمِسْکِ[2])

غرض اللہ و رسول کے ارشادات کے مُطابق یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ راہِ خدا میں قتل ہونے والوں کی حیثیت مختلف پہلوؤں سے حد درجہ ممتاز اور قابلِ رشک ہوتی ہے ۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ حقیقت دو اور حقیقتوں کو آشکارا کر رہی ہے :۔ ایک[1] تو یہ کہ "مسلّح جہاد" جہاد کی سب سے اعلیٰ اور افضل قسم ہے، دوسری[2] یہ کہ یہ جہاد سب سے بڑی نیکی، اور سب سے

---

[1] احمد، جلد ۵، ص ۴۳۱ [2] ابوداؤد، جلد اوّل، باب فی من سال اللہ الشہادۃ ۔

بڑی عبادت اور سب سے بڑی خدا پرستی ہے۔ چناں چہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب پوچھا گیا کہ " اے اللہ کے رسول! سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟" (اَيُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟) تو آپؐ نے فرمایا:-

مَنْ جَاهَدَ الْمُشْرِكِيْنَ بِمَالِهٖ وَنَفْسِهٖ [1]

سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ آدمی (دشمنِ دین) مشرکوں سے اپنے مال اور اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرے۔

اِسی طرح جب یہ دریافت کیا گیا کہ " سب سے افضل شخص کون ہے؟" (اَيُّ النَّاسِ اَفْضَلُ؟) تو ارشاد ہوا:-

مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ [2]

سب سے افضل شخص وہ مومن ہوتا ہے جو اپنی جان اور اپنے مال سے اللہ کی راہ میں لڑتا ہے۔

" اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے لڑنے والا مومن سب سے افضل ہوتا ہے"۔ یہی بات دُوسرے لفظوں میں اگر کہی جائے تو اس طرح کہی جائے گی کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے لڑنا سب سے افضل عمل اور سب سے بڑی نیکی ہے۔

جو عمل سب سے اونچا ہو، کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اجر بھی سب سے اُونچا نہ ہو۔ اوپر جن آیتوں اور حدیثوں کے حوالے گزرے ہیں، ان میں اس امر کے بارے میں بھی کھلے اشارے، بلکہ وضاحتیں موجود ہیں۔ مزید اطمینان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات بھی سُن لیجیے:-

" دو آنکھوں کو جہنّم کی آگ نہ چھوئے گی: ایک وہ جو اللہ کے خوف سے رو پڑی ہو۔ دوسری وہ جس نے اللہ کی راہ میں پہرہ دیتے ہوئے رات گزاری ہو۔" [3]

---

[1] ابوداؤد، جلد اول، باب فضل التطوع فی البیت [2] بخاری جلد اوّل باب افضل الناس مومن مجاہد بنفسہ ومالہ فی سبیل اللہ۔ [3] ترمذی، جلد اوّل، باب ماجاء فی فضل الحرس فی سبیل اللہ۔

"جہاد فی سبیل اللہ کی گرد اور جہنّم کا دُھواں، یہ دونوں چیزیں کسی شخص کے اُوپر اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔"[1]

"جس نے اللہ کی راہ میں اتنی دیر بھی جنگ کی جتنی دیر کہ اُونٹنی دوہنے میں دو دھاروں کے درمیان ہوا کرتی ہے، اس کے لیے جنّت کا ملنا ضروری ہوگیا۔"[2]

غزوۂ حنین کے موقع پر ایک صحابی، حضرت انس بن ابی مرثد غنوی رضؓ نے رات بھر ایک گھاٹی پر پہرہ دیا۔ صبح کے وقت جب وہ اپنی اس ڈیوٹی سے واپس لوٹے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے انہیں خطاب کرکے فرمایا:۔

قَدْ اَوْجَبْتَ فَلَا عَلَیْكَ اَلَّا تَعْمَلَ بَعْدَهَا۔[3]

تم نے اپنے لیے جنّت واجب کرلی۔ کوئی حرج نہیں اگر اس عمل کے بعد کچھ اور نہ کرو۔

جن لوگوں نے بدر کی لڑائی لڑی تھی، ان کے بارے میں آپؐ نے ایک موقع پر حضرت عمر رضؓ کو خطاب کرکے فرمایا:۔

وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ اللّٰهَ اطَّلَعَ عَلٰٓی اَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ۔[4]

تمہیں کیا معلوم، شاید اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کی طرف دیکھ کر کہہ دیا ہو کہ "جو چاہو کرو، میں تمہیں بخش چکا ہوں۔"

"مسلّح جہاد" کو اللہ کی نگاہ میں جو اتنا اونچا مقام حاصل ہے، اس پر کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس میں تعجب کی کوئی بات ہی نہیں۔

---

[1] ترمذی، جلد اوّل، باب ما جاء فی فضل الغبار فی سبیل اللہ۔ [2] ترمذی، جلد اوّل باب فی الغدو والرواح فی سبیل اللہ۔ [3] ابوداؤد، جلد اوّل، باب فی فضل الحرس فی سبیل اللہ۔ [4] مسلم، جلد دوم، باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعہ واہل بدر۔

اللہ کی بندگی ہی جب مومن کا مقصد حیات ہے، اور جب اُمّتِ مسلمہ وجود میں لائی ہی گئی اسی غرض سے ہے کہ دنیا کے سامنے حق کی پوری پوری "شہادت" دے، تو اس بندگی سے بڑی بندگی اور اس "شہادت" سے اُونچی شہادت اور کیا ہوسکتی ہے جو اپنی جان دے کر انجام دی گئی ہو؟ یقینی طور پر یہ اللہ کی سب سے بڑی بندگی، اور حق کی سب سے اُونچی "شہادت" ہوگی۔ دُوسرے لفظوں میں یہ کہ آدمی کے وجود کا جو مقصد ہے، یہ مسلّح جہاد اس مقصد کی انجام دہی کی سب سے عظیم کوشش ہے۔ اور جس وقت وہ اس جہاد میں اپنی جان کو بھی قربان کر چکتا ہے اس وقت اللہ کی بندگی اور حق کی شہادت کی آخری منزل پر جا پہنچتا ہے۔ کیوں کہ کسی مقصد یا فرض کی خاطر اپنی جان تک کو قربان کر دینا یقینی طور پر اس کی خدمت کا آخری حق ادا کر دینا ہے، اور فی الواقع ایسا ہی شخص اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اسے اس مقصد کا حقیقی عَلم بردار اور اس فرض کا سب سے سچّا خادم کہا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہر وہ مسلمان، جو اپنے قول اور عمل سے دین کی شہادت دیتا ہے، اپنی جگہ دین کا "شہید" (گواہ) ہوتا ہے۔ مگر جہاں تک نام اور خطاب کا تعلق ہے، اصطلاحاً "شہید" کا خطاب ان ہی لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو اللہ کے دین کی خاطر اپنی جان بھی نثار کر چکے ہوں۔ کیوں کہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اسلام کی "شہادت" ادا کرنے میں اپنی آخری پونجی لُٹا کر اپنی آخری ممکن کوشش بھی انجام دے چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے حقیقی معنوں میں "شہید" کا خطاب انہی کو زیب دیتا ہے۔

اِس بحث سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہی جان کی قربانی ایک شخص کے ایمان اور اسلام کی معراجِ کمال ہے۔ جس وقت انسان جہاد کے میدان میں محض اللہ کی رضا کی خاطر موت کو گلے لگاتا ہے، اس وقت ایمان و اسلام کا کوئی درجہ باقی نہیں رہ جاتا جس کا پانا ممکن ہو اور اب وہ اسے نہ پا چکا ہو۔ حتیٰ کہ اگر اس کی اب تک کی زندگی بھی صلاح و تقویٰ کی معیاری زندگی رہی ہو تو وہ اپنے اس عمل کی بدولت اُس مقام پر جا پہنچتا ہے جس کے آگے صرف انبیاء علیہم السلام ہی کا مقامِ خاص باقی رہ جاتا ہے۔ حضرت عتبہؓ بن عبد السلمی روایت کرتے ہیں کہ:۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْقَتْلٰی ثَلٰثَۃٌ مُؤْمِنٌ جَاھَدَ بِنَفْسِہٖ وَمَالِہٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاِذَا لَقِیَ الْعَدُوَّ قَاتَلَ حَتّٰی یُقْتَلَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْہِ فَذَالِکَ الشَّھِیْدُ الْمُمْتَحَنُ فِیْ خَیْمَۃِ اللّٰہِ تَحْتَ عَرْشِہٖ لَا یَفْضُلُہٗ النَّبِیُّوْنَ اِلَّا بِدَرَجَۃِ النُّبُوَّۃِ[1] ۔ الخ

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لڑائی کے میدان میں قتل ہونے والے مومن تین قسم کے ہوتے ہیں :۔ ایک مومن تو وہ ہوتا ہے جو اپنی جان ومال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے ، جب دشمن سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو اس سے لڑتا ہے ، یہاں تک کہ قتل کر دیا جاتا ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مقتول کے بارے میں فرمایا کہ " یہی سچا اور پکا شہید ہے ، یہ عرش کے نیچے اللہ کے ایک شامیانے میں رہے گا ، انبیاء کو اس پر جو فضیلت ہوگی وہ صرف ان کے مرتبۂ نبوت کی فضیلت ہوگی "۔ الخ

" مسلح جہاد " کے مسئلے کا ایک پہلو ابھی توضیح طلب رہ جاتا ہے ۔ اسے بھی سمجھ لینا چاہیے ۔ قرآنِ حکیم میں اس جہاد کے متعلق جو کچھ فرمایا گیا ہے ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی اور ملی ضرورتوں کے نقطۂ نظر سے یہ جہاد ہمیشہ ایک ہی سی اہمیت نہیں رکھتا ، بلکہ کبھی تو وہ محض ایک فضیلت اور عزیمت کا کام ہوتا ہے ، اور کبھی لازمی اور فرض ہوتا ہے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس وقت دشمن کے مقابلے میں عام لام بندی کی ضرورت نہ ہو ، بلکہ کچھ لوگ ہی اس مہم کو سر کر لینے کے لیے کافی ہوں ، اس وقت یہ جنگی خدمت صرف ایک فضیلت کا کام ہوگی ۔ اس خدمت کا انجام دینے والا اگرچہ بڑے اجر وثواب کا حق دار ٹھہرے گا اور اس پر وہ ساری نوازشیں ہوں گی جن کا اوپر ذکر آیا ہے ، مگر جو اس خدمت میں شریک نہ ہوگا اس پر کوئی الزام بھی عائد نہ ہوگا البتہ اس اجر وثواب سے محروم رہے گا جو اس جہاد میں شریک لوگوں کو ملے گا ۔

---

[1] دارمی ، کتاب الجہاد ، باب فی صفۃ القتل فی سبیل اللہ ۔

ایسے ہی جہاد کے ایک موقع پر لوگوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا تھا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے وعدۂ مغفرت کے مستحق دونوں ہی طرح کے مسلمان ہیں، وہ بھی جو گھر بیٹھے رہے اور جہاد میں شریک نہ ہوئے، اور وہ بھی جو بڑھ کر میدان میں پہنچے اور لڑے۔ مگر گھر بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں لڑنے والوں کا مرتبہ بہت اونچا ہے (فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً وَّكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى[1])

لیکن جس وقت صورتِ حال یہ نہ ہو، بلکہ کوئی بڑی مہم درپیش ہو، اور امیرالمؤمنین نے ضرورت محسوس کرکے عام لام بندی کا اعلان کر دیا ہو، اس وقت یہ جنگی خدمت صرف فضیلت کی چیز نہیں رہ جاتی، بلکہ دین کا ضروری تقاضا، اور ایمان کی کسوٹی بن جاتی ہے۔ چناں چہ دورِ نبوی میں جن لوگوں نے نفیرِ عام کے باوجود جہاد کے لیے نکلنے میں ڈھیل دکھائی ان سے صاف لفظوں میں کہہ دیا گیا کہ :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ..... اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ[2]

اے ایمان والو! تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہونے کو کہا جاتا ہے تو تم زمین سے لگے پڑتے ہو! کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کو پسند کر بیٹھے ہو؟ ..... (یاد رکھو) اگر تم لوگ (جنگ کے لیے) نہ نکلو گے تو اللہ تمھیں دردناک عذاب دے گا، اور تمھیں ہٹا کر تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لائے گا۔

اسی طرح جن لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حیلے بہانے بنا کر رخصتیں مانگنا شروع کردیں، ان کے بارے میں فرمایا گیا :-

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا

---

[1] سورہ نساء - ۹۵ [2] سورۂ توبہ - ۳۸ - ۳۹ -

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ[1] الخ

جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، وہ تم سے اس بات کی درخواست نہ کریں گے کہ انھیں اپنے مال اور اپنی جان کے ساتھ جہاد کرنے سے معذور رکھا جائے۔ اللہ (دل میں) تقویٰ رکھنے والوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ تم سے ایسی درخواست تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔

ان آیتوں سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر مسلح جہاد سے کترا جانا ایمان کے قطعی منافی ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ راہِ خدا میں لڑنے کا جذبہ اور ارادہ رکھنا ایمان کی ایک کبھی نہ الگ ہونے والی صفت ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اس لڑائی کا موقع ہر وقت اور ہر حال میں موجود نہیں ہوا کرتا اس لیے عملی طور پر تو یہ فریضہ اسی وقت انجام دیا جا سکے گا جب اس کے لیے ناگزیر حالات پیدا ہوچکے ہوں، اور اس کی ضروری شرطیں بھی پوری ہو رہی ہوں۔ مگر جہاں تک احساسِ فرض کا تعلق ہے اسے قلبِ مومن میں بہرحال موجود رہنا چاہیے۔ سچّے ایمان کی نفسیات یہی ہوا کرتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ایمان اور مسلّح جہاد کے فطری تعلق کو پوری طرح بے نقاب کر دیتے ہیں:۔

مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِفَاقٍ[2]

جو شخص اس حال میں مرا ہو کہ اس نے نہ تو دین کی خاطر جنگ کی ہو نہ اپنے جی میں اس جنگ کا خیال لایا ہو، وہ کسی نہ کسی حد تک نفاق کی حالت میں مرا۔

اور وجہ اس کی بالکل ظاہر ہے۔ مسلمان نام کا گروہ اس لیے برپا ہی نہیں گیا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی، جس طرح چاہے، اپنی زندگی گزارتا رہے، بلکہ وہ ایک خاص کام کی خاطر برپا کیا گیا ہے۔ یہ کام اتنا بڑا اور اتنا اہم ہے کہ ٹھیک طور سے انجام پانے کے

---

[1] سورۂ توبہ۔ ۴۴۔۴۵

[2] مسلم، جلد دوم، باب ذم من مات ولم یغز۔

لیے انسان کا سب کچھ مانگتا ہے۔ اس لیے اس فرض سے سبک دوش صرف وہی شخص قرار پا سکتا ہے جو اس کے مقابلے میں دنیا کی کسی چیز کو، یہاں تک کہ اپنی جان کو بھی عزیز نہ رکھتا ہو۔ اور حقیقی "امت مسلمہ" دراصل ایسے ہی افراد کے مجموعے کا نام ہے جن کے اندر قربانی کا یہ جوہر موجود ہو۔ ورنہ وہ انسانوں کی ایک جماعت اور ایک امّت تو ضرور ہوگی، مگر "امّتِ مسلمہ" نہ ہوگی، اور اس سے وہ کام کبھی نہ ہو سکے گا جس کے لیے اسے برپا کیا گیا ہے۔ اس بارے میں قرآنِ حکیم کا قولِ فیصل بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ کچھ لوگوں نے جب مسلمان ہوتے ہوئے بھی وہ رویہ اختیار کرنے سے کترانا چاہا جو انھیں "امّتِ مسلمہ" کے افراد ہونے کی حیثیت سے لازمًا اختیار کرنا چاہیے تھا، تو ان کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:۔

> يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ[1]
>
> اے ایمان لانے والو! تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے پھر جائیں گے تو (اللہ کو اس کی کوئی پروا نہ ہوگی) اللہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے اسے محبت ہوگی اور جو اس سے محبت رکھتے ہوں گے، جو مومنوں کے حق میں بالکل نرم اور منکروں کے حق میں سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور (اس سلسلے میں) کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔

اِس ارشادِ خداوندی کا منشا واضح طور پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے دین کے لیے جس قسم کے انسان مطلوب ہیں ان میں چند صفات لازمًا پائی جانی چاہئیں، ان میں سے ایک صفت جہاد فی سبیل اللہ کی بھی ہے۔ جو لوگ اس صفت سے خالی ہوں، وہ دین کی خدمت، حمایت اور شہادت کا فریضہ ہرگز نہیں انجام دے سکتے۔ اور جو مسلمان یہ کام نہیں کر سکتا وہ گویا اپنے

---

[1] سورہ المائدۃ - ۵۴

حقیقی منصب (منصبِ شہادت) سے اپنے کو خود ہی معزول کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد سے فرار کی راہ اختیار کرنے کو اس آیت میں "دین سے پھر جانا"، کہا گیا ہے۔ یہی بات سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں، جس میں فرمایا گیا ہے کہ "اگر تم لوگ جنگ کے لیے نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا، اور تمہیں ہٹا کر تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لائے گا۔" کسی شخص یا گروہ کو اس کی جگہ سے اسی وقت ہٹایا جاتا ہے جب وہ اس کا اہل نہ رہ گیا ہو، اور وہ کام اس سے انجام ہی نہ پا سکتا ہو جس کے لیے اس جگہ پر مقرر کیا گیا تھا۔

اسلام کی دُنیوی برکتیں

دُنیوی فلاح اور انبیائی دعوتیں

اُوپر کے صفحات میں اسلام کا جو عمومی تعارف کرایا گیا ہے، اس میں ایک حقیقت بار بار اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ اور وہ یہ کہ "اسلام" دراصل اللہ کی رضا کی خاطر جینے اور اسی کی خاطر مرنے کا نام ہے، اور "مسلمان" وہ ہے جو اپنی نظریں ہمیشہ آخرت پر جمائے رکھے، اور اس کے مفاد پر دنیا کے مفاد کو ہرگز مقدم نہ ہونے دے۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دین کی صحیح پیروی کے بعد مسلمان کی "دنیا" کا کیا حال ہوگا؟ کیا اس کے پاس اس جہاں کی کوئی قابلِ ذکر چیز باقی رہ جائے گی؟ کیا وہ انفرادی حیثیت سے خوش حال اور اجتماعی حیثیت سے باعزت و با اقتدار بھی ہو سکے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک عام نوعیت کا سوال ہے، اور اسے صرف ایک اسلام ہی کے بارے میں نہیں، بلکہ ہر اس دین کے بارے میں اُٹھنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہو۔ کیوں کہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے "اسلام" اور دُوسرے آسمانی مذاہب میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ اسلام ہی کی طرح ہر مذہب دین داری اور خدا پرستی کا جوہر یہی بتاتا رہا ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے، اور دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتا رہے۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس بارے میں قرآنی دعوت کا جواب سننے سے پہلے دوسرے انبیاء کی دعوتوں کا جواب بھی سُن لیا جائے۔

اس غرض کے لیے جب ہم انبیاء علیہم السلام کی دعوتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس سوال کا جواب وہ نہیں ملتا جس کا بظاہر خیال گزرتا ہے۔ یعنی یہ کہ دین کی سچّی پیروی اور آخرت طلبی

کا نتیجہ دنیا کی لازمی محرومی ہی کی شکل میں نکل سکتا ہے۔ اس کے برعکس ہمیں دیکھنے کو یہ ملتا ہے کہ جس نبی نے بھی اپنی قوم کو اللہ کے دین کی طرف بلایا، یہ یقین دلاتے ہوئے بلایا کہ میری پیروی تمہیں آخرت ہی کی نہیں، دنیا کی بھی فلاح بخشے گی۔ مثلاً حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا تھا:-

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا۔[1]

اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، بلاشبہ وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے (اگر ایسا کروگے تو) وہ تم پر موسلا دھار بارشیں برسائے گا، تمہیں دولت اور اولاد عطا فرمائے گا، (شاداب) باغ مہیا کرے گا اور تمہارے لیے ندیاں جاری کر دے گا۔

اسی طرح ہودؑ نے بھی اپنی قوم کو دعوتِ حق دیتے ہوئے اسے اطمینان دلایا تھا:-

يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ۔[2]

اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے مغفرت مانگو اور پھر اس کی طرف متوجہ رہو۔ وہ تم پر موسلا دھار بارشیں برسائے گا اور تمہاری طاقت میں برابر افزونی عطا فرماتا رہے گا۔

انبیائی دعوتوں کی یہ یقین دہانی وقت پر کس طرح پوری ہوکر رہتی تھی، اگر یہاں یہ بھی دیکھ لینا ہو تو بنی اسرائیل کی اس تاریخ پر نظر ڈالیے جو حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے قبل سے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت سے لے کر آں جنابؐ کی بعثت تک کی ان لوگوں کی زندگی انتہائی ذلیل، دردناک اور ٹھکرائی ہوئی زندگی تھی۔ لیکن جب وہ اپنے رب کی طرف پلٹے، اور اس کے دین کی پیروی میں انھوں نے ثابت قدمی دکھائی تو اُن کے زمین و آسمان بدل گئے۔ ذلت کی زندگی

---

[1] سورۂ نوح - ۱۰ تا ۱۲ [2] سورۂ ہود - ۵۲

کی جگہ عزّت کی زندگی نے لے لی۔ قرآن کا بیان ہے کہ:

وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا۔[1]

اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوگیا اس وجہ سے کہ انھوں نے دراہِ حق میں، ثابت قدمی دکھلائی تھی۔

اور نہ صرف یہ کہ اپنے رب کی طرف پلٹنے اور راہِ حق میں ثابت قدمی دکھلانے پر انھیں ذلّت کی زندگی کی جگہ عزّت واقتدار کی زندگی مل گئی، بلکہ ایک کلّیے کے طور پر یہ دائمی خوش خبری بھی انھیں سُنا دی گئی کہ اللہ کی شکرگزاری اور اس کے احکام کی پیروی میں تم جتنا ہی آگے بڑھو گے اس کی نعمتوں سے اتنے ہی زیادہ نوازے جاؤ گے:۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ اَنْجٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ۔[2]

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جس سے اس نے تمہیں نوازا ہے، جب اُس نے تم کو فرعونیوں سے نجات بخشی۔

.... وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ[3]

.... اور یاد کرو اس وقت کو (بھی) جب تمہارے رب نے تمہیں آگاہ فرمایا تھا کہ اگر تم نے شکرگزاری کی روش اختیار کی تو تمہیں اور زیادہ نوازوں گا..... الخ

چناں چہ جب تک وہ شکرگزاری کی روش اختیار کیے رہے، دنیا نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدۂ بشارت بھی پورا ہونے سے نہ رہا، بلکہ اس شان سے پورا ہوا کہ وہ قومی عزّت و اقبال کی آخری بلندیوں پر پہنچا دیے گئے، اور اس زمین پر کوئی قوم ایسی نہ رہی جو عظمت و شوکت میں ان کی ہم پلّہ ہوتی۔ ان کے اس سُنہری دور کی حسرت بھری یاد قرآن مجید نے انہیں ان لفظوں میں دلائی ہے:۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ

---

[1] سورہ الاعراف۔ ۱۳۷ [2] سورہ ابراہیم۔ ۶ [3] سورۂ ابراہیم۔ ۷

نَفَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔[1]

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا، اور یہ بات کہ میں نے تمہیں دُنیا کی ساری قوموں پر برتری عطا کی تھی۔

پھر جب انھوں نے "شکرگزاری"، یعنی خدا پرستی اور اتباعِ دین کی یہ روش چھوڑ دی تو اُن کے اُوپر سے عزت و اقبال کی یہ قبا بھی اُتار لی گئی۔ نبی آخرالزّماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت یہ قوم ذلّت کی اسی حالت میں گرفتار تھی۔ قرآن کریم نے ان کی اس حالت زار کی وجہ اور اس سے نجات کی تدبیر، دونوں چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَلَوْ اَنَّھُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰاةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ مِّنْ رَّبِّھِمْ لَاَکَلُوْا مِنْ فَوْقِھِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِھِمْ۔[2]

اگر یہ اہلِ کتاب تورات کو، اور انجیل کو اور ان ہدایتوں کو قائم کرتے، جو ان کے رب کی طرف سے ان کو بھیجی گئی تھیں، تو رزق ان کے اوپر سے بھی برستا اور نیچے سے بھی اُبلتا۔

آخر میں الگ الگ قوموں کے بجائے اکٹھی ساری اقوام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ عمومی ارشاد بھی سُن لیجیے:۔

وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔[3]

اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ چلتے تو ہم اُن کے اُوپر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

یہ ارشادِ الٰہی تو ان لوگوں سے متعلق تھا جو ایمان اور خدا پرستی کے راستے سے دُور جا پڑے تھے، اور اس بنا پر ذلّت و نکبت ان کا مقدر بن گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں اُن تمام قوموں اور گروہوں کے بارے میں، جنہوں نے دعوتِ حق پر لبیک کہا تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عام یہ ہے:۔

---

[1] سورہ البقرہ۔ ۴۷ [2] سورہ المائدہ۔ ۶۶ [3] سورہ الاعراف۔ ۹۶

وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ.... فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ.[1]

اور کتنے ہی نبی ایسے رہے ہیں جن کی معیت میں بے شمار مردانِ خدا نے جنگیں لڑیں ...... اللہ نے انھیں دنیا کا بھی اجر دیا، اور آخرت کا بھی بہترین اجر عطا فرمایا۔

انبیائی دعوتوں کی یہ شہادتیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان سے اللہ تعالیٰ کے جس مستقل وعدے اور کبھی نہ بدلنے والے فیصلے کا پتا چلتا ہے وہ قطعی طور پر یہی ہے کہ اپنی اطاعت اور بندگی کے عوض وہ آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھی فلاح اور خوش حالی، عزت اور اقتدار بخشتا ہے۔ چناں چہ جب بھی کسی قوم نے اطاعت و بندگی کی یہ راہ اپنائی، اس کے حق میں یہ ضابطہ اور وعدہ لازماً پورا ہوا اور وہ، جن کی آخرت سنور رہی تھی، ان کی دنیا بھی باغ و بہار ہی بنی رہی۔

اسلام، دنیوی فلاح کا ضامن

کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اور اُمّتِ مسلمہ کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا ہی وعدہ نہ ہوتا، اور اسے بھی اتباعِ حق کے نتیجے میں دنیوی فلاح کی بھی یقین دہانی نہ کرائی گئی ہوتی۔ چناں چہ ٹھیک اُسی طرح کا وعدہ اِس اُمّت سے بھی کیا گیا جیسا پہلوں سے کیا جاتا رہا ہے، اور ہر مرحلے میں کیا گیا۔ مکّے کے تاریک ماحول میں بھی کیا گیا اور مدینے کے پُرخطر دور میں بھی کیا گیا۔ انھیں بھی خطاب کر کے کیا گیا جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے، اور انھیں بھی مخاطب کر کے کیا گیا جو اسلام لا چکے تھے۔ مثلاً مکّے میں قریش کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں فرمایا تھا:-

وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى۔[2]

---

[1] سورۂ آل عمران - ۱۴۶ تا ۱۴۸ [2] سورہ ہود - ۳

اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو، اور اس کی طرف پلٹ آؤ، وہ تمہیں ایک مقررہ مدّت تک زندگی کا اچھا سامان عطا فرماتا رہے گا۔

اور اللہ کے رسولؐ نے انھیں یقین دلایا تھا کہ:۔

فَاِنْ تَقْبَلُوْا مِنِّیْ مَا جِئْتُکُمْ بِہٖ فَھُوَ حَظُّکُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔[1]

اگر تم میرا لایا ہوا پیغام قبول کرو گے تو وہ دنیا میں بھی تمہاری خوش نصیبی کا باعث ہوگا اور آخرت میں بھی۔

اس دنیوی "خوش نصیبی" کی شرح آپؐ نے ایک اور موقع پر، اپنے چچا ابو طالب کے سامنے اس طرح کی تھی:۔

اُرِیْدُھُمْ عَلٰی کَلِمَۃٍ وَّاحِدَۃٍ تَدِیْنُ لَھُمْ بِھَا الْعَرَبُ وَ تُوَءَدِّیْ الْعَجَمُ اِلَیْھِمُ الْجِزْیَۃَ۔[2]

میں اُنھیں (یعنی قریش کو) صرف ایک بات کی تلقین کرتا ہوں، ایسی بات کی تلقین جس کی بدولت سارا عرب اُن کا مطیع، اور سارا عجم ان کا باج گزار بن جائے گا۔

یہ تو ان لوگوں سے کیے گئے وعدے کی بات تھی جو ابھی دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ جو لوگ داخل ہو چکے تھے اُنہیں تو ان کے دورِ ضعف و ناتوانی میں، اس امر کا اور زیادہ صراحت سے یقین دلایا گیا تھا۔ مکّے میں کرائی گئی یقین دہانی کے الفاظ یہ تھے:۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا۔[3]

---

[1] سیرت ابن ہشام۔ جلد اول [2] مسند احمد۔ جلد اوّل۔ [3] سورہ النور ۔ ۵۵

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور صالح عمل کرتے ہیں، اللہ کا اُن سے یہ وعدہ ہے کہ وہ اُنھیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے گا جس طرح کہ اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو اقتدار عطا فرمایا تھا، اور ان کے لیے ان کے اس دین کی جڑیں مضبوطی سے جما دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے، اور ان کی موجودہ حالتِ امن سے بدل دے گا۔

مدینہ کے ابتدائی دور میں یہی بات یُوں فرمائی گئی تھی:-

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ [۵]

نہ کمزور پڑو اور نہ غمگین ہو۔ تم ہی اُونچے رہوگے اگر تم ایمان والے ہوئے۔

"ایمان اور عملِ صالح"، کی شرطیں پوری ہو جانے کے بعد یہ وعدے کس طرح پورے ہوئے اس سے دنیا ناواقف نہیں ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اسلام نے مسلمان کو وہ سب کچھ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہو سکتا ہے۔

اتّباعِ دین اور فلاحِ دُنیا کا تعلق

ان تمام صراحتوں اور شہادتوں کے بعد ذہن اس بات پر تو بالکل مطمئن ہو جائے گا کہ اسلام اپنے پیرووں کو دنیا کی فلاح سے بھی خوب خوب نوازتا ہے۔ لیکن اب وہ یہ جاننا چاہے گا کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے؟ دین تو انسان کو آخرت کی طرف بھگاتا اور دنیا سے بے پروا بناتا ہے، پھر دین کا دامن پکڑنے کے نتیجے میں اسے یہ دنیا بھی کس طرح ہاتھ آجاتی ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے اور اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے بعض اصولی حقیقتیں سمجھ لینی چاہییں:-

ایک تو یہ کہ یہ دولت، یہ عزّت، یہ اقتدارِ حکومت، جنھیں "دنیا کی فلاح" کہا جاتا ہے، دین کی نگاہ میں بجائے خود کوئی معیوب شے نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی "نعمتیں"، اور اس کا

---

[۵] سورہ آلِ عمران - ۱۳۹

"فضل" ہیں۔ چناں چہ قرآن حکیم نے اپنے بیانوں میں ان چیزوں کو یہی حیثیت دی ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ مائدہ کی بیسویں آیت کو دیکھیے، جس میں بنی اسرائیل کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کی اُس ملّی سربلندی اور اُس اقتدارِ حکومت کو اللہ تعالیٰ نے صراحتاً اپنی "نعمت" فرمایا ہے جو زمانۂ ماضی میں اُنھیں حاصل تھا (... اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا .... الخ) اسی طرح سورۂ نحل کی اس آیت پر نظر ڈالیے جس میں زندگی کی سہولتوں اور رزق کی فراوانیوں کو "اللہ کی نعمتیں" کہا گیا ہے (ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ[1]) اسی طرح بہت سے مقامات پر ان چیزوں کو اللہ کا "فضل" بھی قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ[2] (زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو)۔

دوسری یہ کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا "خلیفہ" اور نائب بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا منصبی فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ اِس زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھے، اور اسے اپنے مالک کے احکام اور مرضیات کے مطابق چلائے (جیسا کہ پچھلی بحثوں میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے)۔

یہ دونوں بنیادی حقیقتیں اگر سامنے ہوں تو زیرِ بحث سوال کوئی سوال نہیں رہ جاتا، اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دنیا کی عزّت، دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلّق رکھنا اور فائدہ اُٹھانا دین وایمان کے منافی ہو۔ کیوں کہ جو چیزیں "اللہ کی نعمت" اور "اللہ کا فضل" ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے قابلِ اجتناب یا نامطلوب نہیں ہوسکتیں اس طرح کی چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمانا تو یہ ہے کہ:۔

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔[3]

کہہ دو کہ ساری (پاک چیزیں) دنیا کی زندگی میں (بھی اصلاً) اہلِ ایمان (ہی) کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصتہً انہی کے لیے ہوں گی۔

---

[1] سورۂ نحل - ۱۱۲ [2] سورۂ جمعہ - ۱۰ [3] سورۂ اعراف - ۳۲

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کے اصل حق دار اللہ کے فرماں بردار بندے ہی ہیں۔
اب اگر ان چیزوں کے اصل حق دار اللہ کے فرماں بردار بندے ہی ہیں۔ تو وہ ان کے لیے ناپسندیدہ اور نامطلوب کیسے ہوسکتی ہیں۔ خدا کا جاننے پہچاننے والا بندہ اس کی نقمتوں سے بھاگتا ہے، نعمتوں سے نہیں بھاگتا۔

یہ تو ہوا دنیوی عزت و دولت کے "نعمت" اور "فضل" ہونے کا تقاضا۔ اس کے بعد انسان کے پیدائشی منصب اور اس کی تخلیقی حیثیت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ اس کا تقاضا کیا ہے؟ اوپر یہ بات تفصیل اور دلیل کے ساتھ معلوم ہوچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین پر اپنا "خلیفہ" بنایا ہے یعنی اس کا فریضہ حیات اس نے یہ قرار دیا ہے کہ وہ اُس کے احکام و مرضیات کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کرے، تاکہ یہاں بھی اس کی مرضی اسی طرح پوری ہوتی رہے جس طرح کہ باقی کائنات میں پوری ہوتی رہتی ہے۔ نوع انسانی کی اس تخلیقی حیثیت اور اس کے اس منصبی فریضے کا کھلا ہوا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی اپنی اس حیثیت کا ادراک اور اس فرضِ منصبی کا صحیح شعور و احساس رکھنے والے لوگ موجود ہوں، اس دنیا کی زمامِ کار انہی کے ہاتھوں میں ہو۔ کیوں کہ اسی شکل میں انسان کے خلیفۃ اللہ بنا کر پیدا کیے جانے کی غرض و غایت پوری ہوسکے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ بات اللہ رب العالمین کی حکمت و دانائی اور اس کے عدل کے بالکل خلاف ہوگی کہ انھیں اس زمین کے اقتدار و اختیار سے محروم رکھے، اور ان کے ہوتے ہوئے یہ اقتدار اُن لوگوں کے سپرد کردے جو اپنے اس فرضِ منصبی کے منکر ہوں، اپنے بارے میں "خلیفہ" اور اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کی پوزیشن کو تسلیم ہی نہ کرتے ہوں، اور اس دنیا میں اپنی آزاد حاکمیت کے یا کسی اور کی حاکمیت کے مدّعی ہوں۔

دوسری طرف خود ان فرض شناس اور خدا کے فرماں بردار بندوں کے لیے بھی یہ بات کسی طرح صحیح نہ ہوگی کہ وہ اُس اقتدار کے حاصل کرنے سے بے نیازی برتیں جس کے بغیر وہ اپنے فرضِ خلافت سے کسی طرح عہدہ برآ ہو ہی نہیں سکتے۔ جس چیز سے ان کی زندگی کا اصل فریضہ وابستہ ہو، وہ تو ان کے لیے صرف پسندیدہ ہی نہیں، بلکہ ضروری بھی قرار پائے گی۔

ان سارے پہلوؤں کو سامنے رکھیے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ مسلمان صرف اُخروی فلاح ہی کا نہیں، بلکہ دنیوی فلاح کا بھی حق دار اور طلب گار ہوتا ہے، اور اس کی یہ طلب اس کی سچّی دین داری ہی کا تقاضا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچّے اور صحیح الفکر مسلمان کی دعا اپنے خدا سے یہ ہوتی ہے کہ:۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔[۱]

پروردگار! ہمیں دنیا میں (دنیا کی) بھلائی اور آخرت میں (آخرت کی) بھلائی عطا فرما۔

اور یہ دعا یقیناً قبول ہوکر رہتی ہے اگر وہ اپنے کو اس کا مستحق ثابت کردیتا ہے۔

اب زیرِ بحث سوال کا صرف ایک پہلو اور باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر مسلمان آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ دنیوی فلاح کا بھی حق دار اور طلب گار ہوسکتا ہے، اور ہوتا ہے، تو قرآن[۱] اور حدیث میں طلبِ دنیا کی اتنی مذمّتیں کیوں کی گئی ہیں؟ اور اس شکل[۲] میں اس بات کا مطلب کیا ہوگا کہ "مسلمان وہ ہے جو اپنی نظریں ہمیشہ آخرت پر جمائے رکھے اور دنیا کے کسی مفاد کو آخرت پر ترجیح نہ دے"؟

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ جس دنیا کو ملعون اور اس کی طلب کو مذموم ٹھہرایا گیا ہے وہ اور چیز ہے، اور وہ "دنیا"، جس کی فلاح کا مومن حق دار اور طلب گار ہوتا ہے، بالکل دوسری چیز ہے۔ اسلام کی نگاہ میں مذموم اور قابلِ حذر صرف وہ چیزیں ہیں جو انسان کو خدا سے غافل، اور اس کے دین کے تقاضوں سے بے پروا بنا دینے والی ہوں۔ اور وہ دنیا، جس کی کتاب وسنّت میں مذمّت کی گئی ہے، دراصل انہی چیزوں کا نام ہے۔ لیکن جو چیزیں انسان کو خدا سے غافل نہ بنائیں اور جو دین کے تقاضوں کو پُورا کرنے میں روک بننے کے بجائے اُلٹی مددگار ثابت ہوں، وہ ہرگز مذموم اور قابلِ حذر نہیں ہیں، بلکہ ہر طرح سے پسندیدہ اور مطلوب ہیں، اور انھیں قرآن مجید میں مذموم وملعون نہیں بلکہ "دنیا کی بھلائی"

---

[۱] سورہ البقرہ ــ ۲۰۱

(فِی الدُّنیا حَسَنَۃً[۱]) "عمدہ زندگی" (حَیٰوۃً طَیِّبَۃً[۲]) اور "دُنیا کا اجر" (ثَوَابَ الدُّنیا[۳]) فرمایا گیا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے "دُنیوی فلاح" کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو اس سے مراد دراصل ایسی ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ خدا سے غفلت اور دین کے تقاضوں سے بے پروائی کا تعلق تو اصلاً انسان کے اپنے نفس سے ہے نہ کہ دنیا کی چیزوں سے۔ ایک ہی چیز ہوتی ہے جو ایک شخص کے لیے خدا سے غافل ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے، لیکن دوسرے کے لیے نہیں بنتی۔ ہما شما تو ایک معمولی سی جائداد پا کر بھی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے لوگوں کو وقت کی عظیم ترین سلطنت کی حکمرانی بھی خدا سے ذرہ برابر غافل نہ بنا سکی۔ اس لیے متعین طور پر کوئی چیز نہ اس طرح کی "دنیا" رہی اور نہ اُس طرح کی دُنیا۔

بلاشبہ امر واقعی یہی ہے۔ دنیا کی دولت اور عزت اور اقتدار، حکومت وغیرہ چیزوں میں سے کوئی چیز بھی فی نفسہ بُری اور قابلِ احتراز نہیں۔ یہ تو دراصل انسان کا اپنا غلط طرزِ فکر اور غلط طرزِ عمل ہے جو ان چیزوں کو اس کے حق میں زہر بنا دیتا ہے۔ لیکن "مومن" کے بارے میں چوں کہ قرآن اور اسلام کا تصوّر یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ان چیزوں کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرتا بلکہ اس کی مرضی اور ہدایت کے مطابق ہی کرتا ہے، اس لیے اس کے لیے یہ چیزیں وہ "دُنیا" نہیں ہیں جو مذموم و ملعون ہے، بلکہ وہ "دُنیا" ہیں جو محمود و مطلوب ہے۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کے معنی دنیا سے دست بردار ہو جانے کے نہیں ہیں، بلکہ یہ ہیں کہ اس کے حاصل کرنے میں اور حاصل کر چکنے کے بعد اُسے برتنے میں دین کے تقاضوں کو پامال نہ کیا جائے، اور آخرت کے مفاد کو ٹھیس نہ لگنے دی جائے۔ دین کے تقاضے اور آخرت کے مفادات ایسے تو ضرور ہیں کہ ان سے انسان کی خواہشوں پر قدغن لگتا ہے، وہ اسے من مانی کرنے سے روکتے ہیں، اور اس سے اس کے دنیوی مفادات کی قربانیاں چاہتے ہیں۔ لیکن ایسے ہرگز نہیں ہیں کہ دنیا کی چیزوں کے حصول کے اور ان سے استفادے کے بالکل ہی روادار نہ ہوں۔ چناں چہ حدیث میں مومن کی مثال اس گھوڑے سے دی گئی ہے جو ایک محدود لمبائی رکھنے والی رسّی کے ذریعے کھونٹے سے بندھا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے گھوڑے کی حالت اس گھوڑے جیسی نہیں ہوتی جس کے

پاؤں کھونٹے سے بالکل ملاکراس طرح باندھ دیے گئے ہوں کہ وہ حرکت ہی نہ کرسکتا ہو۔ پہلے گھوڑے کو جہاں ایک خاص حدتک چلنے پھرنے اور چرنے چگنے کی آزادی ہوگی وہاں دوسرا گھوڑا اس طرح کی کسی آزادی سے قطعی محروم ہوگا۔ اس مثال سے اچھی طرح واضح ہوجاتاہے کہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کے باوجود مومن کے لیے دنیوی فلاح کی راہ بھی مناسب اور ضروری حدتک بالکل کھلی ہی رہتی ہے۔ یعنی جہاں حقیقت یہ ہے کہ مومن کا اصل مطمحِ نظر فلاحِ آخرت ہوتی ہے، وہاں یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہی ہے کہ اسلام نے آخرت کی فلاح کا جو راستہ بتایاہے وہ دنیوی فلاح سے کتراکر نہیں جاتا، بلکہ اس کے اندر سے ہوکر گزرتا ہے۔ ابھی سورۂ آل عمران کی جس آیت کا حوالہ گزراہے، اس کے لفظوں کو پھر غور سے دیکھ لیجیے۔ یہ آیت صاف صاف کہتی ہے کہ جو لوگ سچے ایمان اور اچھے عمل والے ہوتے ہیں انھیں خود اس ایمان اور عمل کے نتیجے میں "آخرت کے بہترین اجر"، (حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَۃِ) کے ساتھ ساتھ "دنیا کا اجر" (ثَوَابَ الدُّنْيَا) بھی ملاکرتا ہے۔ خدا پرستی اور آخرت پسندی کے "ثواب" (اجر اور بدلے) میں شامل ہے۔ اس لیے آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا مآل خود دنیا کے صحیح مفاد بھی حاصل کرلیناہے، اس سے محروم ہوجانا ہرگز نہیں ہے۔

فلاحِ دنیا کی لازمی شرط

آخر میں اس حقیقت کا یاد دلا دینا بھی مناسب ہوگا کہ جس طرح سچّا ایمان اور اچھا عمل، آخرت کی فلاح کے لیے ضروری ہے، اسی طرح دنیا کی فلاح کے لیے بھی ضروری ہے۔ یعنی دنیوی برکتوں کے دروازے بھی مسلمان پر اسی وقت کھولے جاتے ہیں جب وہ ایمان و عمل کی شرط پوری کردیتا ہے۔ چناں چہ اوپر کی سطروں میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ جس کسی قوم سے بھی فلاحِ دنیا کا وعدہ کیا گیا تھا، ایمان وعمل کی شرط کے ساتھ ہی کیا گیا تھا۔ خود اُمّتِ مسلمہ کو بھی جب کفّار پر غلبے کی بشارت دی گئی تو "اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"[1] کی شرط

---

[1] سورہ آل عمران - ۱۳۹

کے ساتھ ہی دی گئی تھی، اور جب اقتدارِ حکومت کا وعدہ کیا گیا تھا تو اس وضاحت کے ساتھ کیا گیا تھا کہ "یہ وعدہ صرف ان لوگوں سے ہے جو ایمان و عمل والے ہیں"، (وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ[1] الخ) غرض جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ عمومی وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں کو دنیوی فلاح سے بھی نوازتا ہے، وہیں اس کا یہ ایک عمومی ضابطہ بھی ہے کہ یہ وعدہ ایمان و عمل صالح کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و عمل کے بغیر صرف آخرت ہی کی نہیں، دنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آسکتی، دین کے بغیر صحیح معنوں میں دنیا بھی نہیں مل سکتی۔ یہ ضابطہ، ملت کے افراد ہوں یا پوری ملت و جماعت، دونوں ہی کے لیے ہے۔ کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگیوں کی دنیوی فلاح ــ مثلاً امن و سکونِ قلب، عزت و محبوبیت اور ضروریاتِ زندگی وغیرہ ــ اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خدا شناس اور آخرت پسند ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی وضاحت کی تھی جب آپؐ نے یہ فرمایا تھا کہ :۔

مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ اٰخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ وَ مَنْ تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُوْمُ اَحْوَالُ الدُّنْيَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ فِيْ اَيِّ اَوْدِيَتِهَا هَلَكَ ۔[2]

جس نے اپنی کُل فکر ایک ہی فکر ــ اپنی آخرت کی فکر ــ کو بنا لیا، اللہ تعالیٰ اس کی دنیا کا انتظام کر دینے کے لیے کافی ہے، اور جس کے ذہن کو بے شمار افکار ــ دنیا کے افکار و معاملات ــ نے پراگندہ کر رکھا ہو، اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ اس دنیا کی کس گھاٹی میں ہلاک ہو کر رہتا ہے۔

ایک اور ارشاد نبوی ہے کہ :۔

.... وَمَنْ كَانَتِ الْاٰخِرَةُ نِيَّتَهٗ جَمَعَ اللّٰهُ وَجَعَلَ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهٖ وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ دَاغِمَةٌ ۔[3]

---

[1] سورہ نور ــ ۵۵ [2] ابن ماجہ، باب الھم بالدنیا [3] ابن ماجہ، باب الھم بالدنیا۔

جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے معاملات کو درست کر دیتا اور اس کے دل کو غنی بنا دیتا ہے، اور دنیا تابع فرمان بن کر اس کے حضور آ کھڑی ہوتی ہے۔

اسی طرح پوری ملّت وجماعت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح — آزادی، دولت مندی، سربلندی، اقتدار وبین الاقوامی عزت وغیرہ — اسی وقت میسّر آسکتی ہے جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع "اُمّتِ مسلمہ" ہو۔ یعنی ایک طرف تو وہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو بحیثیتِ مجموعی ایمان کے سچّے اور عمل کے صالح ہوں، دوسری طرف اس میں وہ مضبُوط اجتماعی نظم واتحاد ہو جس کے بغیر کوئی جماعت جماعت نہیں ہوتی، اور جس کی اللہ ورسول کی طرف سے اسے انتہائی تاکید فرمائی گئی ہے۔

اس معاملے میں اس ملّت کو دوسری قوموں پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔ دوسری قومیں تو اپنی ساری نافرمانیوں کے باوجود اونچے سے اونچا اقتدار حاصل کرنے سکتی ہے لیکن اُمّتِ مسلمہ کے لیے اس طرح کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کے لیے تو عزّت واقتدار کے پانے کی بس ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ ہے اسلام کی راہ، اللہ کی فرماں برداری کی روش، شہادتِ حق کی صراطِ مستقیم۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کے لیے عروج وزوال کا قانون اللہ تعالیٰ نے وہ نہیں رکھا ہے جو دوسری قوموں کے لیے مقرر ہے۔ دوسری قوموں کے لیے اس کا قانون تو یہ ہے کہ اگر وہ کچھ بنیادی قسم کی انسانی اخلاقیات ان کے اندر موجود ہوں اور ترقی کی ضروری مادّی تدبیریں اختیار کرلیں تو اُونچی اُٹھ سکتی ہیں۔ لیکن جہاں تک اُمّتِ مسلمہ کا معاملہ ہے، صرف یہی چیزیں اس کے لیے ترقی کا زینہ بننے کے لیے کافی نہیں ہوسکتیں۔ کیوں کہ یہ اُمّت اس دنیا میں اللہ کے دین کی عَلَم بردار، اور دوسری قوموں کے سامنے حق کی گواہ ہے۔ دوسری کسی قوم کی پوزیشن یہ نہیں ہے۔ پوزیشن کا یہ اختلاف لازمی ٹھیرا تا ہے کہ قدرت کی نگاہ میں ان دونوں کے حقوق بھی اور ان کی ذمّہ داریاں بھی مختلف ہوں۔ اور پھر حقوق کا اور ذمّہ داریوں کا اختلاف ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ ضابطے بھی مختلف ہوں جن کے مطابق ان سے معاملہ ہونا چاہیے۔ دوسری قومیں اگر حق کا راستہ

چھوڑ کر چلیں تو انصاف کہتا ہے کہ اُن کا یہ جرم اتنا سخت اور قابلِ نفرت نہ ہوگا جتنا سخت اور قابلِ نفرت اُمّتِ مسلمہ کی طرف سے سرزد ہونے کی شکل میں ہوسکتا ہے۔ اس لیے دوسری قوموں کو قدرت کی طرف سے اگر یہ رعایت ملی ہے کہ وہ خدا کی فرماں برداری اختیار کیے بغیر بھی دنیا میں پھول پھل سکتی ہیں اور اُمّتِ مسلمہ کو نہیں ملی ہے، تو ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص فضل سے سرفراز ہو، اُسے اس فضل کی ناقدری کی شکل میں اس کے مخصوص عتاب کا سزاوار بھی ہونا چاہیے۔ قرآنِ مجید نے ایک جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رض کو مخاطب کرکے کلام کرتے ہوئے ضمناً قانونِ الٰہی کی اس خاص دفعہ کو بھی وضاحت سے بیان کردیا ہے[1]

یہ بات کہ اُمّتِ مسلمہ دنیا کا حقیقی عروج اور اقتدار اُسی وقت حاصل کرسکتی ہے جب وہ فی الواقع بھی "اُمّتِ مسلمہ" ہو، اس کی ساڑھے تیرہ سو برسوں کی تاریخ سے بھی پوری طرح آشکارا ہے۔ جب تک یہ اُمّت فی الواقع "اُمّتِ مسلمہ" رہی پوری مہذب دنیا میں سیاسی اثر اور مادّی شوکت کے اعتبار سے اس کی وہ پوزیشن رہی جو آج امریکہ اور روس کو بھی حاصل نہیں۔ لیکن جوں جوں وہ "اُمّتِ مسلمہ" کے بجائے صرف "اُمّت" بنتی گئی، اپنی اس پوزیشن سے بھی محروم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس حال کو پہنچ گئی جہاں دنیا میں اس کا کوئی قابلِ ذکر مقام باقی نہیں رہ گیا۔ یہ صورتِ حال خود بتاتی ہے کہ اُمّت کی یہ حالت حقیقی عزّت و اقبال سے اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک کہ وہ خود اپنے کو نہ بدل لے، اور بدل کر پھر وہی نہ بن جائے جو پہلے تھی۔ اہلِ کتاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ ہمارے سامنے موجود ہے جو نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے اس نے انھیں سُنایا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ۔[2]

---

[1] سورہ احزاب ـ ۳۰ ـ ۳۱ [2] سورہ المائدہ ـ ۶۸

اے اہلِ کتاب! تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے جب تک کہ تم تورات کو، انجیل کو، اور اس ہدایت کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی جناب سے تمہاری طرف اُتاری گئی ہے۔

یہی فیصلہ اُمتِ مسلمہ کے مستقبل کا بھی آئینہ دار ہے۔ اگر اس نے قرآن کے لائے ہوئے دینِ حق کو از سرِ نو قائم نہیں کیا تو اس قانونِ خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے بھی کسی "اصل" پر نہ سمجھا جائے، اور نہ وہ اس عزت و اقتدار کی مستحق قرار دی جائے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اس سے "اُمتِ مسلمہ" کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس لیے اس کے حال سے اس کا مستقبل اسی وقت مختلف ہو سکتا ہے جب وہ اپنے ماضی کی طرف واپس جائے۔ اور اسے حقیقی عزت واقتدار کی نعمت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ اپنی زندگی پر اللہ کے دین کو غالب کرے۔ یہی دین اس کی مسجدوں کا بھی دین ہو اور اس کی اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کا بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا "وعدۂ حسنیٰ" ہر وقت پورا ہونے کے لیے تیار ہے، اُمت جب بھی صدقِ دل سے اس کی آرزو کرے گی وہ پورا ہو رہے گا۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا ایک اور قانون بھی یاد رکھنا چاہیے۔ اور وہ یہ کہ ملی آزادی اور عزت و سربلندی "جماعت" ہی کو مل سکتی ہے، افراد کو نہیں۔ چناں چہ ان چیزوں کا وعدہ بھی "جماعت" ہی سے کیا گیا ہے، افراد سے نہیں۔ اس لیے اگر یہ اُمت فی الجملہ اس طرح کی جماعت ہے جس طرح کی جماعت اللہ و رسول کو مطلوب ہے، یعنی وہ بحیثیت جماعت "مومن"، "صالح" اور "شاہدِ حق" جماعت ہے، تو وہ یقیناً آزاد اور سرفراز ہوگی، عزت اس کے قدم لے گی، اور اقتدار اس کی رکابیں تھامے گا۔ لیکن اگر یہ اُمت ایسی جماعت نہیں ہے، تو خواہ وہ تعداد میں ریت کے ذرّات سے بھی زیادہ ہو، اپنے افراد کی انفرادی نیکیوں کی بدولت اسلام کی ان دنیوی برکتوں کی ہرگز مستحق نہ ٹھیرے گی۔ اور جب ایسا ہوگا تو قدرتی طور پر اس کی بدبختی میں اس کے بدعمل اور بے عمل افراد کے ساتھ ساتھ باعمل افراد بھی برابر کے شریک ہی ہوں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان باعمل اور نیکوکار اشخاص کو ان کی انفرادی زندگی کی کچھ دنیوی برکتیں بدستور ملتی رہیں۔ کیوں کہ ان برکتوں کی حد تک جو شرط ہے جب وہ پوری ہو رہی

ہے تو ملّت کی اجتماعی غلط کاریاں اور اُن کے بُرے نتائج اپنی جگہ پر، ان برکتوں کو تو حاصل ہونا ہی چاہیے۔ سنگ ریزوں کے انبار میں دبے ہوئے چند سچے موتی اس پورے انبار کو تاجِ مرصع تو نہ بنا دیں گے کہ وہ انسانیت کے سر کی زینت بن سکے، مگر بجائے خود ان کی اپنی جو قدر و قیمت ہے سنگ ریزوں کی کثرت اُسے ہضم بھی نہیں کر سکتی۔

ایک اُلجھن اور اُس کا اِزالہ

دنیوی فلاح کے بارے میں یہ جو کچھ بتایا گیا، حالات کا سطحی نظر سے جائزہ لینے والے اس کے متعلق شک اور تردّد کی بعض اُلجھنوں میں پڑ سکتے ہیں۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ مشاہدہ اس دعوے کی تائید کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ کیوں کہ ایسی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ جو لوگ اچھے مسلمان ہوتے ہیں ان کی زندگی بڑی موٹی جھوٹی ہوتی ہے، اور بسا اوقات بڑی تکلیفوں کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ اس کے بخلاف جن لوگوں کو اسلام سے بس یوں ہی سا لگاؤ ہوتا ہے، وہ بھاری خزانوں اور بڑی شہرتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض ایسے مسلمان ممالک، جو اپنی سیاست اور حکومت کی پیشانی پر اسلام کا نام "تبرک" کے طور پر بھی لکھنا پسند نہیں کرتے، خود مختار اور با اقتدار ہیں۔ لیکن وہ مسلمان حکومتیں، جنہوں نے اپنے یہاں احکامِ شریعت کا نفاذ کر رکھا ہے، غیروں کی حاشیہ بردار ہیں۔ ایسی حالت میں دنیوی فلاح کے ان دعدوں اور ضابطوں کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی جنہیں یہاں بیان کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ یہاں ان اُلجھنوں کو بھی دُور کر دیا جائے:-

● ۔ جہاں تک انفرادی فلاح کا تعلق ہے، یہ الجھن صرف اس شخص کو پیش آ سکتی ہے جس کو "دنیوی فلاح" کا اسلامی تصور نہ معلوم ہو، جو فی الواقع عام تصور سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اس لیے اس الجھن کا حل یہ ہے کہ یہ تصوّر معلوم کر لیا جائے۔ اس تصوّر کی نشان دہی ان آیتوں سے بخوبی ہو جاتی ہے جن میں ایک سچے مسلمان کو دنیوی فلاح کی خوش خبری سُنائی گئی ہے۔ مثلاً:-

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ

حَيٰوةً طَيِّبَةً ۔[1]

جو شخص بھی، چاہے وہ مرد ہو چاہے عورت، اچھے عمل کرے گا اور وہ صاحب ایمان بھی ہوگا، ہم اس کی زندگی ضرور اچھی بسر کرائیں گے ۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ۔[2]

پس جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بے راہ ہوگا نہ بدبختیوں میں مبتلا ہوگا ۔ اور جو کوئی میری یاد سے منہ موڑے گا تو اس کی زندگی یقیناً ضیق کی زندگی ہوگی ۔

یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ ایمان اور عمل صالح کے نتیجے میں اس دنیا کے اندر مومن کو جو فلاح ملتی ہے، وہ "حیاۃ طیبۃ" (اچھی زندگی) اور "لا یشقیٰ" (زحمتوں اور بدبختیوں سے مامونیت) کی فلاح ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس فلاح کا حقیقی مفہوم دولت کی تجوریاں، اونچی اونچی کوٹھیاں، قیمتی کاریں، نوکروں کی فوج، پُرتکلف دسترخوان اور قیمتی لباس رکھنا نہیں ہے، بلکہ واقعی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اور دل کی تونگری ہے ۔ ایسی دولت، جس کے طفیل انسان کو نیند جیسی فطری ضرورت پوری کرنے کے لیے بھی خواب آور گولیاں کھانی پڑیں، ذہن پریشانیوں کی مستقل آماج گاہ بنا رہے، سینے میں خوف اور لالچ کی بھٹیاں سلگتی رہیں، کسی طرح بھی سامانِ راحت نہیں ہوتی، بلکہ ایک عذاب ہوتی ہے، فلاح نہیں، بلکہ قابلِ رحم بدنصیبی ہوتی ہے ۔ اور یہ ایک یقینی امر ہے کہ خدا کی محبت اور آخرت کی طلب چھوڑ دینے کے بعد انسان کو صرف ایسی ہی دولت ملتی ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ فاقہ کشوں سے بھی زیادہ "غریب" اور تباہ حال بنا رہتا ہے ۔ اس کے بخلاف جس کسی کا دل خدا کی محبت اور آخرت کی طلب کا لذت شناس ہوتا ہے، وہ دو وقت کی روٹی پا کر بھی، جو اُسے ضرور ملتی ہے، غنائے سلیمانی کا مالک بنا رہتا ہے ۔ کیوں کہ جس چیز کا نام دل کا سکون و اطمینان ہے، اس کا سرچشمہ صرف اللہ کی یاد ہے ۔

---

[1] سورہ النحل ۔ ۹۷

[2] سورۂ طٰہٰ ۔ ۱۲۳ ۔ ۱۲۴

(الَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ)[1] اور اگر انسان کا دل اللہ کی یاد سے معمور ہو تو اس کے اندر، لازماً اور یقیناً، تقویٰ بھی ہوگا۔ اور جس شخص کے اندر تقویٰ ہوگا، اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے کہ وہ ننگا بھوکا نہیں رہ سکتا۔ یہ میرا کام ہے کہ اسے روزی بہم پہنچے:۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔[2]

● — رہی اجتماعی زندگی کی فلاح کی بات، تو یہ الجھن انتہائی سطح بینی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ فی الواقع وہ اس قابل بھی نہیں کہ اس کا اظہار کیا جائے۔ جن مسلمان حکومتوں کو آج آپ اسلام سے بے تعلقی کا اعلان کرنے کے باوجود "خود مختار" اور "با اقتدار" دیکھتے ہیں، اُن کے چہروں پر خود مختاری اور اقتدار کی صرف نقاب پڑی ہوئی ہے۔ ورنہ اُن کے پاس حقیقی معنوں میں نہ اختیار ہے نہ اقتدار۔ ان کا حال یہ ہے کہ اُن میں سے کوئی امریکی "بیساکھیوں" کے بل پہ کھڑی ہے، تو کوئی روسی "سایۂ عاطفت" میں سانس لے رہی ہے۔ یہ اگر، ملّی عزّت و اقتدار ہے تو اسلام اس "عزّت و اقتدار" سے بے زار ہے۔

اسی طرح جن مسلمان ملکوں کو اپنے یہاں 'شرعی قوانین نافذ رکھنے' کے باوجود آپ کمزور اور غیروں کا حاشیہ بردار پاتے ہیں، اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جہاں اسلامی قوانین کے نافذ ہونے کی بات پچاس کیا پچیس فی صد بھی صحیح ہو۔ ان میں سے کسی کے اندر یہ جرأت اور صلاحیت نہیں ہے کہ زندگی کے اہم اجتماعی معاملات میں اسلام کے دیے ہوئے قوانین اور ہدایات کو اپنا سکیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات ان کے یہاں پائی جاتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ "مذہبی امور" اور کچھ دوسرے معاملات کی حد تک اسلامی قوانین کو اپنا رکھا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اسلامی نظام کے صرف چند اجزاء کو لے لینا اور باقی کو چھوڑے رکھنا اسلام پر ایمان ویقین کا ثبوت نہیں، بلکہ کم یقینی کا ثبوت ہے، اور اس کے لیے حاکم حقیقی کی طرف سے ذلت کی سزا مقرر کی گئی ہے، سرفرازی کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ مسلم حکومتیں اگر دوسروں کی حاشیہ بردار ہیں تو اسی پوزیشن کی وہ مستحق بھی ہیں۔ ان کا موجودہ رویّہ اور آدھی تہائی قسم کا اتباعِ اسلام انہیں کبھی سچّی آزادی اور اقتدار سے ہم کنار نہ ہونے

---

[1] سورہ الرعد۔ ۲۸ [2] سورہ الطلاق۔ ۲۔ ۳

دے گا۔ یہ "نعمت"، تو اسلام کے پورے اتباع اور اس کے نظامِ حیات کے کامل نفاذ کے بعد ہی مل سکتی ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدۂ فلاح صرف اسی صورتِ حال سے متعلق، اور اسی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس وعدے کے سلسلے میں اپنے بندوں سے اس کا فرمانا یہ ہے کہ "تم میرے ساتھ کیے ہوئے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے ساتھ کیے ہوئے اپنے عہد کو پورا کروں گا۔" (اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ)[1]

---

[1] سورۃ البقرہ ـــ ۴۰